



تخریج شدہ ایڈیشن

مُسِنِ انسانیت کی سیرت پُمنفرد اسلوب کی خالیل ایک جامع کتاب



سیاستِ سیدنا و آپ سیدنا

تألیف

علّامہ شبیل عمانی

علّامہ سید علی ندوی

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ سلامیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ذات کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔ ←

مجلس التحقیق الاسلامی (Upload) کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ

کی جاتی ہیں۔ ←

دعویٰ مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔ ←

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ ←

ان کتب کو تجارتی یا مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔ ←

«اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاؤشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں»

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔ ←

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُلْطٰنِ النَّبِیِّ

مُحْسِن انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی خالیں ایک جامع کتاب

اس حصے میں منصب نبوت کے بیان کے ساتھ ساتھ اسلام سے پہلے دنیا بالخصوص عرب ممالک کی تہذیب و اخلاقی حالت پر تفصیل بحث ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبوت محمدی ﷺ نے ان کی اخلاقی و مذہبی اصلاح کا عظیم الشان فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد کا بھی تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

تألیف

عَلَامَةُ شَبَّابِ الْعَمَانِي

عَلَامَةُ سُلَيْمَانِ نَدْوَى

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ سلامیہ

بِحُمْدِهِ حَتَّى نَعْلَمُ مَنْ حَفَظَهُنَّ



کتاب

..... تالیف علامہ شبیل الغافری، علامہ سید یحییٰ ندوی

..... ناشر محمد رضا عجمی

..... اشاعت اکتوبر 2012ء

قیمت



مکتبہ اسلامیہ

بالعقل وہمان مارکیٹ غربی سریت اردو بازار لاہور - پاکستان فون: 042-37232369 فیکٹر: 042-37244973

سیممنٹ سٹی بیکن بالفائل شیل پیپر کوتولی روڈ، فصل آباد - پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail: maktabaislamiapk@gmail.com

نہرست مضمایں سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم

صفحہ نمبر	مضایں	صفحہ نمبر	مضایں
52	نبی علم	15	دیناچہ
52	علم انسانی کے مأخذ	18	دیناچہ طبع ثانی
	ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے	19	مقدمہ
54	مراتب	19	منصب نبوت
55	غیر مادی علم	19	کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارناٹے
59	علم غیب	20	نبی اور مصلح اور حکیم
61	غیب کی حقیقت	22	نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ
64	وہی اور مملکہ نبوت	23	پہلا طریقہ
66	کتاب اور سنت	23	دوسرा طریقہ
66	وہی تخلیق اور وحی غیر تخلیق	24	تیسرا طریقہ
69	احادیث، قرآن کا بیان ہیں	25	نبی کی ضرورت
69	الہام و اجتہاد و حکمت	26	نبی کی عصمت
70	اجتہاد نبوت	27	نبی کی محبوبیت
	ساتواں مبحث: احادیث نبوی سے	27	مصلحین
	شریعت کے اخذ کرنے میں علوم	27	مصلحین کی اقسام
72	نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام	28	نبی کی دعائیں
75	عصمت اور بے گناہی	29	بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب
82	بعض شہبات کا ازالہ	29	بعثت کا زمانہ
85	کشش	30	نبی کی یقینی کامیابی
89	نبی کی شریعت	38	ایک شہدا دراس کا جواب
96	اجتہاد نبوی میں خطا	42	نبی اور غیر نبی کے امتیازات
97	اس خطا کے معنی	47	نبوت کے لوازم اور خصوصیات
98	پائچ اجتہادی امور پر تنبیہ الہی	49	وہی استعداد

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
153	فہرست پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مندی اور اخلاقی حالت	98 99 102 103 103 105 108 110 111 122 123 125 128 132 134 137 138 139 139 140 140 143 147 148 151 152	پہلا واقعہ دوسرا واقعہ تیسرا واقعہ چوتھا واقعہ پانچواں واقعہ ایک نسلط استدلال عقل بشری ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت حکمت کتاب و حکمت کی تعلیم علم علم و حکم شرح صدر تمییز کتاب ارائت رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے ترکیب نور آیات و مکلوت کی روایت سامع غیب تلخیق و دعوت ایک شبکہ کا ازالہ انیما علیہ لٹلنے کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ نبوت کی غرض و مقایت تائید و نصرت خاتمه
154	ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مندی حالت کیا تھی؟		
154	مجوس فارس		
157	عیسائی روم		
164	ہندوستان		
166	یہود ظہور اسلام کے وقت عرب کی مندی و اخلاقی حالت		
176	خدا کا اعتقاد		
176	ملائکہ کی الوہیت		
177	جنت کی الوہیت		
178	بت پرستی		
179	ستارہ پرستی		
184	جن اور شیاطین اور بھوت پلیٹ		
184	اوہام پرستی		
189	جنگ جوئی		
190	شراب خوری		
191	قمار بازی		
200	سودخوری		
201	لوٹ مار		
202	چوری		
203	سفال کی و بے رحمی و دوھشت		
205	زن اور فو احش		
206			

صفہ نمبر	مضامین	صفہ نمبر	مضامین
230	قبائل کی خانہ جنگیاں	207	بے شرمی و بے حیای
233	سیاسی مشکلات	207	عورتوں پر ظلم
236	ذریعہ معاش	209	و حشمت و جہالت
238	رفع شک	211	عربوں کی خصوصیات
	تبليغ نبوی اور اس کے اصول اور اس کی	211	خیر الامم بننے کی اہلیت
240	کامیابی کے اسباب	211	صحبت نسب
240	فریضہ تبلیغ	212	کسی پہلے نہ ہب میں داخل نہ تھے
241	تبلیغ کی اہمیت	213	تمکوم نہ تھے
242	اس کی دعوت	213	کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے
244	تبلیغ کے اصول	213	وہ زمین کے وسط میں آباد تھے
245	قول لیں	214	بعض اخلاقی خوبیاں
245	اعراض اور قول بیان	214	شجاع و بہادر تھے
246	تیسیر و تبیشر	214	پرجوش تھے
246	تدریج	214	حق گو تھے
247	تالیف قلب	214	عقل و داش والے تھے
247	دعوت عقل	215	ذہن اور حافظہ کے تیز تھے
249	نہ ہب میں زبردستی نہیں	215	قیاض تھے
252	میدان جنگ میں تبلیغ	215	مساوات پسند تھے
255	مسلسل تبلیغ جماعتیں	216	عملی تھے
256	تبلیغ و دعوت کی تنظیم	216	ان اوصاف کی مصلحت
257	سلبگوں کی تعلیم و تربیت	218	صحیح سعادت
257	دعوت بالقرآن	218	ایک قوم کا انتخاب
258	اشاعتِ اسلام کی تدریجی ترتیب	219	اصلاح و ہدایت کی مشکلات
259	قبول اسلام کے لیے کیا چیز در کار تھی	219	جهالت
261	اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع	224	آبائی دین و رسم کی پابندی
267	ایک ضروری نکتہ	228	توہم پرستی

صفہ نمبر	مضامین	صفہ نمبر	مضامین
315	اللہ تعالیٰ کی سُتی پر دلیل	267	موائع کا ازالہ
324	توحید پر عقلی دلیلیں		اسلام یا محمد رسول اللہ علیہ السلام کا پیغمبرانہ
325	توحید کی تکمیل	274	کام
326	خدا کی حقیقی عظمت	276	تعلیمات نبوی کی بہگیری
328	انسان کا مرتبہ	277	اسلام کے چار حصے
332	خدا کا جامع اور موائع تخلیل	278	عقائد
334	اسما و صفات	278	عقائد کی حقیقت اور اہمیت
244	صفات جمالی	285	اللہ تعالیٰ پر ایمان
346	صفات جلالی	285	اصلاح عقائد
347	نکتہ	286	تعدد خدا کا ابطال
347	صفات کمالی	287	بزرگوں کی مشرکانہ تعلیم سے روکنا
348	صفات وحدائیت	290	درمیانی و اسطوں کا مشرکانہ اعتقاد
348	صفات وجودی	291	خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں
348	علم	293	حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے
349	قدرت	294	غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم
350	نکتہ	294	صفات الہی کی توحید
350	تعریف	296	مخفی و قتوں کا ابطال
351	ان تعلیمات کا اثر اخلاقی انسانی پر	298	اوہام و خرافات کا ابطال
357	خدا کا ذرا در پیار	300	کفارہ اور شفاعةت کے غلط معنی کی تردید
357	محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم	307	اجرام سادوی کی قدرت کا انکار
361	محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	308	غیر خدا کی قسم سے روکنا
363	تعلیمات اسلامی میں محبت الہی کے مظاہر	309	خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں
377	فرشتوں پر ایمان	310	مشتبہات شرک کی ممانعت
377	ملائکہ کے معنی	311	قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا
378	ملائکہ کا تخلیل نہ اہب قدمہ میں	312	ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے
378	ملائکہ کا تخلیل فلسفہ میں	315	توحید اور اس کے ایجادی اصول و اركان

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
405	تمام کتب الٰہی پر ایمان لا ناضوری ہے	378	یونانی مصری فلسفہ
407	نبیاءے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	378	صاہی
407	چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	378	اسلام میں فرشتوں کی حقیقت
408	اس عقیدہ کا اثر سیاست عالم پر	380	اس عقیدہ کی عقلی حیثیت
408	اقوام عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق	381	آیات و احادیث میں ملائکہ کا ذکر ۔
408	مسلمان	381	ملائکہ کے فرانض
409	اہل کتاب	389	فلسفہ و مذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی
409	شبہ اہل کتاب	392	فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد
409	کفار اور مشرکین	394	رسولوں پر ایمان
410	وحدة الادیان	394	ایک عام غلط فہمی کا ازالہ
410	تمام سچے مذاہب ایک ہیں	394	نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں
410	دین اور شرعاً، منک منہاج کافر ق	395	تمام دنیا میں پیغمبر آئے
411	صحیفہ و قاتفو قاتا کیوں نازل ہوئے	396	تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف
411	وحدة دین پر قرآن کی شہادت	396	پیغمبروں میں تفرق کی ممانعت
412	وحدة دین کی بحوث عامہ	398	پیغمبروں کی غیر محمد و تعداد
413	دین قیم	399	مختلف نیز پیغمبروں کی رسالت کا اقرار
413	اسلام اور مذاہب قدیمه کا اتحاد	399	پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار
414	دین ہمیشہ ایک رہا	399	پیغمبروں کا منصب اور فرانض
414	شرع اور منہاج میں تبدیلی ہوئی	400	پیغمبروں کی عصمت
414	اس کی مثالیں	401	قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ
415	تبدیل قبلہ	402	وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے
415	خانہ کعبہ کے حج کی تعینیں	402	ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول
	یہودیوں اور یهیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل	403	انبیاء کی بالہی ترجیح کا مسئلہ
415	کرنے کی بدایت	405	کتاب الٰہی پر ایمان
416	مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	405	کتاب الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد
416	صحیفہ محمدی نے الگی کتابوں کی تصدیق کی	405	اس عقیدہ کا تکمیل پہلو

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
424	حضرت موسیٰ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	416	اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو جھوڑ کر ابوا کی پیروی کی
425	حضرت عیسیٰ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لیے	417	حدود میں شریعت کا اختلاف غیر احمد ہے یہود و نصاری فروعی اختلاف پر ایک دوسرے کو باطل کہتے ہیں
425	موعود الامم (علیہ السلام) کی آمد اور اس کا دعویٰ	417	وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت کی دعوت دیتے تھے
425	وہی الہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	417	
425	تکمیل دین کے اثرات و مظاہر	417	
426	قرآن کا یہیں ہونا	417	اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیم کی جانب
426	قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہونا	418	اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے
426	قرآن حفظ ہے اور رہے گا	418	ایمان عمل کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے
426	اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے بری نہیں	419	اسلام کا مل تمام رسولوں کی تصدیق ہے یہود و نصاری انبیاء کی تکذیب کرتے رہے،
426	تدبیر مذاہب دائی نہ تھے اس لیے دائی حفاظت کا وعدہ نہ تھا	419	اس لیے اصل اسلام سے ہٹ گئے
426	قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر	420	یہود و نصاری کا حسن عمل
427	قرآن کے لفظ و عبارت و معانی کی حفاظت کے لیے وعدہ الہی	420	اسلام کا اصل الاصول توحید کامل و رسالت
427	قرآن کا غالب ہونا	422	عموی ہے
427	ختم نبوت	422	اسلام کا ہدایت تامہ ہونا
428	وحدت ادیان اور دین اسلام	422	توحید کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی مستحق نہیں
428	وحدت دین کا مشا اسلام ہے	422	نبوت محمدی (علیہ السلام) کا دعویٰ
428	صحیفہ محمدی (علیہ السلام) نے اہل کتاب کو وحدت دین کی دعوت دی	422	دعوت محمدی (علیہ السلام) میں ہدایت کی بشارت اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوت محمدی (علیہ السلام) کیوں پیش کی گئی
428	وحدت دین کی حقیقت صحیفہ محمدی میں	424	تحمیل دین
429	پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	424	قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا
430	یہ اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی ہے	424	

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
437	میں عالم خواب کے لذاند و آلام کے فلسفیانے	430 431	آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے
437	اسباب و علل بھولے ہوئے احساسات و معلومات کا خواب	431 431	قرآن میں ایمان بالله کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے
437	میں مشکل ہو کر نظر آتا اچھے اور بے اعمال کے نقوش ذہن انسانی	432 432	آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ و بعثت توراۃ و انجیل میں برزخ و بعثت کی تفصیل نہیں
437	کے گوشوں میں تمیلی خواب اور اس کی مثالیں	432 432	اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل اسلام میں تین دور ہائے حیات
437	جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی یا بیشی سے خواب میں ان کے تناسب جسم شکلیں اور ان	432 432	دنیا، برزخ اور قیامت ان تینوں دوروں میں فرق
438	کی مثالیں اعمال انسانی کا خواب میں اپنے تناسب	433 433	۱۔ برزخ قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی
438	قالب میں جسم ہوتا اور ان کی مثالیں	433 433	قربر، برزخ کا عرف عام ہے
438	اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	433 433	موت و حیات کی منزلیں
440	اعمال کی تمثیلات حادیث میں	433 433	قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر
441	گناہوں کی تمثیلی سزا میں آنحضرت ﷺ کے ایک روایتے صادقہ	434 434	دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریع
	میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزاوں کے	434 434	علم برزخ کی کیفیت نیند اور موت کی مشابہت
441	مناظر	435 435	نیند اور موت کا فرق
442	ان تمثیلات کی تعبیر و تشریع	435 435	قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے
443	علم انسف سے انسان کی لعلی	435 435	برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے
443	تصوری یقین اور خارجی و جو دکا باہمی تعلق	436 436	قرآن میں دوسری زندگی کے لیے بعثت کا لفظ
443	قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں	436 436	خواب میں لذت و الم
443	علم الحقیقین و عین الحقیقین	436 436	خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہوتا
443	علم الحقیقین کے حصول کا ذریعہ ایمان ہے		عالم کا خاتمہ بیداری میں
	علم الحقیقین کے ذریعہ ورزخ کا مشاہدہ دنیا میں		اور بیداری کی لذت والم کا خاتمہ عالم خواب

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
455	جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت والم کا احساس ہوتا ہے	444	موت کے بعد جاپ مادیت کا انھنا اور اعمال کے تمثیل تماج کو کس حد تک دیکھنا
455	بعض سعید روحس جسم خاکی کی غفل کی قید سے آزاد کر دی جاتی ہیں	445	قیام روز جزا پر تمام راز ہائے سربستہ کا فاش ہو جانا
455	مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	445	احوال برزخ کا میں ایقین
455	سوال و جواب	445	موت کے بعد عالم برزخ کی ابتداء
	قبر میں فرشتوں کا توحید و رسالت کے متعلق سوال	446	عالم برزخ میں جزا و مزا کے پس پرده مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں
455	قبر کے سوال و جواب کا ذکر قرآن مجید میں	447	موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت
457	سوال و جواب کا اصل مفہوم	447	موت کے لیے قرآن مجید میں خدا کی طرف بازگشت کی اصطلاح اور اس کا مفہوم
457	برزخ میں ارواح کا سکن	447	اس وقت کا سماں
460	آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل	449	موت کے سماں کا خاکہ قرآن مجید میں
460	قیامت اور جزاے اعمال	449	جسم سے روح کی علیحدگی کے بعد مزا کا دور
460	کیا کبھی دنیا یے حیات پر بھی موت طاری ہوگی	449	سر اقانون عمل کے طبق انسانی اعمال کا نتیجہ ہے
	نظام کائنات کی بربادی کی پیشینگوئی اہل سائنس کی طرف سے	449	نیکواروں کو بشارتیں
460	قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں	450	برزخ کا عذاب و راحت
461	قیامت	450	برزخ میں عذاب و ثواب کے مناظر
461	قیامت کے نام قرآن میں	450	برزخ اور اس کے عذاب و ثواب کا تذکرہ
463	قیامت کے اوصاف	451	قرآن مجید میں
464	قیامت میں فساد نظام ہوگا	453	قبر کی اصطلاح
464	اس کی شہادتیں قرآن مجید سے	453	احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے
466	بعد قیامت ایک نئے آسمان اور زمین کی تغیر پچھلی دنیا کے تماج پر اس کی بنا	454	قبر کا مفہوم
466	قیامت کی حقیقت	454	قبرا روح و نفوس کی دنیا ہے
467	صور قیامت	455	قبر کی روحس جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی میں متنسل ہوتی ہیں
470			

صفہ نمبر	مضامین	صفہ نمبر	مضامین
	"وجود" کے موجودہ قوانین فطرت اور ان کے خصوصیات و لوازم	470	عربوں کا انکار قیامت سے اسی لیے اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا
488	ما دی دنیا کے قوانین فطرت اور سلسلہ علم	471	عقیدہ قیامت اصول دین کیوں ہے؟
489	و معلول اسی ما دی عالم کے ہیں	472	قیامت پر قرآنی دلائل
	خسرو ہی نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت وہاں	473	ہر جسمانی
489	بھی کافر مأہوں	478	روحانی زندگی کا تصوری جسمانی زندگی سے
489	اصول جزا	478	زیادہ دشوار ہے
489	اصول فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں	478	ہر جسمانی ہوگا
490	اعمال کے لوازم و نتائج	479	جسم و جسد
490	عقاب و ثواب رو عمل ہے	480	کیا کوئی بیان جسمانی پیکر ہوگا
491	حصول راحت کا اصول	480	یا جسمانی پیکر جسم خاکی کی خصوصیات و لوازم
493	ثامہ عمل	480	سے الگ ہوگا
493	کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فائدیں ہوتی	480	"خلق جدید"
493	اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں	480	ذمہ داری روح پر ہے
	قرآن مجید میں اس اصول کی تعریج اور اس پر شہادتیں	481	دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے
493	اعضا کی شہادت	482	اخروی جسم کیسا ہوگا؟
495	میران	483	جز اور سزا
497	حساب	484	جز اور سزا دگر مذاہب میں
498	جنت و دوزخ	484	عالم آخر کا فہم و ادراک
498	جنت انسان کی وراثت ہے	487	عالم آخر کو ما دی دنیا کی زبان و محاورات میں سمجھا گیا ہے
	حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	487	اس طرز افہام سے فلسفی و عایی دونوں تشفی پاتے ہیں
498	آدم اور بُوآدم کی اصلی جگ جنت ہے	488	اخروی و تعالیٰ کے سمجھانے کے لیے ما دی الفاظ کا استعمال
499	جنت کے دورخت، نیک و بد کی پہچان کا اور زندگی جاوید کا	488	

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
518	عذاب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے		آدم علیہ السلام کو نیک و بد کی شاخت کے درخت سے روکا گیا
519	انسان کی تخلیق رحمت کے لیے ہوئی	500	
521	دوزخ		شیطان نے حیات جادوال کا درخت کہہ کر
521	دوزخ قید خانہ نہیں شفاغانہ ہے	500	نیک و بد کی شاخت کے درخت کو بتا دیا
	گناہ روحانی پیاری کا اور عذاب اس کے نتیجے	500	حیات جادوال سے مقصود کیا ہے
521	بد کا اصلاحی نام ہے	500	نیک و بد کی تمیز کا باعث ہے
521	دوزخ کی مثال شفاغانہ ہے	500	آدم کو نیک و بد کی تمیز کا فطری الہام
521	دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی		انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول کرنا اور
523	گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	500	حیات جادوال کا حصول سمجھی عمل پر موقوف ہونا
524	دوزخ میں رحمت الہی کا ظہور اور نجات		زمین پر بناؤ دم کی چار چیزوں کھانے پینے پہنچے
524	اس کی تصریحات احادیث میں	502	اور اور ہٹنے کی ضروریات کا پیدا ہونا
527	شرک و کفر کی بخشائش نہیں		مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز
528	کیا دوزخ کی اختیاہ ہے؟		طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے
	دوزخ رحمت الہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرو	502	احتراز کی تلقین کی
528	ہو جائے گی	502	جنۃ کی وراشت کا وعدہ الہی
528	اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	503	انسانی جزا اوسرا کے تین گھر
529	دوزخ کی اختیاہ قرآن مجید میں مشیت پر ہے	504	انسان کا پہلا دارالجزا یعنی دنیا
	کفار و مشرکین کے عذاب کی اختیاہ مشیت الہی	507	مگر یہ دارالجزا فاقیہ ہے
529	پر موقوف ہے	508	یہ دارالجزا اور الاصلاح بھی ہے
	قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل	509	انسانوں کی تنبیہ و اصلاح کے مرتب
530	وجود پر دلالت نہیں کرتی	509	نیک سے برائی کا کفارہ
	قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی	510	تو پر کفارہ ہے
531	تصریح کی گئی	512	مصلحت کی تنبیہ اور کفارہ
531	قرآن مجید سے اس کی تصریح	514	عذاب الہی کا مقصد
531	اس کی شہادت حدیثوں میں	515	عذاب برزخ بھی کفارہ ہے
532	دفع شہمہ	517	عذاب دوزخ کفارہ گناہ ہے

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
554	جنت کے عیش و مرسوت کی تعبیر آسمانی بادشاہی سے سیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	532	دوسرا کا شہرہ
554	آسمانی بادشاہی کے اجمالی تفصیل	533	اس شبہ کا زال
555	جنت کے لیے باعث کا استغفارہ کیا عرب کے لیے ہے	534	چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تصریح
556	اس استغفارہ میں ایک نکتہ	535	ان آیات کا مفہوم
557	سامان جنت کے دنیاوی نام	535	اللہ تعالیٰ کے وعدہ عذاب و ثواب میں فرق
	جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر رہائش	536	مشرکین و کفار کی معانی کی صریح تصریح کیوں نہیں
557	اس کی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	536	عقیدہ کفارہ اور عقیدہ کرم اور عقیدہ مشفّر
559	جنت کی سرتین اعمال کی تمثیل ہیں	537	عذاب طویل کا سبب
559	اس کی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	537	مشرک و کافر کا آخر نبام؟
564	لطف و مرسوت کا تصور	540	جمہور کے نزد یک عذاب دوزخ کا دوام
564	لطف و مرسوت کا علیٰ ترین تخلی	543	بہشت و دوزخ کی جزا اور سزا بھی تمثیلی ہے
564	جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی	543	تمثیلی سزا کے معنی
565	جنت، جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں	545	اس کی مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے
567	جنت، جہاں رشک و حسد نہیں	545	دوزخ کی جسمانی سزا کیں
567	دہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	548	دوزخ میں روحانی سزا کیں
568	جنت ارتقاء روحانی ہے	548	ان کی تصریح قرآن مجید سے
	مسئلہ ارتقاء کے اصول بقاۓ صلح کا عمل روحانی	550	جنت
569	مدارج کے ارتقا میں	550	جنت کے نام
570	امن و سلامتی کا گھر	550	جنت کا دوام
571	مقام رحمت	550	اس کی تصریح قرآن مجید میں
571	مقام فور		دائمی قیام سے اہل جنت کا جنت سے گھبراانا ان
572	مقام رضوان	554	کی جملت و نظرت کے خلاف ہوگا
574	مقام طیب و ظاہر	554	غیر قابل بادشاہی

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
	قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین	575 576	مقام تبعیج و تبلیل صحیح و شامم کی روزی
589	آنحضرت ﷺ نے اس راز کو ظاہر کیا	576	مقام ترب
589	یک وقت دو صداقتیں	577	دیدار الہی
589	صحیح محمدی میں ان دونوں صداقتوں کی تفصیل اور ان کی تشریع	578 579	ان تعلیمات کا عملی اثر عرب کا ایمان و تلقین اور صحابہ کی خشیت الہی
590	بدایت و ضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ	582	قضا و قدر
591	"خیر و شر" کا مفہوم اسلام میں	582	کیا عقیدہ قضا و قدر را ایمانیات میں ہے
592	"اگر خدا چاہتا تو ان کو بدایت دیتا" کی تغیری	582	عقیدہ قضا و قدر کا حاصل
593	بندہ کی خشیت	582	اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں
593	اللہ کی گمراہی کن کے لیے ہے؟	583	خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم نے اس کی کیا تجھیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے
594	نتیجہ بحث	584	اصطلاح تدر و قضا کی تشریع
595	ایمان کے نتائج	585	اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت
596	خلاصہ مباحث	585	عقیدہ قضا و قدر کی توضیح
596	ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے		عقیدہ قضا و قدر کا نتیجہ پستی سُتی و دون بھتی نہیں
596	اسلام میں ایمان و عمل کی جامیعت	586	
596	درخت اپنے پھل سے بچانا جاتا ہے	586	اس کا نتیجہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے
597	اہل ایمان کی عملی شناخت	587	غلظتی کا ازالہ
600	تمام نیکیاں صرف ایک جزا ایمان کی شاخیں ہیں	588	قضا و قدر اور سعی عمل کی باہمی تطبیق
600	ایمان کے بعد عمل کی ضرورت		پہلے فتن اور نافرمانی ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے
600	ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں	588	
600	خاتمہ	589	جر و قدر
		589	جر و قدر کا مسئلہ لا یخل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع اول

اللّٰهُمَّ إِنَّمَا نَعْلَمُ الْعِلْمُ وَالصَّلُوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ
وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ

اے باز کن در معانی	بر ما بکلید آسمانی
ہر چہ از تو گمان برم بچونی	آن من بوم و تواز آن بروني
شاہ رسول و شفیع مرسل	خورشید پسیں و نور اول
سلطان ممالک رسالت	طغرائیں صحیفہ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب ”سیرۃ انبیٰ علیٰ یتیم“ کے سلسلہ کی پوچھی جلد ہے۔ اس کا موضوع ”منصب نبوت“ ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے، جس میں آنحضرت علیٰ یتیم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مرتع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت علیٰ یتیم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دو قسمیں درپیش تھیں، شرح و بسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کی تعلیمات و ارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت علیٰ یتیم کو پیش گاؤ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ وہ حقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے ① عقائد، ② عبادات، ③ اخلاق اور ④ معاملات، خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوارگزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، تا چار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا و دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہار گانہ کے حقوق و فوائد سے بحث ہو گی اور تیسرا جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہو گا جس میں ہم ان شاء اللہ پر تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص قوانین نکاح، طلاق، وراثت، حقوق ناس، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراج ترقی شریعت اسلام کا پایہ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحثت میں سے صرف عرب

جالبیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں اختیاٹ کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکساری کے خط کا قلم پر ہے۔ (وَقَاتَ أُبَيْتُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَا مَكَارٌ فِي السُّوءِ) (۱۲ / یوسف: ۵۳) کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استخار، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیح سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظراتہ پہلو سے شیخ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرا مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلام کی تکمیل شان نمایاں ہو جائے۔ ان اوراق کے لکھنے والے کے نزد یہ شیخ شریعت کے معنی کی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مناکر کی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلت کامل تر تعلیمات بلکہ ان کی تجھیں کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذاہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تجھیں دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ (الْيَوْمَ الْمُلْتَ لَهُمْ وَيَنْكِمُ وَأَمْتُ عَلَيْكُمْ نَعْمَلُنَّ) (۵ / المائدۃ: ۳) ان کی تکمیلی مباحثت میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لیے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں، چلنے والا تو تحک کر چور ہے۔ اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروہی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہیات آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مذہن و مرتب کتاب میں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبه کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ ہی ہیں جو امانت بالله و ملائکتہ و کتبہ و رسولہ و الیوم الآخر و القدر خیرہ و شرہ من الله تعالیٰ میں مذکور ہیں یعنی ”خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضاؤ قدر پر ایمان۔“ چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔ میں نے

اپنے جانے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریع میں قلم، صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوک رکھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت بحجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدٰ﴾ (۷/الاعراف: ۱۷۸)

”جس کو خدا را دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔“

﴿وَمَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهٗا لَكَ مِنْ مُّضِلٰتٍ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳۷)

”اور جس کو خدا را دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔“

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ تَسْبِّحَنَا أَوْ أَخْطَلَنَا﴾ (۲/البقرہ: ۲۸۶)

”ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔“

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد تو قبولي رو زیش باد

طالب رحمت
سید سیمان ندوی
دار المصنفین، عظیم گرذاھ
(بریج الاول ۱۳۵۴ھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت ابنی صلی اللہ علیہ وسلم جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرا دل اخطر ارب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستے میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمد لله والمنة کے سوا یہ دوزخ کی ابدیت وغیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افراطی قوں سے خواص علم اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملائے اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے اس میں طبع اول کے مطبع انگلاطری تصحیح کردی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شنگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیت نامیں جمہور کے خیال کی ترجیحی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

واعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے، تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی منفرد کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لیے ۲۸۶ صفحوں کی ایک جلد بہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سامانا مشکل تھا، اس لیے گو صحفوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۵۰۵ سے کتاب دھھوں میں علیحدہ بھی کردی گئی ہے، تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے، تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سینکڑی میمان ندوی

۷۴ رب ج ۱۳۵۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمة منصب نبوت

کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنا مے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعات زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوہات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوہات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلہ دعوت میں اتفاق آپشیں آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور ن صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرواز کو شکش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرا شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروع پایا اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے پیورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزرگ شہیر مٹا دیں اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پروازوں سازشوں اور کوششوں کے سیالاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خوزیرہ لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ ابیانہ بوت، حسن تدبیر، لطف اخلاق سے تمام معمر کے سر ہوئے اور پھر ایک پر امن نظام قائم ہو گیا بے شبہ یہ کارنا مہیں بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات القدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گونہ یافت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی برادر است اور مقصود بالذات کارنا مہیں وہ اتفاقی حادث ہیں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنا مے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات و نمانہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرہ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپ و حانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ تو حید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سرماںح منیر بن کر بیقعہ نور ہنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہاں کو مٹانا، اخلاقی فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صاف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی پردو موعوظت اور تہذیب و تمدن کے رمز سکھانا، روحانیت کی برپا شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے دیران گھروں کی از سر نوا آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، نہاب عالم کی

اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الہی کا اظہار و عرض اور تہذیب نفس کی معراج اخیر تھی اور یہ سب اُسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے پیش نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارنا مون پر مشتمل ہے۔
نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سماج و محدث اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قدر مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور یہاں مرکبنتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موٹی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا تجھہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے معارج القدس ﷺ میں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو جہة اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کو چوں سے باخبر ہیں، اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ بکھڑا ذائقی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہو گا۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

”نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ الہی اور موبہبت رب انبی ہے، سماج و محدث اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسْلَتَهُ﴾ (۶/ الانعام: ۱۲۴)

”اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیارا میری کا منصب بنائے۔“

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُؤْحًا ﴿٢﴾ مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَذَرِّيْنَ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْأَيْمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَا نُورًا أَهْدِيْتِ بِهِ مَنْ شَاءَ مِنْ عَبْدَنَا ﴾۳﴾

﴿۱﴾ معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیرہ شائع کر دیا ہے۔ یہ ضمیرہ عربی عبارت میں الکلام کے ترتیب میں ایک مطبوعہ نامی پر میں کان پور ۱۹۰۳ء (ص: ۲۸۵۹) میں شامل تھا مگر بعد کے اینی شیخوں میں صرف اردو خلاصہ میں شامل رہا۔

﴿۲﴾ معارج القدس، بحوالہ ضمیرہ الکلام، ص: ۲۶۱، ۲۶۰۔

﴿۳﴾ امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری کر دی ہے۔

(٤٢/ الشوری: ٥٢)

”اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھی، تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سو جھائیں۔“

اس موقع کے لیے صریح آیت یہ ہے:

﴿ذلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُوتِيُهُ مَنْ يَشَاءُ﴾ (٦٢/ الجمعة: ٤)

”یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو چاہیں دے۔“

گویا صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مرائقہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص شخص اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیا کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا پچھا اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے مکے لیے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدا و جہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح نبوت نوع انبیا کے لیے اکتسابی چیز نہیں لیکن مشارعے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملنے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادات و مرائقہ میں بسر کیا، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلدے اس طرح گزارا کہ وہ دنیا کی آلاتشوں سے یکسر الگ ہو گئے تو راہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں معروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار رامیں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر و مرائقہ اور عبادات اور ریاضت میں معروف رہنا سب کو معلوم ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نہوت سے پہلے حرام میں جا کر جب عبادات میں مشغول ہوئے تو رؤیائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل پسیدہ صحیح کے صاف نمایاں ہوتی تھی وہی کے بعد آپ اس قدر عبادات میں معروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوچ جاتے تھے اسی لیے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا:

﴿طَهَ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتُشَفَّىٰ﴾ (٢٠/ طہ: ٢٠)

”اے پیغمبر احمد نے یہ قرآن تجوہ پر اس لیے نہیں اتنا را کہ تو تکلیف اٹھائے۔“

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں صحن صورت، اعتدال مزاج، نشوونما کی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، کرم اخلاق، نیکی، متاب، سنجیدگی دوستانِ الہی کے ساتھ نرم خوبی اور تو اضخم اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے، علاوه بریں وہ راست گفتار، امانت دار تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محسن سے آ راستہ اور ذمیل باتوں سے مبرأ ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قربت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواهوں کی فریاد رسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

﴿مَا أَصَّلَ صَاحِبُكُمْ وَمَا مَأْغَى﴾ (۵۳/ النجم)

”تمہارا ساتھی (پیغمبر) نماز نہ ہوا اور نہ بہکا۔“

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گراہی و بے راہروی سے پاک ہوتا ہے:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا أَطْفَى﴾ (۷۳/ النجم)

”اس کی نگاہ نہ کجھ ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔“

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں، اس کی قوت کے سامنے بالا خرطوعاً و کہا سرگلوں ہو جاتی ہیں، باس ہمہ وہ مغرور، جابر، جھاپیش، بدخوا درشت مزان نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے باعظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں: ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے اسی طرح انہیا علیہ السلام کو اپنے نفوس قدیسه کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راه راست سوچاتے اور خود را راست پر قائم رہتے ہیں ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقولوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو مجھزہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برادر کا شریک ہوتا ہے مگر

عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو فرق آنے نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَكُلُّمٌ يُوْلَى إِلَيْهِ﴾ (١٨ / الکھف:)

”میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔“

دیکھو کہ بشریت میں گوپنیم بر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حداصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں فکری، قولی، عملی ان تینوں سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بردے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قولی صحیح بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور بردے بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، صحیح اور جھوٹ اور اچھے اور بردے میں تینیز کیوں نہیں؟ پھر کیا یہ تینیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بدایہ غلط ہیں، اب رہ گیا تیرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قولی صحیح ہے، فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں بردے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی غنیمہ اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرा طریقہ: نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہمی اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقاء نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تماں کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ بردے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تماں کہتے ہیں اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہنچنے اور رہنے کے لیے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح و قربت اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تماں کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے پھاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اس تعاون اور تماں کے اصول ضروری ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الہی

سے بن سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدار اشہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلے جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو مجال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باغ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندر وہی وپیروںی احوال دیکھیا کے رہوں سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جانتا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات انہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا اپر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطے ہیں، ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔ اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشیں رکھنے چاہئیں:

① چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مردح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہوا اور وہ شے عدم سے وجود میں آنے کے بھی امر منع ممکن کی علت ہوتا ہے۔

② ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بدم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسرا آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں، تاہم ان کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا:

﴿وَأَوْلَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا﴾ (۴۱ / ختم السجدة: ۱۲)

”خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔“

③ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں

نہیں آ سکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے راہنمای کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا تھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، حق کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

④ خدا کے حکم و قسم کے ہیں تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَالثَّامِسُ وَالْقَعْدَ وَالْجُمُوْرُ مُسَخِّرٌ بِاُمْرِهِ۝ الَّذِي اَخْلَقَ وَالْأَمْرُ﴾

(۵۴/الاعراف)

”اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع دار ہیں اسی کا نام ہے بنا اور حکم فرمانا۔“

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذْ أَعْدُدُ وَأَرْبِكُمُ الَّذِي خَلَقَمُ﴾ (۲۱/البقرة)

”اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔“

مقدمات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لیے مرنج کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں، اس لیے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کے تحمل ہیں، اس لیے راہنمای کی ضرورت ہے، اسی راہنمای کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعے ہے اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسی ہی نفوس کے ذریعے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے جیۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مجھ کے دو ابتدائی بابوں میں اسی پر بحث کی ہے ॥ اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ بخی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بھیکی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص و طمع، استیلا و جبر و غیرہ افعال بھیکی قوت کے آثار ہیں اور غور و فکر، علم و معرفت، حسن اخلاق، صبر و شکر، عبادت و طاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بھیکی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعے سے بھیکیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ و عصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر، موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص و طمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے امنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت

۶۸ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۶۵ تا ۶۸۔

احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندر وہی وجدان و احساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل خیر و شر اور نیک و بد کی تیزی کو بھول جاتا ہے اس لیے نوع انسان کو ایسے صحیح راہنماؤں اور روحاںی معلوموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آزاد ہو۔

اگر افراد، جماعت اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آتشی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو برگروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق و فرائض کی تعین کرے ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علمیاً تک پہنچ پھر اخلاق و روحانیات اور ملک و ملت کے مصالح و فائدہ عامہ کافی جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس راہنمائی کے منصب کا مدغی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا مأخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس، کا وجدان ہوتا ہے کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اس طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاندگتی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم بھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاندگی کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے بعینہ اسی طرح ان نقوص قدیسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ

ناطق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربے سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا لیکھن ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اردو گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی "بحث نبوت" کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں، جس

کا حاصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل و مکمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں ان میں سب سے بڑا درجہ مفہومیں کا ہے اور یہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیت نہیں بلکہ ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبے سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشیح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاء میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلکہ کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تجسسات میں بیتلار ہیں، سچے فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طورو طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیضوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور مدد یہ رکلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ ہر اہ راست کی کو تکلیف نہیں دیتے الیکہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کار و بار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کا حج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنان عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لیے قرب و سکیت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کی اقسام

مفہومیں کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور انہیں پاپ ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعے سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل

﴿ حجۃ اللہ البالغة، ج ۱، ص ۶۵ تا ۶۶۔ ﴾

ہے اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا نیشن پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملائے اعلیٰ کا نزول ہو وہ اس سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مختلط طب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ موئید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کر لوگ اس کی صحبت اور پندرہ موعوظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک بھیج جائیں اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہاں لا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبۃ عظیمی سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لیے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بدائعی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ذرا نے والا ہوشیار کرنے والا) ہے اور جب حکمت الہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مفہومیں میں سے کسی کو بھیجی تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی خلافت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس تبلیغ ارشاد بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا فِتَّلُوهُمْ يَتَّلَقَّبُونَ عَلَيْهِ إِلَيْهِ وَيُنَزِّهُمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكَلِيلُ وَالْعَلِيمُ الْكَلِيلُ﴾ (۶۲/ الجمعة)

”وَهِيَ خَدا جس نے ان پڑھوں میں، انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جوان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دنائی سکھاتا ہے۔“

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجْتُ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

(۳/آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لاٹی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ولیسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

﴿لَيْكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ وَلَكُونُوا شَهِيدًا عَلَى النَّاسِ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

”تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔“

اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو فرمایا (فَإِنَّمَا بُعْثِتُمْ مُّسَرِّبِينَ وَلَمْ تُبَعْثُرُوا مُغَسِّبِينَ) * ”تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیج گئے ہو تھی کرنے والے بنا کر نہیں۔“ آنحضرت ﷺ سے پہلے جوانی میں آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالامناصب میں سے ایک یادو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعضیں بھی بکمال اتحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیے حکمت الہی کا اقتضا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و ظلم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں محصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دنائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور اسی بعثت پر اس رسول کی اطاعت اسی لیے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور ابتداء میں محصر ہوتی ہے اس لیے بارگاہ الہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیے قائم کی جائے، تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب ہی ہوئی ہیں منادیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے، تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح

* بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء على البول في المسجد: ۲۲۰؛ کتاب الادب، باب قول النبي ﷺ: ۶۱۲۸؛ مسنند امام احمد، ج ۲، ص: ۲۳۹۔

ہمارے پیغمبر رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجا ہے جو اس کی بھی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنادے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی یا کسی قوم کے متعلق قضاۓ اللہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤد، حضرت سليمان اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے، اور اس کے دشمنوں کو پے درپے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن میں ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقْتُ كَلِمَاتِنَا لِعِبَادِنَا الْعَرْسَلَيْنِ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُسْتُحْسُونُونَ ۚ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَلِيْلُوْنَ ۝﴾ (الغیلیلوں ۴۷)

(۱۷۲-۱۷۱/الصفات: ۳۷)

”اور (ای پیغمبر) ہماری بات بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی شکر غائب ہو گا۔“

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرفاً حرفاً صحیح ہے، انہیاً کرام علیهم السلام کے احوال مبارک اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہو گی ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جاسکتا ہے جس طرح نفیات، اجتماع (سایکالوجی آف پیپل) یا نفیات راہنمائی (سایکالوجی آف لیڈر شپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ مجتبی نے اوپر کے صفات میں جو کچھ کہا ہے ہم جیسا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ”نفیات نبوت“ کے گواہ ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔ خور کرنے سے یہ معلوم ہو گا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی قابلیت سے وہ سرمو اخراج نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں گل ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گردی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔

زمین کو سر بہزی اور شادابی کا کام پیرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ اب کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر ماموروں ہیں وہ بخوبی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟ آؤ انسان کو غور سے دیکھیں بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، امتحانا بیٹھا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر بھی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذمہ ارادہ اور غیر ذمہ ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور جو سوال کرتا ہے؟

﴿أَكْسِبُهُمَا أَنْمَاءَ خَلَقْتُمْ عَبْثًا﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۱۱۵)

”کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔“

﴿أَيْمَسْبُ الْأَنْسَانُ أَنْ يُتَرَكَ سُدًّيٌّ﴾ (۷۵/ الفیامہ: ۳۶)

”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟ انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحے سے مت جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح الٹتے رہیں گے، ہوا میں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، بزرے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ چھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑے جائے، بزریاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ بر سے تو انسان پیاساڑپ جائے، اگر ہوانہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوز ابھجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی بر سے، نہ بزریاں اگیں، نہ انسانی خدا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لیے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پر زہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پر زہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی اہمیت یہ کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لِكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲۹/ البقرة: ۲۹)

”اسی نے تمہارے لیے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔“

پھر یہ بھی بتایا:

﴿أَلْمَرَّ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لِكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ﴾ (الحج: ٦٥)

”اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔“

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

﴿وَسَخَّرَ لِكُمُ الَّيلَ وَالنَّهَارَ وَالْفَلَمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْجَوْمُ وَمَسَخَّرَتْ هُنَّا مِنْهُ﴾

(النحل: ١٢)

”اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔“

ہستیاں دوہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے۔ جہادات، نباتات کے، بنا تات جہادات کے اور جہادات، نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آ ناچاہیے، مخلوقات میں تو اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لا محال اس کی تخلیق خود خالق کے لیے ہوئی ہے۔ الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بوساطہ یا ملاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسانیش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَنَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاريات: ٥٦)

”اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔“

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

① ایک وہ جو ان صفات سے بکسر حروم ہیں، جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

② دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس و استقر اور تمثیل اور حاضر پر عالم کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

③ تیسرا وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آ رائی کرتی ہے، استقر اور تمثیل کے ذریعے سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہات سے نظریات تک پہنچتی اور عالم کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حركات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلیف نہیں ہوتا اسی لیے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات

سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گوارا دہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے برعکس صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے۔ ان کے افعال، حرکات اور آثار کو جملت فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے قاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان میں صادر ہوتے ہیں۔

تیسرا مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جملت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح دیے ہیں بے ارادہ اور اضطرار سزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام عاقبت بینی، انجام اور مآل کا رو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جن و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات و بنیات تو اس لیے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بھو جب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لیے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جعلی و طبعی ہیں اور وہ جملت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطرار ا عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبک دوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جملت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مآل کا اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے اس لیے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لیے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا ہے۔ جمادات و بنیات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جملت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

﴿وَلَلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَةٍ وَالْمَلِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾

﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ قِنْ فَوْقِهِمْ وَيَغْفِلُونَ مَا يَوْمَ رُوْنَ﴾ (۱۶/الحل: ۴۹، ۵۰)

”اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جوز میں میں ہے، جانداروں

میں سے اور فرشتے، وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔“

اسی فطری اطاعت اللہ کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھلو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَأَوْلَىٰ رِبُّكَ إِلَى التَّعْلِيلِ أَئِنَّ الْجَيَالَ يُؤْتَنَا وَمِنَ الشَّاجِرِ وَمِنْهَا يَعْرِشُونَ﴾

﴿كُلُّ مِنْ كُلِّ الْثَّمَرَاتِ فَأَسْلَكَنِي سُبْلُ رِبِّكَ ذُلْلَاطٍ﴾ (۶۸ / التحلیل: ۶۹)

”اور تیرے پروردگار نے شہد کی لکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھٹ ڈالتے ہیں، اپنے لیے گھر بنالے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل، مطیع ہو کر۔“

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت اللہ کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَيِّغُ لَكُمْ مِنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالظَّبِيرُ صَفَّتِ طَكْلِنْ قَدْ عَلِمَ

صَلَكَتْهُ وَتَبَيَّنَهُ طَ وَاللَّهُ عَلَيْمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٤١﴾﴾ (۴۱ / التور: ۴۱)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھوئے، اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔“

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور حاضر پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جہادات میں محدود، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح بیدار اور کار فرما ہے اسی طرح وہ ارادی قوت و اختیار جو جہادات میں محدود، نباتات میں مفقوہ اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لیے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ”تکلیف“ کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت اللہ کے لیے نہیں بلکہ بارا دہ اطاعت کے لیے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجَيَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلُنَّهَا وَأَشْفَقُنَّ مِنْهَا

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ﴿٢٣﴾﴾ (۲۳ / الاحزاب: ۷۲)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور

اس سے ذرے اور انسان نے اس کو اٹھایا۔“

یہ امانت، اس کی نیکی و بدی کی تحریخ اور خیر کا فرقہ ہے جس کے نتیجے کے طور پر شریعت الہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے با ارادہ اور با اختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیار ان افعال کی طرح احکام الہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیار ان افعال میں فطرت و جلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح با ارادہ اور با اختیار افعال میں بھی شریعت کی بالا رادہ اطاعت کر کے حکم الہی کی تعمیل ضروری ہے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالا رادہ پیروی کریں۔ لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و امر سے ہم کو اتفاقیت نہ ہوانہیا اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوصار کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نتیجہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا:

﴿الْمُرْتَأَنَ اللَّهُ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالثَّمُوسُ وَالقَمَرُ وَالْجُوْمُونُ
وَالْجَبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُ وَكُلُّ شَيْءٍ مِنَ النَّاسِ طَ وَكُلُّ شَيْءٍ حَقٌّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط﴾

(الحج: ۲۲)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جوز میں میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر پا کا ہے۔“

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرا فلنگی کا اعلان ہے لیکن خاص با ارادہ اور با عقل اور انجام میں انسانوں کی دو تینیں کردی گئیں ہیں مطبع اور سرکش! کائنات کے صحیفہ کا تدقیقی مطالعہ کرو تو معلوم ہو گا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں، سے جس صفت مخلوقات میں احساس ارادہ اور با اختیار کی جتنی کی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایی گیری کی خدمات انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور با اختیار کا دائرہ اصناف تھی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صفت کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لیے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی بستی صرف اپنی

آنکھیں کھلتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جو تے، بے بوئے، بے چنے نکھارے، بن پکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کار فرمادہ ہوتے ہیں اس کے متک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد، محنت اور جانفشاری کے پسند کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔ جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے ہے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ شگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، جہادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو بننا چاہیے، نباتات عموماً وہی نہیں گے جو ان کو بننا چاہیے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے پس دکر دیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتماد سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انہیا اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام نداہب کی زبان میں ”دل“ ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشریش کی ایک ارادی جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندر وہی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سر انجام پاتا ہے انہیا عَلَيْهِمَا اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیے آتے ہیں۔

ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں دیجت رکھی جاتی ہے پہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو ہر پیش و را پنے متعلقہ کام کو بڑھاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے بعض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بناسکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چاہکدست اور ذہن ہوتے ہیں جو اچھے کاری گروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہن اور

فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ارادہ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سبھے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لانے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تہذیب، طریقہ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف الخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈہ بن جائے۔

جو تمہارے لیے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے اور جواہر بناتا ہے وہ لوہا رہے، جوز یورگھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے کپڑے بناتا ہے وہ جولا ہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیے کارگیری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جو تمہارے لیے مادی کائنات کے چہرہ سے اسرار کا پردہ ہٹانا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہاری مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لیے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور درستوں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو اہم ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیاء ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لیے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صنای کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے بدرجہ بلندتر اور بہتر کام کے لیے ہیں ان کی مبارک الہیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے صدھا قسم کے نئے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال و افعال اور ہر قسم کی حرکات و مکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ”دل“۔ کیا ان بیانات میں اور اس کے تبعیں کے سوانح انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی تکمیل اور اصلاح

کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح، تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقے سے متعلق نہیں کی ہے کیا اس کی شانِ ربویت کے ساتھ سوئے ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لا یا ہے وہ ان سب کو جو تمہارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بننے ہیں، جھونپڑے بنانے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور یہی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور اُسی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس اور حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو منا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولاد آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کر دیتے ہیں ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر انہوں نے وحبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باغ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر تاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد تا کر صحیح و غلط کی تیزی عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گوراہ راست جسم و جسمانیات سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لیے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کے درمیان، امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصلاح میں یوں سمجھو کر مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلاف نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے کسی جسم کے اجزاء ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوچی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قوی اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سایکالوچی (علم نفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب مدلل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ آنٹنکس (فلسفہ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور اواز مکی تفہیش کی جائے تو یہ سوشیالوچی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر جسم کی

صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور با ایس ہمسان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جانشے والے علیحدہ ہیں۔ اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جانا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میڈیا نوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفہ انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و عمل کی تفہیش اور ان میں نظم و تسلیل اور عللت و معلوم کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفہ اخلاق کے معلم تھہارے اخلاق و عادات کے اسباب و عمل تم کو بتاتے اور ناقابل نہیں جذبات کی تشریع کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تھہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا راہنماء ہو جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و عمل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یقوت ہو کر اپنی تعلیم و تلقین و فیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انتقال پیدا کر دے اور شر کے ختم کو دلوں کی سر زمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کر دے البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو اس کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یا دلالت ہے اور ان قوی کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، معملوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب و عمل کی تلاش و جستجو کی تشریع کی پر انہیں کرتا بلکہ اخلاق سینے خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حصے خواہ کسی علت کے معلوم ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہماں کے طسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی نعمانی میں دیتا ہے:

﴿يَا أُمَّرَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا مِنِ الْمُنْكَرِ وَبَيْحَانَ لَهُمُ الصَّيْبَةُ وَبَيْحَانُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثُ

وَيَضْعِهُمْ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهِمْ بِهِ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

”وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیے حلال اور

خوبیت چیزوں کو حرام ٹھہرا تا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جوان پر ہوتی ہیں ان سے اترتا ہے۔“

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ إِلَّا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرَّسُولِ ﴾

(٤ / النساء: ١٦٥)

”ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں، تاکہ رسولوں کو اس وعدہ مذکور کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے۔“ (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلا یا)

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا إِلَيْ الْبَيْتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْيَمِينَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

(٢٥ / الحدید: ٥٧)

”ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ عدل والاصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن و اطمینان کی زندگی برکریں۔“ نوع انسانی کے دوسرا نام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلانی اور برائی سے آگئے نہیں بڑھتا مگر انہیاً اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلانی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائی و پاسیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جنم کی خدمت، جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشائے مطابق بجالاتے ہیں وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔ وہ صرف اچھی اچھی اور میئھی میئھی باتیں لوگوں کو نہیں بناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں وہ خیال آراء شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبان میں ہوتی ہیں مگر با تھنہ نہیں ہوتے:

﴿وَالشَّعَرَاءُ يَتَّسِعُهُمُ الْغَاوُنَ ﴿الْمُتَّرَأُ أَكْهَمُ فِي كُلِّ وَادِ يَهْمُونَ﴾ وَأَكْهَمُ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴾

(٢٦ / الشعراء: ٢٤-٢٦)

”اور شاعروں کے پیر و کارگم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سرمارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔“

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے وہی ان کے قلب و روح کا سامان راحت بھی بھم پہنچاتا ہے ان کو اس لیے بھیجا ہے کہ

انسانوں کے قلب دروح کو اس سامان کا بر تاسکھا کیاں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو کس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

«هُوَ الَّذِي يَنْهَا عَلَى عَبْدَةِ أَيْتَ بَيْتَ لِيُغْرِي جَهَنَّمَ فِي الظُّلْمِ إِلَى التَّوْرُطِ وَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ

لَعْوَفٌ رَّجِيمٌ» (۵۷ / الحدید: ۹)

”وہی خدا جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آپتیں اتنا رہے کہ تم کو (اے انسان!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لیے کیا) کہ وہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔“

انبیا بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لیے مقفلن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیادی بادشاہ کے فرمان کی تقلیل کے لیے نہیں، بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تقلیل میں۔ وہ بھی فلاسفہ کی طرح روز و اسرار کا پرده فاش کرتے ہیں مگر تجوہ باستقر اور قیاس سے نہیں بلکہ عالم الاسرار کے مبدئے علم سے فیض پا کر۔ وہ بھی حکیم و داعظ کی طرح پرستا شیر کلام کرتے ہیں مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کرنہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اور وہی کو سناتے ہیں غرض اوپر آسان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو با نتھے ہیں:

﴿وَاللَّجْمُ إِذَا هُوَيْتُ مَاضِكَ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطَقُ عَنِ الْهُوَيْتِ إِنْ هُوَ إِلَّا ذُنْمٌ

يُؤْتَىٰ عَلَيْهِ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرْقَطٍ فَأَسْتَوْيَ وَهُوَ بِالْأَفْقَى الْأَعْلَىٰ فَأَوْتَحَىٰ إِلَى عَبْدَةٍ

مَا أَوْلَىٰ مَا كَذَبَ الْفَوَادُ مَارَأَىٰ أَفْتَرُونَةَ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ لَقَدْ

رَأَىٰ مِنْ أَيْتَ رَبِّهِ الْكَبِيرِ﴾ (۱۸-۱۷-۱۲-۱۰-۷ / النجم: ۱)

”وہ قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے، کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وہی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا، طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا در آن محالیکہ وہ آسان کے سب سے اوپر کناروں میں تھا۔ تو اس نے اپنے بندہ پروجی کی، جو وہی کی نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کبھی کی اور

نہ سرکش کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔“
 ۷۱ فُلْ إِنَّا أَتَيْنَاهُ مَا يُوحَى إِلَيْهِ مِنْ رَبِّيْنَ هَذَا بَصَارِبُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرُحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۸۰ (۲۰۳/ الاعراف)

”کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے
وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسان)! تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لیے
جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔“

۸۱ وَإِنَّهُ لَتَنَزَّلُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۗ نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُمُ الْأَمِينُ ۗ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذَرِينَ ۗ بِلِسْكَانٍ عَرَبِيًّا مُّبِينِ ۗ (۱۹۵/ الشعراء: ۱۹۲)

”یہ تو عالم کی پروشن کرنے والے کی طرف سے اتنا راگیا ہے، اس کو امانت والی روح نے
تیرے دل پر اتنا را، تاکہ فتح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔“

نکتہ: یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ، مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں کسی قوم
کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خود غرضی کے غیر مختصانہ
اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مختصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن
سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جریانی تعلیم و تواریخ تباہے، کوئی رسم و رواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تہدن
پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قوی اصلاح کا مرکز مخہبہ رکھتا ہے، لیکن
انہیا کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہاپنی بینا صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں
کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک حاصل کی فروع اور اسی ایک جزا کی
شانخیں جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی
ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خادمانہ
اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت و طاقت
ان کا مطیع نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی
خوشنودی ہوتی ہے باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہو یہا ہے کہ انہیا ﷺ اور ان کے مشاہد اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار
حیثیتوں سے نمایاں ہے مبدأ اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ نبی
کے علم کا مبدأ، منبع، مأخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم رہا ہی، شرح صدر اور وحی والہا ہم ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا

ماخذ و منبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ استقر اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور عمل و اسباب کے ستونوں پر کھڑی کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوٹ کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوٹ و خلوٹ اور ظاہرو باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیو جانہیں وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ﷺ اور محمد ﷺ وسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنا نے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

باڈشاہ اپنی تکوار کے زور اور اپنی فوج و شکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا باندہ بناتے ہیں، تاکہ فتوہ فساد رک جائے۔ فلاسفہ اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدلت دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں وہ اگر کبھی قانون و حدود سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمیم یا ثانوی کام ہوتا ہے اولین نہیں۔ ان کی اولین عرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا حکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکمتوں اور شخصتوں کو جوان کے ذریعہ آتی ہیں بے چون و چر اسلام کر لیں۔ دنیا کے باڈشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تکوار کی قوت سے دنیا کے تختے اللہ دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی چار دنگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جیا ایک کی تکواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجموعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبق بھی ائے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا کسکے؟ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں لاسکے؟ وہ آبادیوں اور مجموعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نق قائم کر سکے؟

حکما اور فلاسفہ جو اپنی عقل رسائی کے ذریعہ سے عجائب عالم کی طسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدئی ہیں کیا وہ تقب و روح کے عجائب کو دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفہیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دلیل

نکتہ شجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ اس طور نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکمانے اخلاق کے اسیاب و ملک کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تمم دور ہوا، اچھائی کے پیغ نے نشوونما پائی، ان کے اخلاق و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرة ان کی درگاہ ہوں کی چہار دیواریوں سے بھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کروں سے نکل کر جب انسانی صحبوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انجی بھی بلند نہیں ہوتی، حکماء یونان میں سفرات سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباٹ رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروع اور کامیابی کے لیے کوشش رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور تو حیدر خدا پرستی تو اس سے بد رجہا بلند ہے، جس کی ان کو ہوا بھی نہیں گلی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہو گا کہ ہر شیریں نو اوعظ، ہر موثرالبیان خطیب، ہر دیقیر مفتون، ہر کشور کشا فاقع اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

① سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالم غیب سے ہو، وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، علم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہمسفر و ہمنوا ہو۔
 ② اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔
 ③ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

④ فضائل و اخلاق کے پھلوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

⑤ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز "النست" کا بھولا ہوا عبد ان کو یاد دلائے۔

⑥ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور مگرا ہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

⑦ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

⑧ اس کی دعوت و جدوجہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آؤ رہی اور خلیق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔
مناہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظرڈالنے سے یہ حقیقت مکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک
نے، جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور
شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورہ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں
بیان کیے ہیں:

﴿وَإِلَكَ مُجْتَنَأً أَتَيْنَاهَا إِبْرَهِيمَ عَلَى قَوْمِهِ نَزَقْمُ دَرَجَتٍ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلَيْهِمْ
وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مُكْلَأً هَدَيْنَا وَتُؤْحَى هَدَيْنَا مِنْ قَبْلٍ وَمِنْ ذُرْيَتِهِ دَاؤَدَ
وَسُلَيْمَنَ وَأَيُوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهُرُونَ وَكَذَلِكَ تَحْزِي الْمُحْسِنِينَ وَرَكِيَّا وَسِيجَنِي
وَعِيسَى وَالْيَاسَ مُكْلَأً مِنَ الظَّالِمِينَ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسُعَ وَيُوسُفَ وَلَوْطًا وَكَلَّا فَضَلَّنَا
عَلَى الْعَلَمِينَ وَمِنْ أَبَاهُمْ وَدَرِشَتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَنَبَهُمْ وَهَدَيْنَهُمْ إِلَى صِرَاطِ
مُسْتَقِيمٍ ذَلِكَ هَدَى اللَّهُ يَهْدِي بِي مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْا شُرُكُ الْحَمَطَ عَنْهُمْ مَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ أُولَئِكَ الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالثِّبَوَةَ فَإِنَّ يَكْفُرُهُمَا هُوَلَاءُ فَقَدْ
وَكَلَّا بِهَا تَوْمًا لَيْسُوا بِهَا يَكْفِرُونَ أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فِيهِمْ أَفْتَدَهُ مَلِئَةٌ لَا
أَشْكَلُمْ عَلَيْهِ أَجْرَاطِ إِنْ هُوَ إِلَّا ذُكْرٌ لِلْعَلَمِينَ ﴾ (۶/ الانعام: ۸۰-۹۰)

”اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو
چاہتے ہیں کہ درجے بلند کرتے ہیں، بے شے تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے
ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب علیہم السلام بخشی اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو اس سے
پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور
ہارون علیہم السلام کو اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدله دیتے ہیں اور زکریا اور مسیحی اور عیسیٰ اور
الیاس علیہم السلام کو ہر ایک نیکو کاروں میں سے اور اسماعیل اور یسوع اور یونس اور لوط علیہم السلام کو ہر ایک
کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو چن
کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلا یا یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے،
اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا بر باد ہو جاتا یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و
باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان

باتوں پر ایسے دوسروں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اے محمد ﷺ تو بھی انہیں کی راہنمائی کی پیر وی کر اور کہہ میں اپنے کام کی قسم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دلاتا ہے۔“

ان آئتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر، ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں اگر ہم ان کو سمجھ کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں:

① فرمایا: ”ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی“ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

② ارشاد ہوا کہ ”ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکو کار رکھئے“ اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

③ یہ بھی کہا کہ ”ہم نے ان کو چن کر پسند کیا“ اور ”جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں“ جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سُنی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

④ فرمایا کہ ”ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی“ اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

⑤ حکم ہوا کہ ”ان کی راہنمائی کی پیر وی کر“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیر وی سے نیکو کار اور صالح بنتے ہیں۔

⑥ فرمایا کہ ”اے پیغمبر ایہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہل دنیا کے لیے نصیحت اور یاد دلانا ہے“ اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی نیزخواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطبع نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیاء کے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ علیہم السلام کے تعلق و نسبت سے ان حقیقوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ تصریح کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

① اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

② وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

③ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

④ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقوتوں پر آپ علیہم السلام کی نسبت یہ فرمایا گیا:

﴿يَتَّقُوا عَلَيْهِمْ أُولَئِيَّةُ وَيَزَّهُمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكَٰتِبُ وَالْحَكِيمُ﴾

(٢) الجمعة: ١٢٩-٦٢/البيقرة:

”وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔“

اس مختصری آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا سیکھا ذکر کیا ہے جاہلوں کو آیات الہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿سَقْرِينَكَ فَلَا تَسْتَأْنِي ﴾ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ أَلَّا يَعْلَمُ الْجَهْرُ وَمَا يُخْفِي ﴿ وَبِنِيَّرَكَ لِلْيُسْرَى ﴾ فَذَكْرُكَ انْتَهَى نَقْعَدُ الدِّكْرَى سَيِّدُكَرْمَنْ يَخْشَى وَيَنْجِيَهَا الْأَشْقَى ﴾

(٨٧/الاعلى-٢)

”هم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے، پکار اور چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا عظیز ہو گا وہ تجھے گا اور جو بد بخت ہو گا وہ اس سے رہبین کرے گا۔“

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو ”بیخبر کی روحاں تعلیم ہے“ اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لیے اس کھنڈن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو مکال درج تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے ”سمجھانے“ پر مامور کرنا اس روز کو اٹکار کرنا ہے کہ درسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرماتا کہ ”متنی اس لصحت سے فیض پائیں گے اور بد بخت محروم رہیں گے“ اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذہنی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح تحقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تاکہ وقت کی بہت سی ناطق فہمیوں کا سد باب ہو لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ”خصوصیت“ کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں پس مخصوص صفات

۱۰۔ پختہ کش اور طریقہ استدال امام رازی نے اپنی تفسیر "تفسیر کبیر" سورة الاعلیٰ، ج ۲، ص: ۵۲۸ اور بعض کتب کلامیہ میں اختیناً کیا ہے۔

اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں انہیں کوہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں پھل، پھول، چوپائے، پرنڈے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے عیینہ ہے گااب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوبی، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں یہ نامکن ہے کہ کوئی گااب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گااب کی بھی مختلف صنفیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گااب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علاویہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں دوہاتھ، دوپاؤں، سیدھاقد، بولنے کی طاقت، سمجھ و بوجھ اور غور و فکر کی الیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مال اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں میٹھا س، خنڈل میں کڑا پن، آگ میں گرمی اور برف میں مٹھنڈ، نوعی خواص کی حیثیت سے خود خود پیدا ہو گئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی ذکورہ بالا خصیتیں فطرتاً و دیعت ہیں لیکن اس وصف انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گااب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، جبشی، روی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود تفاوت، پچھہ میرہ، رنگ و رونگ، صورت و شکل اور اخلاق و عادات، وغیرہ، ہمیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرزا و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنف انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں ایک تخلیق پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ ادب و انشا کے خیالی بلند پرداز، عموماری ایضاًت جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جانے والے، ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جو ہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متفاہد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنف شعرا میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، لظم کی قوت، تخلیق کی بلندی، محاذات کی تدریت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، وقت نظر، خارجی عالم سے بے پرواہی، تصویر میں انہاک، خلوت گزینی، اخلاق کی خلکی، الغرض مرزا و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصناف انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے ہمیال و پولیں، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو دیانتہ اور

ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنانے سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفہ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایقہنے کے تحت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معز کے فتح کے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیز تا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہانا ہوا، غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور جسم کو چکنا چور کر ڈالا گرفروزی کی طرح تہائی بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معز کہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء^{صلی اللہ علیہ وسلم} کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی، چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علمائیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تہیید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں:

وہی استعداد و

ان میں سب سے پہلی چیز وہی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادوں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جو ہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہو گا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بوغرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا نہ تھا ہے، پودا بڑھتا ہے، کوپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں باقاعدہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کو شش سے بی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے بی بنا یا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں باقاعدہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ

”میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب دگل میں تھے۔“ * اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انہیاے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے سے ہیں وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود داس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسن سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہید اس لیے ہوتی ہیں، تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت میحیٰ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیم علیہم السلام کا بوت پانے سے پہلے ہی آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسماعیل علیہم السلام کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زرمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کمکنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاق علیہم السلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی 《یَعْلَمُ عَلَيْهِ》 (۱۵/ ۵۳) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جائشی اور شیل کی مسجد کی پاسبانی کے لیے انتخاب کس مقصد کا دادیباچہ ہے؟

حضرت یوسف علیہم السلام کا بچپن میں روایتیے صادقة اور صبر و شکر اور پاک و امنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہم السلام کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونیوں سے تن تھا مجہادانہ آوریزش، کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمان علیہم السلام کا آغاز عمر میں علم و فہم، فعل مقدمات کی قوت کس نتیجے کے آثار ہیں؟ حضرت میحیٰ علیہم السلام کی دعا یہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، زرم خوبی اور پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، تورات کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ علیہم السلام کے لیے دعائے خلیل، نوید مسیحاء، رویاء آمنہ اور احوال ولادت و تربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت نبوت سے پہلے ہی تہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خوشید جہان تاب کا مطلع انوار ہے۔

* جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء في فضل النبي ﷺ میں ۳۶۰۹ میں (آدم بین الرُّوح والجسد) کے الفاظ ہیں و مسند رک حاکم، ج ۲، ص: ۶۰۰ و مسند احمد، ج ۴، ص: ۱۲۷۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ حال ہے:

﴿فَبَشَّرَهُ بِقُلْمَ حَلَمِيٍّ فَكَتَبَ لِبَغَ مَعَهُ السُّنْنَ قَالَ يَعْلَمُ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أُذْكُرُ فَأَنْظُرْ مَا ذَرَتِي طَ قَالَ يَا بَتِ افْعُلْ مَا تُؤْمِرُ سَجَدَنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾

(۱۰۲، ۱۰۱: الصفت: ۳۷)

”تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، توجہ وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا، تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں، کہ مجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں، اس نے جواب دیا اے میرے باپ کرڈا! جو تمھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔“

حضرت موسی علیہ السلام کا یہ خطاب ہے:

﴿وَلَقَدْ مَنَّتَ عَلَيْنِكَ مَرَّةً أُخْرَى إِذَا وَحَيْنَا إِلَى أَوْلَكَ مَا يُوْحَىٰ﴾ (۲۰/ طہ: ۳۷، ۳۸) اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پروش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جوڑاں گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ ارشاد ہے:

﴿لَيَحْلِمُ خُذِ الْكِتَبَ بِقُوَّةٍ وَأَتِينَهُ الْحُكْمَ صَبِيَّاً وَهَنَانَا هُنَ لَدَنَا وَرَكُوَّةٌ وَكَانَ تَقِيَّاً وَبِرَّا بِوَالدِّيَهُ وَلَمْ يَكُنْ جَيَّارًا عَصِيَّا وَسَلَمَ عَلَيْهِ يَوْمَ مُولَدَ﴾ (۱۹/ مریم: ۱۲، ۱۵) اے بیجی کتاب (توراة) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مهر اور سحر انی۔ اور تم پر ہیز گارا اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا ز بردستی کرنے والا نافرمان، سلامتی ہواں پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿كَيْفَ تُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيَّاً قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَالثَّنَيَ الْكِتَبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا إِنَّ مَا كُنْتُ مِنْ صَابِرٍ﴾ (۱۹/ مریم: ۲۹، ۳۱)

”ہم کیسے اس سے بات کریں، جو ہنوز گھوارہ میں بچے ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الہی دی اور مجھے بنی ہبیر یا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔“

اور مکہ کا ”الامین“ نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

﴿فَقَدْ لَيْثَتْ فِي كُمْ عُمْرًا قِنْ قَبِيلَهُ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۶)

”تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔“

انبیا علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر، اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔
غیری علم

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاص اس کا غیری علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجود ان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں، بلکہ براہ راست صدائے غیر یا روایائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خداۓ پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۂ کامی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کسی قد تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے مأخذ

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطے سے حاصل ہوتا ہے
بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں:

① وجود ان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندر ورنی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یعنی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، یماری، صحّت، خوشی، خوف وغیرہ اندر ورنی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

② فطرت: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ الیسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوئی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ”جلبت“ کہتے ہیں حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتا ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چکنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھادیتا ہے؟

③ بد اہست اولیہ: انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض الیکی باتیں از خود یا بادنی تا مل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ را نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بھی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ، بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام ترمدار ہے اس کو بد اہست معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسراعقل۔ پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی

چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں موجود نہیں بلکہ عالم غائب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

④ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں: باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی سامعہ سمعتی، شامہ سوچتی، ذائقہ چھوٹی، اور لامسہ چھوٹی ہے، انہیں کا نام حواس نہ ہے، انسان کے پاس یہیں پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر کلرا تی ہیں اسی کا نام احساس ہے، ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پیچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھوکر بخختی و وزی دریافت کرتے اور سوٹکھ کر بومعلوم کرتے ہیں ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے بیماری میں قوت ذائقہ بدلتی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہر اہوا معلوم ہوتا ہے، تحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

⑤ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں ان کی بیان درحقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بدابت اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرائے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر دینا نتیجہ حاصل کرتے ہیں وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کو حکم لگاتے ہیں اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چند اس غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جز نیات کا استقرائ پورانہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو، طبیعت اور سائنس کے مسائل اکثر اس طرح معلوم کیے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر جھوٹی غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تجھیں سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر نظریات و بدھیات و محسوسات پر علاویہ نہیں ہو ما بعد الطبیعہ اور فلسفہ النہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بیانی و جدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کمی نہیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطاوں سے لبریز ہے مشاہدہ و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجود ادائی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق

ہو سکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق و جستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لیے یہ علوم شکوہ و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراثب

سطور بالا سے ہو یہا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ تینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا تینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے کیا اس کے تینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوک کے یا پیاس سے کوئی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے و جود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات و فطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سنبھالنا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو چھپتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔ محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان و قطعیت ہوتی ہے، دو اور دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دوڑا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو چکنے نہیں ہو سکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہو سکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو چچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے دوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جن کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی میشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں ایک طرف تو (کمی کی صفت میں) وہ حساست تک پہنچ جاتی ہے اور دوسری طرف (صحت کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبق تک اوپری ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسرنہیں ہوتا، ایک

جاہل جبھی سے لے کر اس طواور بولی میں تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، با ایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پر خطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔ عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات، آپ کے اندر و دیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان فطریات کا علم، خالق فطرت خود آپ کے اندر و دیعت رکھتا ہے، آپ کے چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اول یہ ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اول یہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترک کہ فیصلہ ہیں پانچوں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قوی کا عمل ہے چوڑے سے تامل سے معلوم ہو گا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج نہایت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندر ورنی جسمانی نہایت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے میں ہیں اور معمولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق ہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درج آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معمولات اور ذہنیات کا ہے وہ تمام تر مادہ اور نہایت سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی، دل و دماغ کے آئینے پر اور پرے آ کر پانچ عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہتر ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قوی سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحاںی قوی سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بتدریج ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کمال مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحاںی سے لے کر پھر روحاںی، کمال روحاںی اور خالص روحاںی کے ذریعے تک ترقی کرتے چلے گے ہیں۔ فراست کے لفظی معنی "تاڑ جانے" کے ہیں تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نہیاں نہیں ہوتی مگر جس میں نہیاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکے کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف

بعض علمتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علمتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علمتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھنا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فرست اشخاص برابر ہر شخص کے مشابہہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فرست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرام کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فرست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاز گئے۔ اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پیچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله))

”مؤمن کے تاثر لینے سے ڈر کر وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔“

② فرست کے بعد حدس کا درجہ ہے فرست کے ابتدائی مقدمات جو اس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذاتی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ذاتی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے مطہقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے یہ چیز بھی ایک کامل لعقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃ عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقولاً اور دانیاً روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

③ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پرده اٹھانے کے ہیں مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پر دہ کو چاک کر کے مادی چیزیں روحانی عالم میں مشابہہ کے سامنے آ جاتی ہے وہ بھی اصلی صورت میں اور بھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کو سمجھنے کے لیے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق اتنا ہے کہ خواب، عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو بھی بھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے قابل سے ایسا سام پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

④ الہام کے لفظی معنی ”دل میں ڈالنے“ کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو منت، تلاش، تحقیق، غور اور

ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علماء، شعراء اور موحدین کے ذہن میں پرداہ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

⑤ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی نشا کو بلوں کو جنمیش دیئے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کردیتا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی نشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غبیٰ ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں یہ علم و اطلاع کے روحاںی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجود انبیاء، حیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے ذریعہ یقینی ہیں اسی طرح روحاںی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انجیاں بِنَّهُمْ کے لیے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجود ان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحاںی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحاںی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحاںی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف پر قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحاںی ذریعہ علم کا نام مکالمۃ الہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

① وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجاناً اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رؤایا ہے۔

② خدا کا پرده کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

③ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتوں خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یعنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقہ وحی کی قسمیں نہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِيَفْرَأُ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِيْ حَجَابٍ أَوْ يُبَيِّسَ رَسُولًا فَيُوَحِّيَ﴾

﴿يَأَذِنْهُ مَا دَعَ بِهِ طَالِهُ عَلَىٰ حَكِيمٌ﴾ (۵۱/ الشوری: ۴۲)

”اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا، پر وہ کے پیچھے سے یا کسی قادر کو بھی تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند حکمت والا ہے۔“

مکالمہ الہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پر وہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا جمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالاطریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیری تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الہی کے متراود بھی مستعمل ہوا ہے:

﴿وَمَا يَتَطْقُنُ عَنِ الْهُوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُؤْنَثٌ﴾ (۴/ النجم: ۵۳)

”نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔“

الغرض اسی امتیاز کے لیے علمی اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں، تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو و سرے سے ممتاز ہو جائے بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں روایا ہے، پر وہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانی سے بات کرنا وحی ہے۔*

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص کو عام بندوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقے سے گفتگو فرمائے۔

بہرحال غیری ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں ”وحی“ کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیری ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین

* ان اصطلاحات کی بحث کے لیے اصول فقہی اہم تابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتنوفی کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفی: ۸۷۹ ج ۳، ص: ۴۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاقي مصر ۱۳۱۷ھ دیکھی چاہیے۔

ذریعہ علم کا دھن لاسا خاکہ ذہن میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے بھینے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سایکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتیوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریکو نلزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کافن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء ﷺ کو اپنے کشف، الہام اور روحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجود نیات، محوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندر ہونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجود نیات، فطریات اور بدیہیات و محوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجود نیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مخالف نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مخالف واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطاب اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجود نیات، فطریات، محوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطاء پاک ہوتے ہو۔

علم غیب

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس الملان کی ہدایت ہوئی ہے:

﴿فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّهِ﴾ (۱۰/ یونس: ۲۰)

”تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیے ہے۔“

﴿فَقُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبُ إِلَّا اللّهُ﴾ (۲۷/ النمل: ۶۵)

”کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔“

رسول کہتے ہیں:

﴿وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ (۶/ الانعام: ۵۰) ”اور میں غیب نہیں جانتا۔“

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ با ایس ہمسہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورہ جن میں ہے:

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدٌ إِلَّا مَنْ أَنْتَضَى مِنْ رَسُولٍ﴾ (۷۲/ الجن: ۲۶، ۲۷)

”تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر نماہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔“

دوسری جگہ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلَعَ إِلَّا عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَنْ يَشَاءُ مِنْ أَنفُسِهِ﴾

”اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے ہیں میں لیتا ہے۔“ (۳/۱۷۹ آل عمران)

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلینی اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سواب الذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمادیا گیا:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا مَا شَاءُ﴾ (۲۵۵ البقرة)

”اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔“

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، باسیں بہبہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورہ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً: قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، بلکہ کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوہ تبوک میں عدم شرکت کے، بعض عذرخواہ اصحاب کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی خدا نے فرمایا:

﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَا ذَنَتْ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الَّذِينَ ؎﴾

(التوبہ: ۴۳)

”خدا نے تجھ سے درگز رکیا کیوں تو نے ان کو اجازت دی، تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔“

﴿لَقَدِ ابْتَغُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلٍ وَّ قَاتَلُوكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْعَقْ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كُلُّهُوْنَ ؎﴾ (التوبہ: ۴۸)

”انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے، بیہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔“

آگے جل کر ہے:

﴿مَرْدُوا عَلَى التِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ وَطَمَحُنَّ تَعْلَمُهُمْ﴾ (٩/التوبہ: ۱۰۱)

”یہ نفاق پر اڑے ہیں تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔“

ان آئیوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آئیوں میں ”رسول“ ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضہ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علم غیب کے اس نادیدہ راستے میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام موقع پر غور کرنے سے اس کے اجمانی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس، اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس نے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشهادۃ کہا ہے (٢/انعام: ٣٧، ١٣، ١٢، ٥/الحشر: ٩، ٥/الرعد: ٩، ٢٢، ٦٢، ١٨) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے:

① ”زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کون نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے، کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لیے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیری ہی ذریعے سے ہو سکتا ہے۔“

حضرت نوح عليه السلام کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ تُوحِيْهَا إِلَيْكَ مَا لَكُنْتَ تَعْلَمَهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا مَا﴾

(٤٩: ١١) / ہود

”یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے ہم ان کو دیکھتے ہیں تیری طرف، تو تو ان کو پہلے سے

جانبنا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔“

حضرت مریم علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذلکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ تُوجِيهُ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهُمْ إِذْ يُلْقَوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَتَهُمْ يَلْفَلُونَ﴾

﴿مَرِيمٌ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهُمْ إِذْ يُخْتَصِّمُونَ﴾ (۴۴: آل عمران)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑا ہے تھے۔“

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت ﷺ نے فی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿ذلکَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ تُوجِيهُ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهُمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ﴾

(۱۰۲: یوسف)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔“

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا بہر حال ان تیوں آجتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

② اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو شانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

﴿فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَإِنْتُظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظَرِينَ﴾ (۶: ۱۰ / یونس)

”تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیے ہے، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔“

مستقبل کے نظرے واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةٍ﴾ (۳۱/ لقمان: ۳۴)

”خداہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔“

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَتَيْنَاهُ مُوْسِيًّا فَلْ إِنَّا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّنَا﴾

(۷/ الاعراف: ۱۸۷)

”وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔“

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نہیں کی گئی ہے:

﴿وَمَا تَنْدِيرُنِي نَفْسٌ مَا ذَلِكَ سُبْحَانَ رَبِّنَا وَمَا تَنْدِيرُنِي نَفْسٌ يَا تَيْمَرِي أَرْضِنِي نَمُوتُ﴾

(۳۱/ لقمان: ۳۴)

”کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سر زمین میں مرے گا۔“

③ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جوگو مضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیے کسی نہ کسی مسافت، عدم جاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگادی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر بیٹھی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لیے زمانہ حال کے علم کے لیے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہو گا وہ غیب ہو گا۔ حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پر پر جیبات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضَ﴾ (۳۱/ لقمان: ۳۴)

”اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔“

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود درستی سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لیے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

﴿وَلَلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۱/ هود: ۱۲۳)

”اور خداہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۸/ الحجرات: ۴۹)

”بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔“

④ عالم غیب کی آخری چیزوں امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے شک دائرہ

علم سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو بیہاں نظر نہیں آ سکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

﴿الَّذِينَ يَخْشُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (۴۹/الانسیاء)

”جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔“

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (۲/البقرة: ۳)

”وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔“

﴿إِنَّمَا يَعْلَمُ اللَّهُ الْعَزِيزُ وَالْعَلِيمُ﴾ (۶۱/مریم)

”وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔“

”غیب میں“ کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کیے بغیر اور با وجوہ اس کے کوہہ چیزیں اس عالم میں دیکھنی نہیں جاسکتی ہیں۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آ گاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وہی کے واسطے سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشیں گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیح میں بصرت حذکر ہیں، اسی طرح حال کے ان مناظر و احوال کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تفکل کے طبع شرعاً نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا اکٹھاف، پس پردہ رؤیت، دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغییبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رؤیت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لیے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وہی کے مختلف اقسام کے ذریعے سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وہی اور ملکہ نبوت

حکماء اسلام نے وہی کی حقیقت ”ملکہ نبوت“ کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تفکل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر بنا تاتیں ہیں جن میں صرف مدد و احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قوی

حافظ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالآخر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظ، تصور، تعلق وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں، جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیاء میں علم و تعلق کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکہ نبوت ہے۔

حوالہ صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکہ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی عینیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجود انبیاء، فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ تلقین بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجود انسان، فطرت نوعی، بدراہت اولیہ، احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ خود عالم الغیوب و علم ان انسانی وسائل کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے شرع کی زبان میں اسی کو وحی و الہام کہتے ہیں علم کلام کی اصطلاح میں ملکہ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو نیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبر و کو وقا فوتفا احکام اور ارادوں سے برآ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے تبی وحی ہے۔

امم ان نظر سے معلوم ہو گا کہ اہل عقل و نقل کے اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافق اور غیر معمولی وہی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود برآ راست وقا فوتفا تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرت ناولدیت کردی جاتی ہے اسی طرح انبیاء میں منشاء الہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ولایت کردی جاتی ہے یا یہ کہ فطرت ناولیے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشاء الہی سے ان کو کسی غبی ذریعہ سے وقا فوتفا آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

عیار ماما ایس دارد و آن نیز هم

انبیاء میں اللہ تعالیٰ کے فعل و کرم سے بدء فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا

ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محدود ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عمل اسرافراز ہوتے ہیں اسی کا نام ”ملکہ نبوت“ ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو قاتفو قاتا جو غیر اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام ”وجی“ ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہیں دوقوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ بھتی ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ برآہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدی یہ بھتی ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی برآہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسو رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبر انہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ما دراہبے جیسے قرآنی وحی برآہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہی قوت علم و فہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشا ”ملکہ نبوت“ کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لیے پیغمبر کی وحی اور ملکہ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشایہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ و تقدیف تھا پسند خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الہی، صحیفہ ربانی، تورات، انجلیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرہ علم جو پیغمبر کے ملکہ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسرا مخفی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسری فروٹی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازالی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرा علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مخصوصیتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے۔ کتاب برآہ راست وحی الہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکہ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلطفہ وحی ہے اور سنت بالمعنى۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی

جاتی اس تشریع کا مقصود حقيقة تلاوت عدم تلاوت کافر نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور لفظ لفظ «وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ» کی پیشیں گوئی میں داخل ہے اور اس لیے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ مجال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لیے کتاب کی وحی مدون، مکتب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قراءت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظ ہما مقصود نہیں اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نماز میں اس کے الفاظ قراءت کیے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الہی کہا جاسکتا ہے مگر معنا اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیر و ول اور پھر ان کے پیر و ول کے مسلسل قابل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اور اراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصول وحی حقيقة یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں بنابریں چونکہ سنت، وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعمیں خدا کی طرف سے نہیں اس لیے وہ غیر متلہ ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیے نہ صرف اس کے ایک ایک لفاظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک لفظ، شوہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ذیش اور کام کی بعینہ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لیے صحابہ کے دریافت پر، یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرمایا اس کو کھول کر بیان فرمادیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریع طے ہی یا انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزوی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستبہ ہوا کہ اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہ انہیں الفاظ کو بے کم و بیش

دھراویتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہیں الفاظ کے نسبت سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لیے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔ درحقیقت احادیث میں قانون الہی اور کتاب ربنا ہی کے مفہوم و مفہما کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشاء الہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لیے اصل مفہوم و مفہما کے لحاظ سے احادیث کے معانی خصوصی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاوی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکہ نبوت کے غیر خطاب پرینتائج ہیں اسی لیے ان کو اصطلاح میں ”وَيَعْلَمُ مَلَكُوْ“ کہتے ہیں۔ ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضا مندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے ॥ یہ وَيَعْلَمُ الْحَقِيقَى مَفْتَحَى
ہے آنحضرت ﷺ نے اس منشاء الہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا: ”ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔“ ॥ کبھی ارشاد ہوا: ”رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔“ ॥ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا: ”تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں۔“ ॥ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرماتھے صحابہ شَرْفَهُ اللّٰهِ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ”وَهُذِيلٌ هُوَا، وَهُذِيلٌ هُوَا، وَهُذِيلٌ هُوَا۔“ حاضرین نے عرض کی، یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا: ”وَهُجَسٌ نَّأَنِي مَا يَا بَأْبَأْ كَضِيقٌ نَّأَنِي أَوْ بَهْرَانٌ كَضِيقٌ نَّأَنِي كَرَكَ كَرَكَ كَرَكَ كَرَكَ!“ ॥ ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یعنی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا: ”وقت پر نماز ادا کرنا۔“ دریافت کیا اس کے بعد، فرمایا: ”ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔“ ॥ ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدشیں ذیل کی آئیوں کی تشریح و بیان ہیں:

﴿وَيَأْلُو الِّدَّيْنِ إِحْسَانًا﴾ (۲/ البقرة: ۸۳۔ ۴/ النساء: ۳۶)

”ماں باپ کے ساتھ ہی کرو۔“

﴿فَلَا تَقْنُلْ لَهُمَا أَقِ﴾ (۱۷/ بنی اسراء: ۲۳)

”وَهُبُرْ هُنَّ هُوَ جَائِيْ مَنْ تَوَأْنَ كَوْافِنَ كَبُوْرَ“

❶ ۴۶/الاحقاف: ۱۶۔ ❷ سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدة: ۳۱۰۶۔

❸ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل في رضا الوالدين: ۱۸۹۹۔

❹ مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدين: ۶۵۰۰۔ ❺ مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم انف من ادرک ابوبیه الخ: ۶۵۱۰، ۶۵۱۱۔ ❻ بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلة: ۵۹۷۰۔

﴿وَتَتَجَادُلُونَ عَنْ سِيَّئَاتِهِمْ﴾ (۴۶/الاحقاف: ۱۶)

”یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیلوں سے ہم درگز رکرتے ہیں۔“

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے۔ ❶

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عینیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ بولا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیح کے تمام فرعی اور غایبی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کل احکام کے تحت میں مندرج ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریع فرمائی ہے اس قسم کی حدیشوں کی عموماً تین شکلیں ہیں ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی اس قسم کی حدیشوں کے بیان ہونے میں کس کوشہ ہو سکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دولفاظ ایسے فرمادیے ہیں جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریع ہے اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تیز اہل علم کے لیے آسان ہے۔ تیسرا شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمادیا ہے اس قسم کی حدیشوں کے ماذکی تلاش وقت نظر کا کام ہے ان کا پتہ زبان بہوت اور فہم رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راخین فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام و اجتہاد و حکمت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریع ہیں۔ تیسرا وہ جن کا ذکر (ظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیل ہے نہ اجمالاً، میں تیسرا قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق اسہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں:

❶ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الہی کو دریافت کر لے)

❷ مجھے پہلے یہی شریحتا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر محمد اللہ کہ تلاش تفصیل سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ، ص: ۲۸۔ ۲۹۔ ۶۲۔ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شافعی انوکی المتفق و المتفکر کی اہم تصنیف المواقفات فی اصول الاحکام، ج ۱، ص: ۱۷۵، ۲۲۱، مطبعة سلفية مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی جمیۃ اللہ البالغین میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

❸ کتاب الرسالہ امام شافعی، ص: ۳۸۔

- ② رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بیش کو ایسا نظر نہ آئے)
- ③ تمام احادیث نبوی القافی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔
- ④ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب اللہ سے جدا گانہ، مستقل پیغام ربیٰ کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین آراء میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقایتوں قبائی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتداء ہی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضاۓ اللہ کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیرنے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القافی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستبطن کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوت فہم کا نتیجہ ہو گا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوت فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القافی سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کو یا توفیق اللہ کو ہبات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربیٰ احکام بھی عموماً اس کے صحیفہ ربیٰ سے ماخوذ و مستبطن ہیں اور ان کے جزئیات کتاب اللہ کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما، ملکہ نبوت اور اہل شرع، حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطاب اور غلطی سے بکر پاک ہے۔

اجتہاد نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہا کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمت ربیٰ کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہا کے طریقہ پر اجتہاد نبوی کو نصوص قرآنی سے مستبطن سمجھتے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علم سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب اعمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ

مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ ان بیان گناہوں سے معموم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوا نے نفسانی سے برا ہوتے ہیں اس لیے امور سالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجہ سے ان کا اجتہاد اگر بھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جو مصلحت الہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرمائے ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرمادیتا ہے (اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر کہ اس سے بہتر پہلو سے تناقض ہونے، یا غائب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے بھی کا اجتہادی خطأ کرنا ممکن ہے مگر اس خطأ پر نبی کا قائم رکھا جانا ممکن ہے ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الہی کے مشاکے مطابق اور خطأ غلطی سے براہمود اس کے دوسرا معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔^{۱۰}

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معناً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملک، نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملًا الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ناؤں کی قرار پا جاتی ہے۔

اس بحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے جمیۃ اللہ البالغین میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجیح ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

^{۱۰} طور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے حوالہ کے لیے دیکھو شرح تحریر ابن همام المتوفی ۷۸۵ھ مسمی به التقریر والتحبیر للعلامة ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۲، ص: ۲۹۴، ۲۹۹ مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التتفییح و التوضیح فی حل غوامض التتفییح، ج ۲، ص: ۴۵۲ مطبع مکتبہ صنائع قسطنطینیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنة۔

ساتوال مبحث: احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی ﷺ کے اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو تسمیں ہیں:

ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت: ①

«وَمَا أَشْكُمُ الرَّسُولُ خَدْرُوهُ وَمَا نَهَكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا» (الحسن: ۵۹)

”پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے بازاً وَ“

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاویتی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا تو انیں شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا وہ مقاصد، جن کا ماغذہ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعے جو آپ کو سمجھایا گیا تھا ان کی تشریح فرمادیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً: اخلاق صالح اور اخلاق غیر صالح کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے جس کے مقنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائل اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان تو انیں کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

② دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تھا رے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کر میں صرف ایک آدمی ہوں۔“ اور چھوپا دوں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ”میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔“ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ ”تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔“ اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادت کیا، عبادات نہیں، اتفاقاً کیا قصد انہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً: ام زرع اور خراف کے قصہ وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابت ؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ ”میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پروجی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا سمجھتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟“

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزوی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً: فوجوں کی آرائیکی اور جنگی علامت کی تعینی کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمر ؓ کے اس قول کے کہ ”اب ہم کو ج میں اکثر کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا“ بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزوی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پوراطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہواں لئے اس میں دست اندازی نہیں کی اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً: آپ کا یہ ارشاد کہ ”جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے۔“ نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ”واعظ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا۔“ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ *

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے یہ تمام باتیں بر اہ راست وحی و تعلیم الہی سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں:

- ① کسی جزوی عارضی مصلحت کی ناپر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اگڑ کر سی کریں، تاکہ قریش یہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوانے ان کو کمزور کر دیا ہے۔
- ② وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کاظمی، تھیار کے اقسام، حکومتے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔
- ③ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع ولباس، فرش پرنشست، کبل اوڑھنا، بسترخوان، چچوں کا عدم استعمال، عمائدہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔
- ④ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً: ام زرع اور اس کی نوسمیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔
- ⑤ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور عادات و معاملوں کی بعض باتیں۔
- ⑥ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائے، مثلاً: مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر زچھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسی بات سمجھ کر فرمایا کہ ”اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو؟“ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی لوگوں نے آ کر عرض کی، فرمایا: ”میں نے ایسا خیال کیا تھا، ((انتم اعلم با مور دنیا کم)) * کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔“ یہ امور تغیر اور روبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔
- الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً: عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد و معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربی سے ہیں جو دنیگی اور ناقابل تغیر ہیں۔
- ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں ایک براہ راست وحی الہی جو وقت فتوثا پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی۔ یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:
- ① یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص

* مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امثال مقالہ شرعاً: ۶۱۲۶ تا ۶۱۲۷؛ ابن ماجہ، ابواب الرهون، باب تلخیق التخل: ۲۴۷۰، ۲۴۷۱؛ مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص: ۱۵۲۔

نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمانی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ عطا فرمادیا ہے اسی علم کے مطابق آپ وحی کی تو پڑھ، احکام مخصوصہ کی تفصیل، کسی کل، ”کے جزئیات مسائل کی تشریع اپنے الفاظ میں فرمادیا کرتے تھے۔

② پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطاء غلطی سے یکسر پاک و منزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطاء غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اس لئے ”ان کا پیغمبرانہ اجتہاد“ بھی بخوبی وحی کے ہے۔

”پیغمبرانہ اجتہاد“ کی جزو ترشیح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکہ نبوت، الہام، القا، حکمتِ ربیٰ، فہم نبوی سے جو کچھ مراد یلتے ہیں اس میں اور ”اجتہاد نبوی“ میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں دیعت رکھتا ہے اسی لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں مزید بحث آگئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دیا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انہیا آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و اتیاز باقی نہیں رہا چنانچہ تواریخ و انجیل و ذریور میں یہ سب باتیں ملی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسون کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر خلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی ﷺ کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اکثر وہوں کے زدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض تقدیر صحابہ اور علماء کے زدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ نے، تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بے گناہی

نبی ﷺ کی تیسری اہم خصوصیت اس کی مخصوصی اور بے گناہی ہے یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخلی نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انہیاً کرام ﷺ کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر مبنی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسح غایبیاً کی ذات مخصوص مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے زدیک تمام انہیا اور رسول گناہوں سے پاک اور مخصوص تھے ان سے تقاضائے بشرط بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان

غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نہایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اعتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کافر جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پرستاشیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے یکجہہ کرتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِيعِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَنَةُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّنَهُ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ يَهُ مُشْرِكُونَ ۝﴾ (۱۶ / النحل: ۹۹، ۱۰۰)

”شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر، جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک تھہراتے ہیں۔“

اس کے بعد آخوندگی اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمه اس پر ہے:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبَرْتَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْمُومْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقُوا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ۝﴾ (۱۶ / النحل: ۱۲۷، ۱۲۸)

”اور صبر کرو اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر نیکیں ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو، بے شک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پر ہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔“

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیاء کے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، مقتنی، پر ہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ سورہ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخوندگی میں یہ کہہ کر دیا ہے:

﴿هُلْ أَنْتَمُ كُلُّ مَنْ تَنَزَّلَ السَّيْطَرِيُّنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّالْ أَثْيُو ۝ يُلْقَوْنَ السَّمَاءَ وَأَكْرَهُمْ كُلِّيُّونَ ۝﴾ (۲۶ / الشعراء: ۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، ان پر اترتے ہیں، جو جھوٹ گھرتے ہیں، گناہ کار ہوتے ہیں (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہہ دیا گی کہ وہ غیب کی باقیں سن رہے ہیں) کان میں ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

سورہ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا:

﴿وَيُلِّخُنْ أَقَابِلَ آئِيْمَوْ يَسْمَعُ اِيْتَ اللَّهُ شَشِلَ عَيَّنَهُ تَمَّ بِعَرْ مُسْتَكِلَّا اَكَانْ لَمْ يَسْمَعَهَا فَبَشِّرْ بِعَدَابِ الْيَوْمِ﴾ (۴۵ / الجاثیة: ۸، ۷)

”پھٹکار ہواں پر جو جھوٹ گھرنے والا گناہ گار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑاہی رہتا ہے گویا کہ اس نے سانہیں، تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دے۔“

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہیاں علیہم جھوٹ گھرنے والے اور گناہ گار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین ورثیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گناہ گاری کے صریح منافی ہے۔
ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

﴿مَا كَانَ لِشَرِّيْأَنَ يَقُولِيْهُ اللَّهُ الْكِتَبَ وَالْحَلْمَ وَالثُّبُوْتَ لَمْ يَقُولَ لِلْكَائِسَ كُوْنُوا عَبَادًا لِّيْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۳ / آل عمران: ۷۹)

”اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے، یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔“

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا مشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزنشیں ہوتا۔
اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِيَنِيْتِ أَنْ يَغْلِيْطَ وَمَنْ يَغْلِيْطُ يَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ لَمَّا تُوقَى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسِّبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (۳ / آل عمران: ۱۶۴)
﴿أَفَمَنِ الْبَعْرَضَوَانَ اللَّهُ كَمَنْ بَاءَ سَعْغَطِيْقَنَ اللَّهُ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمَ وَكَبَشَ الْمَصِيرِيْرُ هُمْ دَرَجَتْ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۳ / آل عمران: ۱۶۵)
﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِنْ أَنفُسِهِمْ يَتَّلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتِهِ وَيَرِيْهِمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَقْنُ ضَلَّلَ مُقْبِيْنَ﴾ (۳ / آل عمران: ۱۶۶)

”کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں، کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا ابدل ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیرودی کرے، وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے، جو خدا کا غصب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بر اٹھ کانا ہے، انسانوں کے خدا کے زندگی کی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبه اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک ایسے

رسول کو بھیجا جوان کو اس کی آسمیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ بے شک اس سے پہلے کھلی گرا ہی میں تھے۔“

ان آئیوں میں گوہ نبی سے غلوں (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی بہیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی فنگی کرتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، سیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتبہ نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گناہ ہگارو ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انیا عَلَیْہِمْ کے لئے بار بار قرآن نے ”جِنْ كَرْبَلَةَ كُرْبَلَةَ“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿أَلَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمُلْكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ (۷۵: الحج: ۲۲)

”خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو جن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں سے۔“

☆ چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ أَصْطَفَى أَدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عُمَرَ عَلَى الْعَلَمِينَ﴾

(۳۳: آل عمران: ۳)

”اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔“

☆ خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَيْتَكُمْ فِي الدُّنْيَا﴾ (۲: البقرہ: ۱۳۰)

”ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔“

☆ حضرت مویؑ کی نسبت فرمایا:

﴿إِنِّي أَصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسْلَتِي وَبِكَلَمِي﴾ (۱۴۴: الاعراف: ۷)

”میں نے تجوہ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔“

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

﴿وَإِذْنُرَعِيدَنَا إِبْرَاهِيمَ وَاسْلَحَقَ وَيَعْقُوبَ أُولَى الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ

بِخَالِصَةٍ ذُكْرَى الدَّارِيَةِ وَلَهُمْ عِنْدَنَا الَّذِينَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخِيَّرُهُمْ﴾

(۲۸: حسن: ۴۵)

”ہمارے خاص بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے، ان کو آخوت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں پہنچے ہوئے تینوں کاروں میں تھے۔“

سورہ انعام میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿وَكُلَّا جَعْلَنَا صَلِيْعِينَ وَجَعَلْنَاهُمْ أَيْمَةً يَهْدُونَ يَأْمُرُنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فَعْلَ الْغَيْرِيْتِ

وَإِقَامَ الصَّلَاةَ وَإِيتَاءَ الزَّكُوْنَةِ وَكَانُوا نَاسًا عَيْدِيْنَ ﴾۶﴾ (الانعام: ۷۲، ۷۳)

”ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنا�ا اور ہم نے ان کو وہ پیشوں بنا�ا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو یہ کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وجہ کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔“

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوں اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورہ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گناہ کرس ب کو صالح فرمایا گیا:

﴿كُلُّ مِنَ الظَّلِيْعِيْنَ ﴾۶﴾ (الانعام: ۸۵) ”یہ سب صالحوں میں تھے۔“

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿وَكُلَّا فَضَلَّنَا عَلَى الْعَلَمِيْنَ ﴾۶﴾ (الانعام: ۸۶)

”ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔“

پھر ان کا ذکر کر کر کے فرمایا:

﴿وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيْمِ ﴾۶﴾ (الانعام: ۸۷)

”اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔“

صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گناہ گار و نیکو کار و دنوں کی سیر توں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس واشتبہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں جیچ جیچ کراس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿أَمْ حَيْسَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا الشَّيْئَاتِ أَنْ يَجْعَلُهُمْ كَلَّذِيْنَ أَمْنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِيْحَاتِ

سَوَآءُ كُحْيَا هُمْ وَمَهَا هُمْ طَسَّأَ مَا يَحْكُمُونَ ﴾۶﴾ (الجاثیة: ۴۵)

”کیا وہ جو گناہوں کے مرکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی طرح جو ایمان لائے

اور اچھے کام کیے بنا کیں گے، ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔
انبیاء ﷺ کے صفات میں فرمایا:

﴿إِلَّذِينَ يُكَلِّفُونَ رِسْلَتَ اللَّهِ وَيَخْمُسُونَ وَلَا يَعْشُونَ أَحَدًا إِلَّا لَهُ طَهَرَةٌ﴾

(۳۹: الاحزاب)

”جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔“

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور یوں یوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے، وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواد مطہرات ﷺ کی شان میں ہے:

﴿إِنَّسَاءَ الَّتِي لَسْتَ قَمَّا حَدَّقَنَ إِنَّسَاءَ إِنَّ الْمُقْيَثَنَ﴾ (۳۲: الاحزاب)

”اے بغیر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کوئی ایک نہیں ہو، اگر تم مقی ہو۔“

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادہ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف سترہ بنائے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهَبَ عَنْكُمُ الْبَرُّجُسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

(۳۳: الاحزاب)

”اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے، اے بنی کے گھروں! اور تم کو بالکل صاف سترہ بنا دے۔“

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء ﷺ کے ازواد و اولاد کی شرافت کے لیے گناہ اور بدی کی نجاست مغل ہے تو خود انبیاء ﷺ کا کیا ذکر ہے۔ ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿أَحَبِبْتُ لِلْخَيْثَيْنَ وَالْخَيْثَيْنَ لِلْخَيْثَيْتِ وَالظَّيْبَتُ لِلظَّيْبَيْنَ وَالظَّيْبَيْنَ لِلظَّيْبَتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ط﴾ (۲۶: النور)

”گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے، گندیوں کے لئے اور ستریاں، ستروں کے واسطے، اور سترے، ستریوں کے واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔“

یہاں طیب، پاک اور سترے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی سترے

پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اغلاقی سترے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔
انبیاء در حقیقت مقتدى اور پیشوں اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:
﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۱/الاحزاب)

”تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔“

نیزان کی اطاعت واجب ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا يُطَاعُ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۴/ النساء: ۶۴)

”ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ہمہ رات ہے:

﴿إِنْ كُنْتُمْ تُحْمِلُونَ اللَّهَ فَإِنَّمَا عُنْتُمْ يُحِبُّكُمُ اللَّهُ﴾ (۳۱/آل عمران: ۳)

”اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدام کو چاہے گا۔“

کیا کسی گناہ کار اور عصیاں کا رکی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گناہ کاروں کی دعوت سے کبھی نیکو کاری پھیلی ہے؟ برائی اور گناہ کاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں:

﴿إِنَّ عَبَادَيْنِ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَلَكُمْ بِرِسْلَكَ وَكِيلًا﴾ (۶۵/ بنی اسرائیل: ۱۷)

”یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔“

کیا انبیائے کرام ﷺ سے بڑھ کر کوئی بندہ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عصیاں کا رکی، وoso سے شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنے سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔ آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھیلانا چاہا مگر خدا نے پھیلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دشیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الہی اور حکمت و دانائی جو تنہی عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ لَهُمْتَ طَالِفَةٌ قِيمُهُمْ أَنْ يُضْلُوكَ وَمَا يُضْلُونَ إِلَّا

أَنْفَسُهُمْ وَمَا يَضْرُونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَلَأَنَّ اللَّهَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْعِلْمُ هُوَ عِلْمُكَ مَا لَمْ تَعْلَمْ

لَعْلُمْ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۱۳)

”اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔“

اور یقیناً موقع محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مرادِ عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمثاویں اور خود غرضانہ رزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انہیاں عَلَيْهِمُ الْكُفَّارُ اس فریب تمثا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے برسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمثا نہیں اور آرزوؤں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحتِ الہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمثاویں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجار کھاتا ہے، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَتَّقَى الْكَوَافِرُ لِقَاءَ الشَّيْطَنِ فِي أَمْنِيَّتِهِ فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَنُ تُمَّحِّكُهُمُ اللَّهُ أَعْلَمُ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَكِيمٌ﴾

(۵۲/الحج: ۲۲)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے، تو خدا شیطا نوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدادا ان اور حکمت والا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ انہیاں کے کرام عَلَيْهِمُ الْكُفَّارُ غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی حفظ و حفاظ کے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿مَا أَضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَّى﴾ (۵۳/النجم)

”(اے مسلمانو! تھہرا، صاحبِ نگراہ ہوانہ بھٹکا۔“

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عہد سابق اور زمانہِ ماضی سے ضلالت اور غواہیت کی پوری نئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کائنتوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہرین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داعی ہیں مگر علمائے تحقیقین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا ثقیل بخش جواب دے

دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم انڈی ہنستہ نے انفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی ہنستہ نے شفاء (قلم ثالث، باب اول) میں، خواجی ہنستہ نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی ہنستہ نے تحفۃ الاخلاق فی عصمة الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر ہنستہ کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے تھصر اصولی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریع کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

① سب سے پہلی بات یہ ہے نئشن کر لینی چاہیے کہ انہیا علیہ السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ و عصیاں کے گرد غبار سے لکھا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والا کرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، لکھا ہی و فاشعار اور مطیع و فرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معرف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتا ہیوں پر جعل اور اپنی فروگز اشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِي أَطْمَعَ أَن يُغَيِّرَ إِلَى حَطَبِيَّتِي يَوْمَ الدِّينِ ۖ﴾ (۲۶ / الشعراء: ۸۲)

”اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔“

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت اس کا نقش نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچتے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور و فاشعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ رہے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اوپری ہوتی جائے بعض آسموں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا و جو نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوتا ہے:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۚ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَذْلُّونَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ أَكْوَاجًا ۗ فَسَيَّخَ مُحَمَّدٌ رَّبِيعَ كَوْسَفَرْدَةَ إِلَّا كَانَ تَوَابًا ۚ﴾ (۱۱۰ / النصر: ۱-۳)

”جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ کر تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کروہ بندے کے حال پر رجوع کرنے والے ہے۔“

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بخش کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورہ فتح میں فرمایا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيُغَيْرَ لِكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَلِيلٍ وَمَا تَأْخُرَ وَيُنَزِّلُ نِعْمَةً عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا وَيَنْهَاكَ اللَّهُ نَصَارَاعَزِيزًا﴾

(الفتح: ۱-۳) / ۴۸

”ہم نے تمھر کو کھلی فتح دی، تاکہ اللہ تیری الگی بچھپی خط کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلانے اور تجھ کو مضبوط مددے۔“

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجا اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرمائی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود فتوذ بالله بغیر کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی پیشیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿لَنْ يَسْتَكِفَ الْمُسِيءُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا لِلْمِلِكَةِ الْمُقْرَبُونَ طَوْمَنْ يَسْتَكِفُ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكِفُ فَسِيْعَثُرُهُمُ الْيَوْمَ حَيْيَعًا﴾ (النساء: ۱۷۲) / ۴

”مح علیہ السلام کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا، کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔“

اس سے مقصود فتوذ بالله حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔ الغرض انیسا علیہ السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراض، ان کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی بغیر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گناہگاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تمام کی بشارت ہے۔ سورہ فتح کی جو آیتیں اور پر گزیریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہو گا کہ چونکہ بت پرستی کی آلات سے مکی تطہیر اور کل جزیرہ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کرنے فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ بغیر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جان فروشوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد و وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ

تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضا مندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگراشتون پر (اگر ہوں) خط غوپھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعت فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت کرے۔ عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار ان کو ”اے نیک استاذ!“ کہہ کر خطاب کرتا ہے اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

”تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں؟ مگر ایک یعنی خدا۔“ (لوقا ۱۸، ۱۹)

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

”اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشنے ہیں تو اپنادین ہم کو بخش دے۔“ (متی ۱۲، ۶)

ان کی گناہ گاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیت کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً: ذنب، اثم، حنت، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے، یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو، یاقصد اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی موادخہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوال کو مشکل بھی ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ”ذنب“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا ہٹ کا نہیں، ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کوشال ہے ॥ اس لئے کسی بھی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیاں و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگراشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گوامت کے حق میں

۱۔ اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملاحظہ نہیں رکھا ہے، مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر تباہیں لکھی ہیں، انہوں نے اس کی تعریج کی ہے، ہم یہاں پر بیرون کے مشهور عیسائی لغت نویسی و ادبی الاب ہمریکوں لامنز کی کتاب فرانسا لللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم الذنب الذي يستحق العقوبة عليه ولا يصح ان يوصف به المجرم، وبين الاثم والذنب فرق من حيث ان الذنب متعلق الجرم عمداً كان او سهراً بخلاف الاثم فانه ما يستحق فاعله العقاب، فيختص بما يكون عمداً، والحدث ابلغ من الذنب، لأن الذنب يطلق على الصغيرة، والحدث على الكبيرة والجرم لا يطلق الا على الذنب الغليظ، (ص: ۹۶، ۹۷) مطبوعہ کائو لیکہ، ۱۸۸۹ء۔

قابل مواغذہ نہیں، مگر انہیاً عَلَيْهِمْ کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ پیزی معاف کر کے ان کو بشارت سنادی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور ندانستہ تمام گنانا ہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے:

﴿فَتَلَقَّى أَدْمُرٌ مِنْ رَّبِّهِ كَلِمَتَ فِتْنَابَ عَلَيْهِ ط﴾ (۲/ البقرة: ۳۷)

”تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿ثُمَّأَجْتَبَهُ رَبُّهُ فِتْنَابَ عَلَيْهِ ط﴾ (۲۰/ طہ: ۱۲۲)

”پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿لَقَدْ تَأَبَ اللَّهُ عَلَى التَّقْرِيرِ﴾ (۹/ التوبہ: ۱۱۷)

”یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔“

﴿فَإِنْتَجْتَنَالَهُ وَنَجِيَنَاهُ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۸۸)

”پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔“

﴿لَيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقْدَمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأْتِيَ بَعْدَهُ﴾ (۴۸/ الفتح: ۲)

”تاکہ اللہ تیری اگلی حکملی سب فروگز اشت معاون کرے۔“

کامل اور عام عنود مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انہیاً عَلَيْهِمْ کے سوا کسی دوسرا کے نصیب نہیں۔

② انہیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انہیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو لحوظہ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند مرتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انہیا عَلَيْهِمْ کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح ختم میں تمام بُرگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی ختم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہر یا ای پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام و دہن میں شہد پکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح

نبوت کی سابقہ اور لا حقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنی پر اس کی قبل از نبوت زندگی نہیں تھی اور بعده تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیاء ﷺ کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کھلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناہات ہے فرماتا ہے:

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَأَلَّا يَرَىٰ ۝ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَجَدَكَ عَابِرًا فَأَعْفَنَىٰ ۝﴾

(الضھر: ۸-۶)

”کیا اللہ نے تھوڑے یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تھوڑے بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تھوڑے کوختاج پایا، تو بے نیاز کیا۔“

سطور بالا سے ملہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

”ضلالت“ کے معنی عربی میں صرف صریح گراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بہکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

﴿أَنْ تَضْلَلَ إِذْلِيلُهُمَا فَقَتَدُكُرَاحِيلُهُمَا الْأُخْرَىٰ ۝﴾ (۲/ البقرة: ۲۸۲)

”کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسرا۔“

ایک اور آیت میں علم الہی کی تعریف میں ہے:

﴿لَا يَضُلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَىٰ ۝﴾ (۵۲: طہ: ۲۰)

”نہ چوکتا ہے میر ارب نہ بھولتا ہے۔“

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ”ضلال“ کے معنی عربی میں اور محاورہ قرآن میں صرف گراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گراہی گو گراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت اللہ کا نور اس کے سامنے نہیں چکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، بلکہ اس غلطی کی وجہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی، جہل کی برائی تو معلوم ہو گئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شمار قبطی کو گھونسہ مارا تھا، جس کے صدر میں وہ اتفاق امیر گیا تھا، نبوت پا کر جب لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿فَعَلَّهَا إِذَا وَآتَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۖ﴾ (۲۶/الشعراء: ۲۰)

”میں نے اس حالت میں کیا تھا، کہ میں چونکے والوں میں سے تھا۔“

اس چوک اور مظلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی نہ بت کو پوجا تھا نہ فرعون کو بجہد کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طانچے مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کام رجانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو مظلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے اس قل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں ”مظلالت“ کہا گیا ہے دوسری جگہ اس کو ”غفلت“ (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے تصدیق میں آپ کو خطاب ہے:

﴿تَحْمُنْ نَقْصَنْ عَلَيْكَ أَخْسَنَ الْقَصَصِ يَا أَوَّلَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنُ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ

قَبِيلَهِ لَمَنْ الْغَافِلِينَ ۚ﴾ (۱۲/یوسف: ۳)

”ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وجی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔“

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں تنبیہ کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے:

﴿وَكَذَلِكَ أَوَحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أُمِّنَا طَمَّانًا مَا كُنْتَ تَذَرِّي مَا إِلَيْكُمْ وَلَا إِلَيْهِمْ وَلِكُنْ

جَعْلَنَهُ نُورًا إِهْدِي ۝ يَهُ مَنْ لَشَاءُ مِنْ عَبَادَنَا طَوَّلَكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطِ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾

(۴۳/الشوری: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنادیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے راہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ وکھاتا ہے۔“

”کتاب و ایمان“ کے نور وہ دایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں مظلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے، اس سے مقصود حقیقی گناہ ہگار، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں مظلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے آخروہ وقت آتا ہے جب روشنی چکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی راہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے

یہ ہدایت کا دور ہے چنانچہ ایک موقع پر ان بیانات کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:
 «وَهَبَنَا لَكُمْ إِسْلَقَ وَيَعْقُوبَ طَلْلًا هَدِينَا وَنُوحًا هَدِينَا مِنْ قَبْلٍ» (۶/الاتعام: ۸۴)
 ”اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔“

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ”ضلالت“ ہی کہلاتے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہو گی جس میں ان کو ہنور نبوت نہیں مل تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔
 اس تشریع سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں ضلالت مقصود گناہ گاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نبٹا ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرا مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ علیہ السلام سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشیں گوئی کی صفت کے علاوہ ہر ہیئت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ مذاہلہ مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے، تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے ”نجات دہندة“ کو انسانیت سے پاک، خود خدا، یا خدا کا جزو یا ناسوت دلا ہوتا کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے راہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی جسم خدا یا انسان کے بھیں میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طلاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوقِ محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درمانہ تعلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پرستی ہیں، علائی تردید کرتا ہے اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافق، حقیقی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس

رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے ذرخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامد میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جائیتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاک دانی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصالوں پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے نجی میں ہے وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر مافوق البشر ہوتے ہیں یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا إِلَّا سُوْلَةً﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۹۴)

”کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا؟“

وہ بشریت کو رسالت کے منانی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا إِلَّا سُوْلَةً﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۹۳)

”میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔“

ان کو شبہ تھا کہ کیا گراہ انسانوں کی انسان ہی رہنمائی کر سکتا ہے:

﴿أَبَكْرَيْهُ دُونَتَا﴾ (۶۴ / التغابن: ۶) ”کیا انسان ہماری رہنمائی کر سکیں گے۔“

یہ ہی شبہ تھا، جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عصیٰ علیہ السلام کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گناہ کار انسان کو انسان کا بینا کیوں نہنجات دلا سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گناہ کا نہیں بلکہ وہ گناہ کار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور مخصوصیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھی میں بھی نہیں آتی تھی، اور انہیا علیہ السلام کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

﴿إِنَّ اللَّهَ إِلَّا شَرِيفٌ مِّنْنَا﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۱۰)

”تم تو نہیں ہو، لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔“

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

﴿هَلْ هُدَا إِلَّا بَشَرٌ قَتَلَكُمْ﴾ (۲۱/الانیاء:۳) ”نبیس ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔“

﴿مَا هُدَا إِلَّا بَشَرٌ قَتَلَكُمْ﴾ (۲۴/المؤمنون:۴) ”نبیس ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔“

انبیا کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے:

﴿مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ قَتَلَنَا﴾ (۲۶/الشعراء:۱۵) ”تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔“

﴿مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ قَتَلَنَا﴾ (۱۵/ینس:۳۶) ”تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔“

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے:

﴿مَا أَرْتَكَ إِلَّا بَشَرٌ قَتَلَنَا﴾ (۱۱/ہود:۲۷) ”ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشدیکھتے ہیں۔“

انبیا ﷺ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے

سرفراز ہیں اور یہی تم میں فرق ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنَّنَا نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ قَاتَلْنَا وَلَكُنَ اللَّهُ يَعْلَمُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ (۱۱/ابراهیم:۱۴)

(۱۴/ابراهیم:۱۱)

”ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں، لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔“

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیا ﷺ نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے متاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ ”کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں۔“ اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیا ﷺ کی شان الوہیت کے متعلق عیسایوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ کالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الای کہ پیغمبروں پر وحی آتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں مصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور محصرے سے فرقہ نے یہ

دعویٰ کیا کہ محدث رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمۃ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جزو ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے برع میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریع اور اس عقیدہ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کر دیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورہ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

﴿أَغْيَبَ الَّذِينَ كُفَّرُوا أَن يَتَجَوَّلُوا عَبَادِي مِنْ دُونِيَّةٍ أَوْ لِيَأَمْرَ إِلَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا﴾ (۱۸ / الکھف: ۲)

”کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حماحتی بنا کیں گے ہم نے ان کا فرود کے لئے جہنم تیار کی ہے۔“

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و مکالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے:

﴿فَإِنِّي أَنَا بَشَرٌ فَقِيلَ لِمَ يُوحَى إِلَيْكَ أَنْ أَنَا إِلَهٌ مُّكَلَّمٌ إِلَهٌ وَّمَا يَنْهَا﴾ (۱۸ / الکھف: ۱۰)

”کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔“

دوسری جگہ یہی تعلیم یعنی سورہ حم السجدہ (فصلت) میں ہے:

﴿فَإِنِّي أَنَا بَشَرٌ فَمَثَلَّمُ يُوحَى إِلَيْكَ أَنْ أَنَا إِلَهٌ مُّكَلَّمٌ إِلَهٌ وَّمَا يَنْهَا وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴾ (۶ / حم السجدہ: ۴۱)

”کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے، کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔“

اس آیت کا مشابہی بھی ہے کہ خدائی کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا

کے دوسرے بندے، دعا میں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیے یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسرا جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو:۔

﴿وَقَالُواْكُنْ تُؤْمِنَ لَكُ حَتَّىٰ تَتَعَجَّلَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَتَبَوَّعًاۚ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَاحٌ مِّنْ تَحْيِيلٍ
وَعَنِي فَتَفَعَّلَ الْأَنْهَرُ خَلْلَهَا تَعْجِيرًا۝ أَوْ سُقْطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِفَاعًا۝ أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ
وَالْمَلِكَةَ قَبْلَاهُ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ يَيْمَنٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقِيَ فِي السَّمَاءَ طَوْلًا۝ لَكُنْ تُؤْمِنَ لِيُقْسِكَ
حَتَّىٰ تُتَزَّلَ عَلَيْنَا كِبَابًا تَقْرُؤَهُ۝﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

”اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بھادرو یا تمہارے لئے بھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراویا خدا کو اور فرشتوں کو خاص من بنا کرنے لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نو شترہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔“

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براو راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں:

﴿فَلَمْ سُبْحَنَ رَبِّنِ هَلْ نَعْلَمُ الْأَبْرَارُ سُولَةً وَمَا أَنْتَ عَنِ النَّاسِ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءُهُمُ الْهُدَىٰ
إِلَّا كَمَنْ قَالُواْ أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا زَسُولًا۝ قُلْ تُوَكَّلَنَّ فِي الْأَرْضِ مَلِكَةَ يَمْشُونَ مُطْمِئِنِينَ
لَذَّكَلَنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلِكَاتٍ سُولَاتٍ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۳-۹۵)

”کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی، ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان

پاتارتے۔“

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا مESSAGES بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگلیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا۔
کفار نے مESSAGES دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

﴿هَلْ هُنَّ إِلَّا بَشَرٌ قَنْدَلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ النَّبِيًّا وَالْمُؤْمِنِ بِصُرُونَ﴾ (الأنبياء: ۲۱)

”یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو؟“

MESSAGES کی حیرت انگلیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، انہیں کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں، جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہودا نے پوچھ لوا کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْتَأْنُوا أَهْلَ الْدِيْنِ إِنَّكُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

(الأنبياء: ۲۱)

”اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو، جن کو ہم وحی کرتے تھے جانشی والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے۔“

یہی جواب سورہ یوسف میں دیا گیا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ قَنْ أَهْلُ الْفُرْقَىٰ﴾

(یوسف: ۱۰۹)

”اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔“

اس سے زیادہ تفصیل سورہ حلق میں ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْتَأْنُوا أَهْلَ الْدِيْنِ إِنَّكُمْ لَا تَعْلَمُونَ
بِالْبَيِّنَاتِ وَالرُّبُطِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْذِيْكَرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ وَأَعْلَمُ مَا يَتَكَبَّرُونَ﴾

(النحل: ۴۳، ۴۴)

”اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لوا کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری، تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور، تاکہ وہ سوچیں۔“

ہر شخص جو ملیٹ اور بشریت کی ان آئیوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آئیوں میں جس قسم کی ملیٹ اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قوی اور مخلوقیت سے ہے درست اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان رہ کر بھی، غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علاویہ متاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقصائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا یہ ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم و جہاں میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علاوہ علم و جہل کے علاویہ متاز و متفاہد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق دانتیاً تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کرو جویں والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لوتو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قوی میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور متاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو تم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حریت انگیز ایجادوں کا مخترع اُذیں بشرطیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دارگہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور متاز تر ہیں اور با ایں ہمسوہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بٹھنے، کھانے پینے، سونے جانے، دیکھنے بھانے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انہیاً کے کرام نبی ﷺ کی بھی ہے وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صرف کیا الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے متاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہؓ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں: ((أَيُّكُمْ مُّتَلِّيٌ؟ أَيُّهُ يُطِعْمُنِي رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِي)) ﴿١﴾ ”تم میں کون میری مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور

* صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال: ۱۹۶۵

روحانی سرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثبتت کی اس میں نفع نہیں ہے؟ اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غالباً نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔“ (وَكَذِلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ) ﴿٤﴾ اور اس طرح انبیا کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ”میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔“ ﴿٥﴾ کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: (أَفَتَرَوْهُ كَمْ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ) ﴿٥٣﴾ (النجم: ۱۲) ”کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس سے بھگڑتے ہو۔“ (وَلَقَدْ رَأَاهُ بِالْأَفْقَى الْمُبِينَ) ﴿٨١﴾ (النکور: ۲۳) اور اس نے فرشتہ کو آنسانوں کے کناروں میں دیکھا۔ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿لِيُنَسَّأَ الْكَوَافِرَ لَتُشْقَنَ كَأَحَدٍ قِنَ النَّسَّاعَنِ الْتَّقْيَيْنِ﴾ ﴿٣٢﴾ (الاحزاب: ۳۲) اے پیغمبر کی بیویو! تم اسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ذر رکھو، تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدر جہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کَأَحَدٌ مِنَ الرِّجَالِ نَهْ هُوَ اُولَئِنَّ مِنْ عَامِ انسانوں سے بدر جہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے بھی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی مانا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطاب

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فروگر اشتتوں پر تنہیہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خداۓ تعالیٰ کی طرف سے بھی کوئی تنہیہ نہ ہوئی تھی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشاءِ الہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا

۱) صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب ما جاء في قوله: وَكَلَمُ اللهِ موسى تکليما: ۷۵۱۷۔

۲) صحيح بخاري، كتاب الصلوة، باب عظمة الإمام الناس في اتمام الصلوة: ۴۱۸۔

تھا کہ اجتہاد نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطاؤ کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اس سے بدعاہتا ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی ﷺ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطاؤ ہی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا ان پر عمل کیا اور وہی الہی نے ان پر خاموشی برتنی تو مثلاً نے الہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بہزلف وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے نیچے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات میں ہے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگلی ہے اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین و شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی نیچے خطاؤ اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطاؤ کے معنوں

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد ممکن ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرارے تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علیت مشترک صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں نہیں ہیں یہیں کیونکہ اجتہاد نبوی نہ ان طریقوں پر ممکن ہوتا، نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقرار و تمثیل کے منطقی و اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ انور رسالت، فہم نبوت، حکم ربانی اور شرح صدر پر ممکن و قائم ہوتا ہے جن میں یہ نتیجہ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر ہے، آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے آپ نے جو پہلا اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بد اخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ وہ بہتر استون میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت مکشف ہو جاتی ہے کہ

بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا غشاہی میشہ امت پر حرم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی حرم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہرختنی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائیگی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پبلوا اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الہی نے تنبیہ کی ہے:

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الہی

جن اجتہادی امور پر وحی الہی نے تنبیہ کی ہے ان میں:

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ بھارت کے قبل مکہ معظمه میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرمائے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے روسا آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بھار ہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور تو حید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرمائے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ استئنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبد اللہ بن ام مکتوم ﷺ بھی آ کر بیٹھ گئے اور پکھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ روسا بے حد مغرب اور خود پسند تھے وہ آپ کے جلوں میں صرف اس لئے آتا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسون کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آرہے تھے، عبد اللہ بن ام مکتوم کا آ جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسون کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتغال ہوا اور راستے سے بدک گئے۔

عبد اللہ بن ام مکتوم ﷺ کی آمد اور دریافت پر یہاں گواری جو بالکل نیک نیت سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبد اللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چند اس حرخ نہیں لیکن ان رئیسون کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبد اللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسون کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے، اس پر وحی الہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلََّ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِكُ لَعْلَهُ يَرَىٰ إِنَّمَا مِنْ أَنْتَ لَكُمْ فَنْقَعَةُ الدِّكْرِ إِنَّمَّا مِنْ أَسْتَغْفَلُ فَإِنَّكَ لَهُ تَصَدِّيٌ وَمَا عَنِيكَ الْأَيْمَانِ وَإِنَّمَّا مِنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَإِنَّكَ عَنْهُ تَكْفِيٌ كَلَّا إِنَّهَا تَذَكَّرَةٌ﴾ (۱۱-۸۰/ عبس)

”تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ انہا آیا اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھانا کام آتا، وہ جو پرانہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنور نے کا تجھ پر کوئی

الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑ آیا اور (وہ خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔“

ان آتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں اس کی نگاہ میں پینا اور ناپینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان انہیں کی دلجوئی سے، ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رو سائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدروش فرمائے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دنائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ: سب سے پہلی بڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریخ خلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معمر کہ میں پھر مال غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرافتی، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلانا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے غنیمات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشر میں وہ سرشار نہ ہوا اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت رُول اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں گے لیکن قسطنطینیہ کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پھنسلا جو ہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا

اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نئے میں چور ہو کر یہودیوں اور روی بیت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقی انسانی کی تاریخ آج بھی شرمناتی ہے۔

غزوہ بدرا کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تکلیف سنت مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو خیانت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغ دار تھے وہ دفعۃ مغلوب ہو گئے، ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جو ہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے راہنمائی کی قوت راہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مال غنیمت، زرفدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برداشت کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہو گیا آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امر اوال کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جو ہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرمادی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجویز کردی یہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ ”اے ابو بکر! تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی ہے۔“ آپ نے حضرت ابراہیم علیہما السلام کی یہی دلی اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدرا کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرفدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جوان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کافر مان جاری کر دیا اور صحابہ کوتا کید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود بھجوں پر قیامت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روشنی کھلاتے تھے لیکن وہی الہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلوان غریبوں کا دفعۃ مال دولت کی حرص و طمع میں بنتا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی مال غنیمت کے فرماں کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، بلانے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تکواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہم کو ملننا چاہیے یہی اختلاف زرفدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہو گا جیسا کہ سورہ انفال

مستدرک حاکم، کتاب المغاری، ج ۳، ص: ۲۱۔

سیرت ابن ہشام، ذکر النبی، بدرا والاساری، ج ۱، ص: ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی مصر۔

کی ابتدائی آئیوں سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ طَفْلُ الْأَنْفَالِ يُلِهُ وَالرَّسُولُ ﴿أَتَقُوا اللَّهَ وَأَصْلَحُوا دَارَتِ يَبْيَلُمُ وَأَطْبِعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾﴾ (١٨/الأنفال: ٥)

”(اے پیغمبر)! تمھے (تیرے ساتھی) غیمت کا حکم پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ مال غیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔“

حضرت عبادہ بن صامت ﷺ سے پوچھا گیا کہ سورہ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا: فینا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا في النفل وسأة فيه اخلاقنا فترعه اللہ من ايدينا فجعله الى رسول اللہ ﷺ فقسمه رسول اللہ ﷺ بين المسلمين عن سواء۔ *

”یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا، تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برادر تسلیم فرمادیا۔“

بھی وہ تسلیم ہے جو حجی اہلی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخَنَ فِي الْأَرْضِ ثُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ لَوْلَا كَيْلَبٌ قَنَ اللَّهُ سَبَقَ لَمَسَكُمْ فِيمَا أَخْدَثْتُمْ عَذَابَ عَظِيمٍ فَكُلُّوا مِنَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيْبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (١٨/الأنفال: ٦٧، ٦٩)

”کسی پیغمبر کو زیان نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تاکہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخوت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانتا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدرشہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی، تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا، خلاں و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ مجتنبہ والا حرم کرنے والا ہے۔“

اسی تدریجیں بلسان قید یوں کو جن سے زندگی وصول ہو، یا وصول کیا جا رہا تھا، اس کے بعد ہی یہی وی گئی:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَمَنْ فِي أَيْدِيهِمْ مِنْ الْأَسْرَى إِنْ يَعْلَمُوا اللَّهَ فِي قُلُوبِهِمْ خَيْرًا يُؤْتَكُمْ خَيْرًا أَمْ حَذَرْتُمْ وَيَغْرِلُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (١٨/الأنفال: ٧٠)

* سیرت ابن ہشام ذکر الغنی بیدر والاساری، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

** سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

”اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا، جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے لئے زرفدی یہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی ۴۰
حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرفدی لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں، تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جوان سے بطور فرد یہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرفدی یہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدی یہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور مقتلوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔
بہر حال وہی مال غنیمت اور زرفدی یہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف و صریح وی آنے سے پیش تر قبول فرمایا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتنہاونبوی کے مطابق مناسب، موقع پر جائز و حلal و طیب ہی تھبہرالیا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق «كُلُّوَا مِمَّا غَنِيْمَتُمْ» کا حکم اسی وقت آگیا، اور فردی یہ لینے کی اجازت «فَإِمَّا مَنَّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً» الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آگئی اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بد اخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ یہیش کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنادیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگادیے گئے۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزودہ بیوک کے لئے جاری ہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رو میوں کے دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے مکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہو گئی مگر کچھ مغلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور کثر منافقین نے جان بوجہ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے تصور وار منافقین آئے کرجھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرمائیں کہ صور سے درگز رکیا، اس پر تنبیہ ہوئی:

﴿وَسَيَحْلُفُونَ بِإِنَّهُ لَوْ أُسْتَطَعْنَا لَخَرْجَنَا مَعَكُمْ إِهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِلَهُمْ لَكَذِيلُونَ ۝ عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَعَلَّمَ الظَّالِمِينَ ۝﴾ (التوبۃ: ۴۲، ۴۳)

”وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو بر باد کرتے اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجوہ کو بخشنے تو نے ان کو رخصت کیوں دی،

۴۰ مزید تفصیل کے لیے دیکھو اسی سیرت النبی ﷺ جلد اول میں غزودہ بدر کا بیان۔

جب تک تھج پروہ بھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔“
ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے ظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرمایا کہ
جھوٹ کا پردہ چاک کیا بہر حال یہاں بھی منشاءے خطا، اگر خطا بھی جائے تو وہی ترجمہ کی شان تھی۔
چوتھا واقعہ: منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعاۓ مغفرت
قبول نہ ہوگی اور فرمادیا گیا تھا کہ:

﴿إِنْسَقُفْرَلَهُمْ أَوْلَأَسْتَغْفِرَلَهُمْ طَإِنْ لَتَسْتَغْفِرَلَهُمْ سَعِينَ مَرَّةً فَإِنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ طَإِلَكَ
يَا كُوْمَلَكْرُوْدَا إِلَلَهُ وَرَسُوْلُهُ ط﴾ (التوبۃ: ۸۰)

”تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے، یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز
ان کو خدا نہ بخشنے گا، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔“
اس حکم کے آنے کے بعد عبد اللہ بن ابی بن سلوک کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص
مسلمان تھا۔ اس نے آ کر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ فرط کرم سے رد نہ فرما
سکے، حضرت عمر ﷺ نے عرض بھی کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے
فرمایا: ”میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔“ * بہر حال آیت بالا میں گو آپ کے
مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بے کار و بے سود بتایا گیا تھا مگر ان کے حق میں سرے سے دعاۓ مغفرت
نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا، تاکہ
اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل بختنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ گو ایک مسلمان کی دل بخونی تو ہوگی مگر
یہیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں
گے اس لئے حکم ہوا:

﴿وَلَا تُنْصِلْ عَلَى أَحَدٍ قِنْهُمْ مَاتَ أَبْدًا وَلَا تَقْدِمْ عَلَى قِبْرِهِ طَإِلَكَرُوْدَا إِلَلَهُ وَرَسُوْلُهُ وَمَا تُوَا
وَهُمْ فَسِيْقُونَ ط﴾ (التوبۃ: ۸۴)

”اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ ان کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں
نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گناہ گاری کی حالت میں سرے۔“
پانچواں واقعہ: اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضا مندی
کے لئے کسی مباح، چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر رام کر لیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ براءۃ: ۶۷۲۔

کرنے کا عہد فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضا مندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کر لے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے بعض یوں یوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض یوں یوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی لجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری بحیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مترادف ہو جاتا اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبروں کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروانہ چاہیے۔ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّٰبِيُّ لِمَ تَحْكِمُ مَا أَحَدَكَ اللَّٰهُ لَكَ ۝ تَبَعُّنِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۝ وَاللَّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

(۱) التحریم: ۶۶

”اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے، اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی یوں یوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے مگر پیغمبر کی بحیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پائچ دلائے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطابات کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کو خطاب کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر کہ اس مجازی خطاب کی بھی اجازت نہیں اور اسی لئے وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے راہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برپتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی و شریعت رباني کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و پداشت کی معرفت سے کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ ائمہ ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو استغفار اللہ ثم استغفار اللہ اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور راہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھار میں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے ہوتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الہی، القاء ربانی، حکمیت یہ زبانی، فہم رسالت، ملکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محروم اسرار شریعت، عمر فاروق بر سر منبر یہ فرماتے ہیں:

یا ایها الناس! ان الرأی انما کان من رسول اللہ ﷺ مصیباً لان الله کان

یریه و انما هو منا الظن والتکلف۔

”اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا مگان اور ازخود کہنا ہے۔“

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربیٰ کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْعِيْنِ لِتَعْلَمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرْسَلَ اللَّهُ مَوْلَاكَ اللَّهُ مَوْلَى الْعَالَمِينَ خَصِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۱۰۵)

”ہم نے تھوڑے پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تھوڑے کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دعا بازوں کی طرف سے جھوٹنے والا۔“ اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سو جھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”(انما اقضی بینکم برای فیما لم ینزل علیٰ فیہ)“

”میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی، اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔“

یہ فیصلہ اگر، غلط ہوتا تو فوز اوری الہی دست گیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گزشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ”اراءت الہی“ ہوتی تھی

۱ ابو داود، کتاب القضاء، باب فی قضاۓ القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸۶۔

۲ ابو داود، کتاب القضاء، باب فی قضاۓ القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸۵۔

یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارائت الہی (خدا کی طرف سے بھایا جانا) تاکہ آپ کتاب الہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابواد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہل مقدمہ سے فرمایا:

”میں ایک بشر ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے بھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے کر میں اس کو آگ کا نکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“ *

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سارے مغالطہ ہے اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک واقعہ کی اصلی رواداد جس کو ہر مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنایا کر اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ رواداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس رواداد پر تینی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی رواداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا ہمیں نہیں قرار پاسکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتوں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس رواداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی صحیح و صواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا کہ نہ رسول و نبی کی شان کی تو ہیں و تحقیر ہے اور اس ”ارائت الہی“ کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلے میں آپ کو بخشنا جاتا تھا اس لئے غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ بھئے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمایا اس کے مطابق مناسب صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں (فشتان بینہما)۔

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں مکمل یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی رواداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے یہ سمجھے کہ گو

* ابو داود، کتاب القضا، باب: ۱، قضاء القاضى اذا اخطأ: ۳۵۸۳۔

حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن اب جب عدالت نبوی ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصب حق کے گناہ سے بریت ہو گئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہو گا قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عند اللہ جو برس حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو سر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی تھا اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں روپڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہوئے پر آمادہ ہو گئے۔ *

آنحضرت ﷺ روایت مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا اسی لئے ارشاد ہوا کہ

﴿فَلَا وَرِسْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فَإِنَّمَا يُبَغِّرُهُمْ نَمَّلَأُجُودُهُمْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّنَ﴾

قضیت و مسلم و اسیلہما) (النساء: ٦٥ / ٤)

”سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔“

﴿وَمَا كَانَ لِيُؤْمِنُ وَلَا مُؤْمِنٌ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَيْرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (الاحزاب: ٣٦)

”اور کسی ایماندار، مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے، تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے بے حکم چلا، وہ صریح گمراہ ہوا۔“

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چراقویں کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ بھی خالما نہ اور غلط نہیں ہو سکتا:

﴿وَإِذَا دُعَا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيُحَكِّمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ قَدْ هُمْ مُفْرِضُونَ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحُكْمُ يَأْتُوُهُ إِلَيْهِ مُذْعِنُينَ أَفَنْ قُلُوبُهُمْ مَرْضٌ أَمْ أَرَأَتُمُوا أَمْرًا يَعْلَمُونَ أَنْ يَحْيِفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ طَبْلَنَ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (التور: ٤٨ - ٥٠)

”اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ رسول، ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں ایک گروہ من پھر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو، تو قبول کر کے

ابوداؤد، کتاب القضا، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ:- ٣٥٨٤۔ *

چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ نا انصافی کرے گا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔“

عقل بشری

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجتہاد کی بھی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار روحی والہام اور ملکہ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیر و دوں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا: ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں، فرمایا: ”میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔“ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔“ اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سر اپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا پھل اس سال کم آئے، یا کم تھے آپ کا پھر گزر ہوا، تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں۔“ پھر فرمایا:

((إِنَّمَا آتَا بَشَرًّا إِذَا أَمْرُتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِينِكُمْ فَخُذُوهُ إِنْهُ وَإِذَا أَمْرُتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا آتَا بَشَرًّا))

”میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((إِنَّمَا أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ)) ”تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔“
تیری روایت کے الفاظ ہیں:

((فَإِنَّمَا ظَنَنْتُ طَنَا فَلَا تَؤَاخِذُنِي بِالظُّنُونِ وَلَكِنْ إِذَا حَدَثَتُكُمْ عَنَّ اللَّهِ شِيَّا

۱) حجۃ اللہ البالغۃ، باب بیان اقسام علوم النبی ﷺ، ج ۱، ص ۱۰۲: پر اس کی تفریغ موجود ہے۔

۲) مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امثال ما قاله شرعاً..... ۶۱۲۷:-

۳) ایضاً: ۲۱۲۸:-

فَخَذُو بِهِ فَانِي لَنْ أَكْذَبُ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ) ۖ

”میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو، کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔“

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ کچھ آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے، لیکن کیھی باری، علاج معالجو غیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ یا وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرمادیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوہ بدربدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑا اڈا ناچاہا، ایک صحابی نے آ کر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس مقام کا اختیاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا: ”جھض رائے ہے۔“ تو عرض کی کہ جتنی نقطہ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ ؓ مسیح مسے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو «وَشَاؤْهُمْ فِي الْأَمْرِ» (آل عمران: ۱۵۹) یعنی ”امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو۔“ کا حکم خدا کی طرف سے ہے چنانچہ غزوہ احزاب میں خندق کھونے میں سلمان فارسی ؓ کی رائے پر عمل کیا، لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں، بلکہ وحی الہی یا فہم نبوی ﷺ سے ہوا تھا اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حد پیغمبر کی رائے اور دفاعات جو سراسر مصلحتِ الہی اور حکمتِ رب انبیاء پر ہوتی تھی ان کے بد لئے پر حضرت عمر ؓ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر تحقیقی، اسی طرح غزوہ احمد جیسے نازک موقع پر عبد اللہ بن ابی کاتم سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صرف آرا ہونے سے بازنہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ ساتھی عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پہنچتہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دنائیں کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاٹھل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی

۱ ایضاً: ۲۱۲۶۔ ۲ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶۲؛ البداية والنهاية، ج ۴، ص: ۹۵؛ کامل ابن القیم، ج ۲، ص: ۶۷۔

ضایعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ سمجھو کر کا شت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زور فکر سے افلاطون و اسٹوکی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحا نیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، ترقی نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقيقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہوا اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انہیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امور دین و شریعت میں وہی اور ملکہ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرأ اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً: پہنچ، اوڑھنے، کھانے پینے، رہنہ پہنچنے، سلطنت و سیاست، نظم و نقش، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، جنگ و سوراہی، صنعت و حرفت، طب و علاج، وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احرار فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہنچنے اور ڈھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں ہیں یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسرا یہ کہ مردوہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبائے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسرا بات یہ ہے کہ وہ لباس پابند نہیں، جس سے غرور و خوت نہیں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نقش اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہی اور جاہرانہ حکومت نہ ہو لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں الٰہ حل و عقد کا ہی مشورہ ہو علی ہذا القیاس۔ الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تحدیں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیری و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو میشہ کے لئے مخدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحثت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں وہی، ملکہ نبوت اور عام عقل بشری ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اور پر کسی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو جکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکہ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علمانے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں سلف و صالحین میں سے بعض نے اس کو الفانی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمت قلبیہ، توفیق ازلی اور قوت تیمین سے تعبیر کیا ہے۔ * امام غزالی و

* تمام الفاظ امام شافعی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے متكلّمین نے اس کو مملکہ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبر ان قوت اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریع، اسرار شریعت کا بیان اور دقائیق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیاء کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ”علم نبوت“ ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملک) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں ارشاد (دکھا دینا، سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے یونچے اور عقل بشری سے اور عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو پکھننا پڑھلی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حکمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت

انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) «فَقَدْ أَتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَأَتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا»

(۴) / النساء: ۵۴

”تو بے شبہ ہم نے ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت سخنی۔“

حضرت لقمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہے:

(۲) «وَقَدْ أَتَيْنَا لِقَمَانَ الْحِكْمَةَ» (۳۱/ لقمان: ۱۲)

”اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔“

حضرت داؤد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے:

(۳) «وَشَدَّ دَنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَهُ وَفَصَلَ الْخَطَابِ» (۲۰/ ص: ۳۸)

”اوہ ہم نے داؤد صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔“

(۴) «وَقَتَلَ دَاؤدُ جَالُوتَ وَأَتَهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلِمَهُ مِنَّا يَشَاءُ»

(۲۵۱: ۲) / البقرة

”اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے، اس میں سے کچھ سکھایا۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

(۵) ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلَا يَبْيَغُونَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾

(۶/ الزخرف: ۶۳)

”میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔“

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتنا تاہے، تو فرماتا ہے:

(۶) ﴿وَإِذْ عَلِمْتَكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالثَّوْرَةَ وَالْأُنجِيلَ﴾ (۱۱۰/ المائدہ: ۵)

”اور یاد کر جب میں نے تھوڑا کتاب اور حکمت اور توراة اور انجیل کی تعلیم دی۔“
عام انبیاء کے متعلق ہے:

(۷) ﴿وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِنَّا يَتَّقَنُ التَّبِيَّنَ لَمَّا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةً﴾

(۸/ آل عمران: ۳)

”اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

(۸) ﴿رَبَّنَا وَابَعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً فِتْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمُ الْيَتَكَ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيَزْكُرُهُمْ بِإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۹)

”ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آئیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالباً اور حکمت والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے انکی یہ دعا قبول فرمائی:

(۹) ﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِينِكُمْ رَسُولاً فِتْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْكُمُ الْيَتَكَ وَيَرْتَبِعُكُمْ وَيَعْلَمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيَعْلَمُكُمْ مَا لَمْ تَكُنُوا تَعْلَمُونَ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۵۱)

”جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا وہ تم کو ہماری آئیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس دعاے ابراہیم کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں ہم پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنفُسِهِمْ يَنذِلُوا عَلَيْهِمْ
الْكِتَابَ وَنَزَّلَهُمْ وَعَلِمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَفْنِ ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۱۶۴:آل عمران)

(۳) (۱۶۴:آل عمران:۱۶۴)

”یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جوان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گرا ہی میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہیں الفاظ میں سورہ جمعہ میں دہرا یا ہے:

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَنذِلُوا عَلَيْهِمْ أَنِيَّهُ وَنَزَّلَهُمْ وَعَلِمَهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَفْنِ ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲۶:الجمعۃ)

”وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جوان کو اللہ کی آیتیں سنا تا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گرا ہی میں تھے۔“

خداآنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۲) ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْنَا وَرَحْمَةُ لَهُمْتَ طَالِبَةً قِنْهُمْ أَنْ يُضْلُلُوكُمْ وَمَا
يُضْلُلُونَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَمَا يَضْرُونَكُمْ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَمَكَ مَا لَمْ تَعْلَمْ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۱۱۳:النساء)

”اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر پچھی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہ پہنچا سکتے خدا نے تجھے پر کتاب اور حکمت اتنا ری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔“

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے:

(۱۳) ﴿ذَلِكَ مِنَّا أَوْنَى إِلَيْكَ رِبِّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (۱۷:بنی اسراء پبل:۳۹)

”یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔“

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱۴) ﴿وَإِذْ كُرُوا بِغَمَةِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعْظَلُمُهُمْ﴾ (۲۲۱:البقرۃ:۲)

”اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتنا ری ہے ان کو یاد کرو خدا تم

کو اس سے سمجھاتا ہے۔“

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے:

(۱۵) ﴿وَإِذْكُنَّ مَا يُنْهَىٰ فِي يُونَتْنَ مِنْ أَلِيٰ اللَّهُ وَالْحَكِيمَةِ﴾

(۳۲/ الاحزاب)

”اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو،“
یعنی حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

(۱۶) ﴿يُونَتْنَ الْحَكِيمَةَ مِنْ يَسِّعَهُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحَكِيمَةَ فَقَدْ أُوتَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾

(۲۶۹/ البقرة)

”اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشا ہے اور جس کو حکمت بخش دی گئی اس کو بڑی دولت
(بھلائی) دی گئی۔“

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

(۱۷) ﴿أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحَكِيمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَاءُهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

(۱۲۵/ النحل)

”اپنے پروردگار کے راستے کی طرف، تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے
عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔“

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْهَارِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حَكِيمَةٌ بِالْفَةٍ فِي الْمُغْنِ الشَّدَرٍ﴾

(۵۴/ القمر)

”اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانت ہو سکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، مؤثر حکمت، تو ان کو ڈر
سانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔“

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئیں ہیں جن میں ”حکمت“ کا لفظ آتا ہے ان آیتوں میں
حکمت کا لفظ کہیں تھا آیا ہے اور کہیں ”کتاب“ کے بعد آیا ہے کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک صحیحہ
ربانی کے معنی میں اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نو شرعاً الہی اور علم الہی جیسے (لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ)
”اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا۔“ ان سابق آیتوں میں کتاب سے تو بے شہ آسمانی کتاب اور حیفہ ربانی، یا
یوں کہو کہو جی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات و قرآن وغیرہ مراد ہے لیکن ”حکمت“ کا مفہوم ان آیتوں میں کیا
ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دنائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے؟ اس تحقیق کے

لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتنی^۱ اپنی کتاب "جمهرة اللغة" میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فکل كلمة وعظتك او زجرتك او دعتك الى مكرمة او نهتك من قبيح فهى حكمة وحكم.

"ہر دہ بات جو تھہ تو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بڑی چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔"

لغت کا امام جوہری اپنی صاحح اللغة میں لکھتا ہے:

الحكمة من العلم والحكيم العالم وصاحب الحكمة والحكيم المتقن لللامور.

"حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔"

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم.

"اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جانے کو کہتے ہیں۔"

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء ایجادها على غایۃ الاحکام ومن الانسان معرفة الموجودات و فعل

الخيرات.

"او حکمت، علم اور عقل سے کچی اور صحیح بات کو جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جانتا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جانتا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔"

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا چاہیے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابن حبان انہی نے اپنی تفسیر ابو الحییط میں ان کے اکثر اقوال کو سمجھا کر دیا ہے:

(۱) قال مالك وابورزين: الحكمة الفقه في الدين والفهم الذي هو سجية نور من الله تعالى.

¹ جمهرة اللغة، ج ۲، ص: ۱۸۶، حیدر آباد۔ ² صحاح اللغة، ج ۲، ص: ۶۲۷، مصر۔

³ لسان العرب، ج ۱۵، ص: ۳۰، مصر۔ ⁴ مفردات القرآن، ص: ۱۲۶، مصر۔

⁵ زیر آیت (وَأَنْتَ فِيهِمْ سُولًا مِنْهُمْ) الآیة: ج ۱، ص: ۳۵۲ مطبوعہ سعادت مصر۔

”امام مالک اور ابو روزین کا قول ہے: حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔“

(۲) وقال مجاهد: الحکمة فہم القرآن.
”مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔“

(۳) وقال مقاتل: العلم والعمل به لا يكون الرجل حكيمًا حتى يجمعها.
”مقاتل کا قول ہے: حکمت، علم اور عمل کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم و عمل دونوں کا جامن نہیں۔“

(۴) وقيل: الحکمة القضاء.

”بعضون کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔“

(۵) وقيل: ما لا يعلم الا من جهة الرسول.

”کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔“

(۶) وقال ابو جعفر محمد بن یعقوب: كل صواب من القول ورث فعلاً
صحيحاً فهو حکمة.

”ابو جعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔“

(۷) وقيل: وضع الاشياء مواضعها.

”کسی کا قول ہے: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنا حکمت ہے۔“

(۸) وقيل: كل قول وجب فعله.

”ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔“

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) قال (مالك): المعرفة بالدين والفقه في الدين والاتباع له.

”مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیرودی حکمت ہے۔“

(۲) قال ابن زيد: الحکمة الدين الذي لا يعرفونه الابه ﷺ يعلمهم ايها قال والحكمة العقل في الدين وقرأ: (وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتَى خَيْرًا كَثِيرًا) وقال يعيشى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل وقرأ ابن زيد: (وَاتَّلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الدِّينِ أَيْتَنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا) قال لم يتفع بالآيات حين لم تكن معها حکمة قال والحكمة شيء يجعله الله في القلب نور له به۔

”ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سمجھاتا ہے نیز انہیں کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ”جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراة اور انجلیں سمجھاتا ہے۔“ ابن زید نے یہ آیت پڑھی کہ ”ان کو اس کا حال سناو جس کو میں نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔“ یعنی ان آیتوں سے فخر نہیں اٹھایا کہ ان کے پاس حکمت نہیں حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔“

(۳) عن قتاده: والحكمة ای السنة.

”قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی سنت نبوی۔“

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

(۴) قال ابن جریر الطبری : والصواب من القول عندنا في الحكمة انها العلم باحكام الله التي لا يدرك علمها الا بيان الرسول ﷺ والمعرفة بها وما دل عليه ذلك من نظائره وهو عندي مأخوذه من الحكم الذي بمعنى الفصل بين الحق والباطل .

”ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول کے بیان (ترشیح) سے معلوم ہوتے ہیں اور جو ان کی مثالیں اور ظریفیں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسئلہ کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(۵) وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقرآن يقول: الحكمة سنة رسول

الله ﷺ .

”میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔“

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسته الحكمة التي في روعه عن الله عزوجل .

۱ تفسیر طبری، الجزء الاول، ص: ۴۱۵؛ ۲ الرسالة، ص: ۲۴۔ ۳ ایضاً، ص: ۲۸۔

”اور آپ کی سنت و حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔“

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائز نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح و غلط، صواب و خطأ، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ، بذریعہ غور و فکر، دلیل و برهان اور تجربہ و استقراء کے نہیں، بلکہ منکھفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔ ہر فن کے واقف کار و قائم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بھم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیمانی ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق بچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف صحیح دیتے ہیں اسی کا نام آپ صحت و جد و جدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشا پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے وہ ان امور کے اس کے دلیل سے دیقان مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و جدان سے صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے یہی وہ معرفت اور نور الہی ہے جو جد و جہد اور سعی و حکمت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام ”حکمت“ ہے۔

دوسری زبانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عظیم بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مراتب عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء ﷺ کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عظیم، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر ”حکمت“ کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوتِ حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت، حس میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیر ہویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برخاتا، عهد پورا کرنا، ناپ توں

ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غور کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرمائے کر اللہ کہتا ہے:

﴿ذلِكَ مِنَ آوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (۱۷ / بنی اسرائیل: ۳۹)

”یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجوہ پر وحی کی ہیں۔“

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور متانج کس قسم کی باتیں ہیں یعنی عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اپنے بخوبیں اور چھٹی آیت میں انخلیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلاؤں یہ لفیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ”حکمت والا قرآن“ ظاہر کی ہے (﴿تِلْكَ آيَتُ الْكِتَبِ الْحَكِيمِ﴾) (۳۱ / لقمان: ۱۰؛ ۲ / یونس: ۱) (﴿وَالْقُرْآنُ الْحَكِيمُ﴾) (۳۶ / پیش: ۲) (﴿وَالَّذِيْكُرُ الْحَكِيمُ﴾) (۳ / آل عمران: ۵۸) ان آئیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ”حکمت“ کی بعض اہم تعلیمیوں اور باتوں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر کرکھی شامل کر کے ان کو آب مقطر بنا دیتی ہے یہ چیز انہیا کو کتاب کی وحی الٰہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے۔ فرمایا:

﴿وَإِذَا خَدَّ اللَّهُ فِيْنَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَّا آتَيْتَكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ (۲ / آل عمران: ۸۱)

”اور یاد کرو جب خدا نے غیر بروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔“

بہر حال یہ حکمت کی قوت انبیاء ﷺ کو بدوجاتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہربات، دانائی اور ان کا ہر کام، دانش مندی پرمنی تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس قوت کے آثار اور متانج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور جس کا یہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق کے اندر داخل ہوا۔ پندرہ ہویں آیت میں ہے:

﴿وَإِذْنُنَّ مَا يُشَئُ فِيْ يُوتَكُنَّ مِنْ آيَتِ اللَّهِ وَالْحَكِيمَةِ﴾ (۳۴ / الاحزاب: ۳۴)

”(اور اے محمد رسول اللہ کی یو یو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔“

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانائی کی وہ باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے:

﴿وَعِلِمْهُمُ الْكِتَبَ وَالْحَكِيمَةَ﴾ (۲۶ / الجمعة: ۲)

.....
* لفظ ”یتلئی“ سے کسی کوشش نہ ہو کہ وہ کتاب کے لیے خاص ہو کر آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی اور فرماتے تھے۔

”وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی، کہ جو چیز ان کے پاس نہیں وہ دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، تو جب یقوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی وہ تعلیم فرماتے ہیں اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قَدْ جَنَّتُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلَا يَعْلَمُونَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾

(٤٣: الزخرف)

”میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تمیں بھی ہے یعنی کسی محل، ذمہ دین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریع و تفصیل جس سے وہ اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریع ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی، بارہویں آیت میں ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللَّهِ طَائِفَةٌ قَنْهُمْ أَنْ يُضْلَوْكَ طَوْمَا يُضْلَوْنَ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ وَمَا يَعْلَمُونَ وَلَكَ مِنْ سَقْئٍ طَوْمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَمَكَ مَا لَمْ يَعْلَمْ تَعْلَمُ طَوْمَا كَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (٤: النساء)

”اور اگر خدا کا فضل و کرم تجوہ پر سہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہتا کہ تجوہ کو گراہ کر لے، اور وہ گراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجوہے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اللہ نے تجوہ پر کتاب اور حکمت اتنا ری اور تجوہ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجوہ پر بر رہا ہے۔“

ان آئیوں میں بیان ہے کہ متفقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکنا چاہتا تھا اگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجوہ کو بہکانہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجوہ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجوہ پر کتاب اور حکمت اتنا ری ہے اور تجوہے وہ علم بخشندا جو پہلے نہ تھا اس سے ظاہر ہوا کہ گراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطاء سے یہ عصمت اور علم کی بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے لئے کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتاب الہی کے ساتھ حکمتِ ربیٰ کے قرآن پاک میں حرف علیت سے قبول ”وَإِنَّمَا يَأْكُلُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (٢٦: الاعمَام) یہ حرف عطف نہیں۔

انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینہ نبوت تھا، لیکن یہ فرض حب استعداد تغیر کے اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ بھی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبیغ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی کے مناظرہ کرنے میں سب سے اول اسی کو جگہ دی گئی ہے:

﴿أَدْعُ إِلَى سَيِّئِ رَبِّكَ يَا الْوَكِيدَةَ وَالْمَوْعِظَةَ الْحَسَنَةَ وَجَادُهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

(۱۶/ النحل: ۱۲۵)

”تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔“

بھی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی ہے اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فرمایا:

﴿الْحِكْمَةُ بِالْفَيْضٍ﴾ (۵۴/ القمر: ۵) ”دل تک پہنچ جانے والی حکمت۔“

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ تَؤْتُ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتَيَ الْخَيْرًا كَثِيرًا﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۹)

”جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی (دولت) دی گئی۔“

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہو گا، آنحضرت ﷺ نے فدر کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

﴿إِنَّ مِنَ الشَّعْرَ لِحِكْمَةٍ، إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لِسُخْرَةٍ﴾

”بعض شعر حکمت ہیں، اور بعض تصریفیں جادو ہوتی ہیں۔“

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تصریفیں جادو کہا گیا ہے۔ اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اس عربی حکمت کا مفہوم اردو حکمت کے مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخلیل ضرور ہے اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اردو میں اس حقیقت کو ”حکمت“ کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے یعنی ”الہامی حکمت“

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یجوز من الشعر والرجز.....الخ: ۶۱۴۵ میں پبلانقرہ اور کتاب الطب، باب ان من الیان سحر: ۵۷۶۷ میں دوسرا فقرہ ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرا سے ((رَجُلٌ أتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيُ بَهَا وَيَعْلَمُهَا)) * ”اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے۔“ جب یہ عام انسانوں کا درجہ ہے تو انہیں ﷺ کو یہ دولت کسی بہتان سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصول دولت یعنی عطا یہ حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیماتہ تعلیمات جو تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸-۹-۱۰-۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

﴿يَتَّلَوُ عَلَيْهِمْ لِيَتَهُ وَيَرَكِّبُهُمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة: ۶۲)

”(وہ رسول) ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔“

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے:

① خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

② ان کو شرک اور بد اخلاقی کی نجاستوں سے پاک و صاف کرنا اور سنوارنا۔

③ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسرا آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یادو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتalloa یعنی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحب نظر بھی سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنادینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ، ہے خصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے وحی کے الفاظ کو سنادینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا الفاظ کا سنادینا اور پڑھادینا اور دوسروں کو یاد کر دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی

* صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحكمة: ۷۳۔

تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، جمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام ”کتاب و حکمت کی تعلیم“ ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آئیوں میں بار بار ذکر ہے اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہو گئی اور اس کی تعلیم بھی امت کے لئے ضروری ہو گئی آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ ”احادیث و سنن“ کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ”حکمت“ کے ان معنوں پر ایک نظر دو بارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال، جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الہی کی عملی وزبانی تشریحات ہیں۔ کتاب الہی وحی رب انبی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینہ نبوی کی ملہماۃ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعی کی تحقیق پیش نظر ہے:

وَسَنَةُ الْحِكْمَةِ الَّتِي أَقْرَى فِي رُوْعَهُ عَنِ الْأَنْبَىءِ عَزَّوَ جَلَّ۔

”اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔“

اور اس مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمة فهم القرآن۔ حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریع حکمت ہے اور اس تشریع کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی، سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابو روزین اور ابن زید و غیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ ”حکمت معرفت دین، فقد دین اور اس دینی علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔“

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و متأثح ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہو گا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریع میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جانے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جانے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت

مختلف ہوگی۔ انہیا علیہ السلام کے متعلق سے اس کا جب استدلال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حیدر پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

﴿يَا بَتَّ إِلَيْيَ قُدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا أَنْهِيْ يَأْتِكَ﴾ (۱۹ / مریم: ۴۳)

”اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔“
حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿وَعَلَمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ (۱۸ / الکھف: ۶۵)

”اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔“

خدا کے پاس سے توجہ چیز ہے، پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجاب اللہ کی جاتی ہے اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخوبی عطا ہو، وہی علم خداداد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علمِ لدنی (پاس والعلم) کہتے ہیں:

حضرت داؤ و اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَا دَاؤَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا﴾ (۱۵ / النمل: ۲۷)

”اور بے شک ہم نے داؤ و اور سلیمان کو علم دیا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے:

﴿وَكَذَلِكَ يَعْتَبِرُكَ رَبُّكَ وَيَعْلَمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُؤْمِنُ بِعِظَمَتِهِ عَلَيْكَ﴾

(۱۲ / یوسف: ۶)

”اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازدے گا اور تجھ کو با توں کی حقیقت، کی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔“

ان آتوں میں اس علم کا ذکر نہیں، جس کا منشوائی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تاویل احادیث کا علم بیک دفعہ دیے جانے کا ذکر ہے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

﴿ذِلِكُمَا وَهَا عَلَمَنِي رَبِّيْ﴾ (۱۲ / یوسف: ۳۷)

”یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔“

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے، کہ خواب کی تعبیر کے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی

بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت، بیشکے لئے دیجت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء ﷺ کو چچپن ہی میں علیم (جانے والے) کا خطاب ملا:

﴿وَبَكْرُهُ يَعْلَمُ عَلَيْهِ﴾ (۵۱/ الذاريات) (۲۸)

”او فرثتوں نے اس کا ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔“

﴿إِنَّا نُبَشِّرُكُ بِعِلْمٍ عَلَيْهِ﴾ (۱۵/ الحجر) (۵۳)

”ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔“

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عام نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے ان آئتوں سے ظاہر ہوا کہ وہی موقع جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائیٰ عطیہ بھی بھی کی شان ہے۔
علم و حکم

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھو اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فصلہ کے) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحكم بالشيء ان تقضى بالشيء بانه كذا أوليس كذا سواء الرمت ذلك

غيره او لم تلزمـه۔ *

”کسی شے پر حکم کرنا یہ فصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فصلہ کا تم وسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔“

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحكم العلم والفقه والقضاء بالعدل۔ *

”حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصاقانہ فصلہ کرنا ہے۔“

ان انبیاء ﷺ کو جن پر کسی کتاب کا ملنا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسف عليه السلام کی شان میں ہے:

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشْدَدَةَ أَتَيْنَاهُ حَلَماً وَعَلَيْهِ﴾ (۱۲/ یوسف) (۲۲)

”او جب یوسف عليه السلام جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔“

حضرت لوط عليه السلام کے متعلق ہے:

﴿وَلَوْلَا أَتَيْنَاهُ حَلَماً وَعَلَيْهِ﴾ (۲۱/ الانبیاء) (۷۴)

* مفردات القرآن، ص: ۱۲۶، مصر۔ ** لسان العرب، ج: ۱۵، ص: ۳۰، مصر۔

”اور لوٹ کو ہم نے حکم اور علم دیا۔“

حضرت داؤد اور سلیمان ﷺ کے ذکر میں ہے:

﴿فَقَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلَّاً أَتَيْنَا حَلْمًا وَعِلْمًا﴾ (۲۱/الآنیاء: ۷۹)

”تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔“

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت ہے:

﴿بَيْعَنِي خُذِ الْكِتَبَ بِقُوَّةٍ وَأَتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيَّاً﴾ (۱۹/مریم: ۱۲)

”اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑو اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔“

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نبی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَا يَحْيَى إِسْرَائِيلَ الْكِتَبَ وَالْحُكْمَ وَالثِّبَوَةَ﴾ (۴۵/الجاثیة: ۱۶)

”اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔“

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آنے والوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے:

﴿فَأَخَلَمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ﴾ (۲۸/ص: ۲۲)

”ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔“

﴿فَأَخَلَمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (۳۸/ص: ۲۶)

”تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَأَخَلَمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾ (۵/المائدۃ: ۴۲)

”او راگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

حضرت داؤد اور سلیمان ﷺ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

﴿وَدَاؤدُ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمُنَ فِي الْحَرِثِ﴾ (۲۱/الآنیاء: ۷۸)

”او راگر داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔“

﴿وَمَا اخْتَفَتْمُ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ عَلَيْهِمْ كَمَآ إِلَى اللَّهِ﴾ (۴۲/الشوری: ۱۰)

”او جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ، یہی تین باتیں سورہ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گناہ کرالگ الگ

دہرائی گئی ہیں:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَبَ وَالْحُكْمَ وَالثِّبَوَةَ﴾ (٦/الانعام: ٩٠)

”یہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔“

جن پیغمبروں کے نام اور گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں: ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الحسین، یونس، ابو علیؑ۔ ان اخھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت و سلطنت (اگر ہو) تو اس کے صحیح صرف وہ ہیں، سلیمان اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیا جائے باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحah حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے، وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالیے:

﴿مَا كَانَ لِشَرِيكَةِ اللَّهِ الْكِتَبَ وَالْحُكْمَ وَالثِّبَوَةَ كُمَرٌ يَقُولُ لِلشَّاكِرِينَ كُوْنُوا عَبَادَتِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِكُنْ كُوْنُوا شَرِيكِيَنَ يِمَّا لَنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَبَ وَيِمَّا كُنْتُمْ تَدْرِسُونَ﴾

(۷۹/آل عمران: ۳)

”کسی بشر کے لئے یہ زبانیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہہ کر تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو، بلکہ جو تم کتاب (توراة) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خداوائے ہو۔“

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس پیش کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمر و روتا تو اس تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے، وہ کتاب اور نبوت ہی کی جس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ ساشاہی بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت و سلطنت نہیں، تیکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

﴿فُلِّ إِنِّي عَلَى بَيْتَكَ مِنْ رَّبِّي وَكَذَّبُمُّهُ طَمَاعِنْدِي مَا سَتَغْلِبُونَ يَهُ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ يَقْضِيُ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَعَالِينَ﴾ (٦/الانعام: ٥٧)

”کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروار گار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھلاتے ہو،

میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔¹

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سندا بھی ملتی ہے جس کے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر

ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے شرح صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضيق، جمل و نادانی کی علامت اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور بجا زی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقيق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃ اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تعلی و تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و سرت حاصل ہو جاتی ہے تمہرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرحت لك الأمر أى أوضحته وكشفته وشرح

الله صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير. *

”شرح الہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ ”میں نے تمیرے لئے بات کی شرح کر دی“ یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔“

صحاح جوہری میں ہے:

الشرح الكشف تقول شرحت العامض اذا فسرته. *

”شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کی تفسیر کر دی۔“

لسان العرب میں ہے:

الشرح الكشف يقال شرح فلان امری او ضحه وشرح مسئلة مشكلة بينها وشرح الشيء يشرحه شرعا وشرحه فتحه بينه وكشفه وكل ما فتح من

1 جمہرۃ اللغوۃ، ج ۲، ص: ۱۳۴۔

2 صحاح اللغوۃ، ج ۲، ص: ۲۶۰۔

الجواهر فقد شرح ايضاً تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله
صدره لقبول الخير يشرحه شرعاً فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔
”شرح یعنی کشف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی، یعنی اس کو واضح
کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی
تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو
پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی تفسیر کر دی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات
کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا گیا یا وہ وسیع
ہو گیا۔“

قال ابن الاعربی : الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البيان والشرح
الفهم۔

”ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔“
قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:
﴿قَالَ رَبُّ اُشْرَخَ لِي صَدْرِيٌّ وَيَسِّرْنِي أَمْرِيٌّ وَاحْلُّ عُقْدَةً قِنْ لِسَانِيٌّ يَقْتَهُوا
قُوَّتِيٌّ﴾ (۲۰/ طہ: ۲۵-۲۸)

”اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان
کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔“
دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں
فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القا اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے اختیاب کی دعا
کی ہے، تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ علیہ السلام کو بن مانگے ملی۔
خدانے فرمایا:

﴿الْأَكْثَرُ نَثَرَخُ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعَنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (۱، ۹۴/ الانشراح)
”کیا ہم نے (اے محمد علیہ السلام)! تیرے لیے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجہ کو تجھ
سے اتار لیا۔“

شرح صدر اور ”سینہ کھولنے“ کی جو تشریح احادیث صحیح میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح ثقہ
صدر ہے یعنی عالم روایا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور

* لسان العرب، ج ۲، ص: ۲۹۲، بیروت۔

سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سیدنا مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر تحقیقت پر بھول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سیدنا مبارک کو واقعاً چاک کر کے اور زرم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ تحقیقت مانی پڑے گی کہ سیدنا سانی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا بہر حال شرح صدر کی تحقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالامعنی کو جو شرح صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے، اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بحمد اللہ کہ اس کی تسلیم کا سر ما یہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورہ زمر میں ہے:

﴿أَكَفَنْ شَرَحَ اللَّهِ صَدُرَةَ لِلْأَسْلَكِ وَفَهُوَ عَلَىٰ تَوْقِيقِ رَبِّهِ ط﴾ (۲۲: الزمر)

”بھلا جس کا سیدنا اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔“

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی تحقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسلیم حاصل ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوئی یہی شرح صدر کی تحقیقت اور ہے اس روشنی کی بیشی درجوں اور منصوبوں کے مطابق ہو گی۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ”شرح صدر“ کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر ہے کہ ان حدیثوں سے معنوی، احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق ؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں حضرت عمر فاروق ؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے پچالیا، حضرت صدیق ؓ نے جواب دیا خدا کی قسم امیں اس سے لڑوں گا جوز کوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں:

* صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ: ۳۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء بر رسول اللہ ﷺ السیروات: ۴۱۳، ۴۱۵؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الصلوٰۃ: ۴۴۹؛ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ انتشارح: ۳۳۴۶؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۱۲۱، عن انس بن مالک۔

فوالله! ما هو الا ان قد شرح الله صدر ابی بکر فعرفت انه الحق۔ ۱
”تو خدا کی قسم، نتهاجی، لیکن یہ کھول دیا تھا اللہ نے ابو بکر کے سینہ کو، تو میں نے جان لیا کہ وہی حق ہے۔“

۲ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جگہ یا مامد میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے اس وقت حضرت عمر بن الخطاب نے آ کر حضرت ابو بکر صدیق بن علیؑ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر سمجھا لکھ لیا جائے حضرت ابو بکر بن علیؑ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمر بن علیؑ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابو بکر بن علیؑ کی سمجھ میں بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابو بکر بن علیؑ کہتے ہیں:

فلم ينزل عمر يراجعني حتى شرح الله صدرى لذلك ورأيت فى ذلك
الذى رأى عمر. ۲

”تو عمر بن علیؑ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمر بن علیؑ کہتے تھے۔“

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورہ زمر کے حوالہ سے گزرا، نور بانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لیا جائیے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صدر اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صدر اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً: علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوگا جس کو مفعول بنایا ہے، لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا ایک جگہ قرآن میں ہے: (يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا فِينَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ) (۳۰/الروم: ۷) ”وَهُدِيَاتُ دُنْيَا كَاظِهِرِيَّہٖ ۚ“ جانتے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے لیعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں، لیکن درستی بھی ہے: (لَهُنَّ يَسْتَوْى الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۚ) (۳۹/الزمر: ۹) ”کیا جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔“

۱ صحیح بخاری، کتاب الزکوة، باب وجوب الزکوة: ۱۴۰۰۔

۲ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن: ۴۹۸۶۔

یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں، بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں: ”هُوَ يَأْمُرُ وَيَنْهَا يُعْطِي وَيَمْنَعُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى“ کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالنے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے، یا قریبی سے سمجھا جاتا ہے، مثلاً: اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، یا جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعین زکوٰۃ کے قوال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے، اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیا ﷺ کے لئے سینہ کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیا کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اور بتیں سے عام امت اور انبیا کے فرقی مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتی ہے اور انبیا کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقوں پر لئی اور لکھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں ”میرے لئے میرے سینہ کو کھول دئے“، اور آنحضرت ﷺ کے لئے خداۓ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا“، سوال یہ ہے کہ ”میرے لئے“ اور ”تیرے لئے“ کے اضافی کی ضرورت ”اور اس لام“ کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشیری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تمکیک کے بجائے لام افادہ ہے ॥ جیسا کہ 『خلق لکم ماما في الأرض جميعاً』 (۲۹: البقرة) میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجوہ کو تیرے لیتی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لیے یا تائید کرنے کے لیے، یا فائدہ کرنے کے لیے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لیے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نہیاں ہوگا تو دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو ”اعمال و اقوال“ اور ”احادیث و سنن“ کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی

تفسیر کشاف، تفسیر سورہ الانشراح، ج ۲، ص ۱۶۱۸ میں علامہ مجذوبی کی یہ تعریف موجود ہے۔

شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور، شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وجی الہی نے اپنی کتاب الہی کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آقویں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیضیاب ہوں وہ علی قدیر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطاط مخصوص ہے، اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطاط سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے دستی سے یہ رتبہ خلفاء راشدین، اکابر صحابہؓ، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتهدین عظام اور علمائے اعلامؓ کو ہمیشہ کے لئے ملتارہا اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یا بعلوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے۔ فرمایا:

﴿لَا مُحْكَمٌ يُهْلِكَنَكَ لِتَعْجِلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَةً وَقُرْآنَهُ فَإِذَا أَفَرَأَنَهُ فَأَتَيْهُمْ فُرَأَنَهُمْ لَمْ يَرْأُوا﴾

إِنَّ عَلَيْنَا إِيَّاهُهُ ﴿٧٥﴾ (القيامة: ١٦-١٩)

”تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے، تاکہ تو اس کی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے، ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو تو اس پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔“

اس ”بیان اور شرح“ کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر عمل سے پوری ہوئی ہے جو عمل تواتر سے محقق اور احادیث اور سنن کے مستند فخر میں موجود ہے۔ یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا،

حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْبِرْكَةَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَكَبَّرُونَ﴾

(الحل: ٤٤)

”اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتنا رہی، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتنا را گیا ہے، تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔“

”بیان“ اور ”تبیین“ کے لفظی نقی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرا توضیح و تفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ ”تبیین“ اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تیزی کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے، سیاق و سبق

اور موقع محل سے ہو سکتی ہے، مثلاً: ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابَ قُدْ جَاءَكُمْ رُسُولُنَا يَسِّينَ لَكُمْ كَثِيرًا إِمَّا لَذُمٌ تَّخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْقُلُونَ عَنْ كَثِيرٍ﴾ (۱۵ / المائدۃ)

”اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا، کہ کتاب کی جواباتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کر دے اور بہت سی باتوں سے درگز کرے۔“

یہاں ”تبیین“ صریح طور کے اختلاف میں ہے اس لئے یہاں ”تبیین“ کے معنی یقینی طور پر ”اطہار اور اعلان“ کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورہ محل میں اس طرح آیا ہے:

﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لِهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ لَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ﴾ (۶۴ / التحلیل)

”اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتنا ری، لیکن اس لیے، تاکہ تو واضح کر دے اس کو، جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیے راہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتنا رہ۔“

اختلاف کے مقابلہ میں اطہار اور اعلان کی نہیں بلکہ تو پڑھ و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ تو پڑھ و تفسیر کے بعد دوڑ ہو جائے اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اس سورہ میں ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْبَيِّنَاتِ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا تُزِيلُ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقَدَّمُونَ﴾

(۴۴ / التحلیل)

”اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتنا رہ، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتنا را گیا تو اس کو ان کے لیے کھول کر بتا دے، شاید کہ وہ سوچیں۔“

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے ہیں، ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امرِ مخفی کا اطہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے لیے نہیں اور غور و فکر کے لیے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اطہار اور اعلان کی اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لیے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے ہیں۔

اراست

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے، جو ایک طرف

اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو ناقص قانون میں ہوتے ہیں گواں کو تمام تر درج نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے لفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقش کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشرح و تبیین کرادی گو انسانی ذرائع و حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشرح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشرح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیفہ اس سے بھی زیادہ عیتیں اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلافائے راشدین ہی نے اپنے اپنے عہد میں ان نوبو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اولاد وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور ارادت الہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا مأخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فہرست اور مجتہدین نے اختیار کیا، ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مثال اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر، احسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج ”فقہ اسلامی“ کہلاتا ہے۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَعْلَمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرْسَلْنَا اللَّهُ ط﴾

(٤ / النساء: ١٠٥)

”ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ تو لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوچھائے اس کے ذریعہ سے فصلہ کرے۔“

اس کتاب الہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور تواتر میں کوئے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تھجھ کو سوچتا ہے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر، اللہ تعالیٰ کا اینے پیغمبر کو یہی سوچنا اور دھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام

کے قانون کا وحی الہی کے بعد دوسرا مأخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل والنصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکتا تو وہ ثال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيُحَكَمْ بِيَنَّهُمْ إِذَا فَرِيقٌ فَنُهُمْ مُغْرِضُونَ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمْ أَحَدٌ يَأْتُوَ إِلَيْهِ مُذْعِنٌ فَإِنِّي قُلُوبُهُمْ مَرْضٌ أَمْ إِنَّا بِأَمْرِ يَحْكُمُونَ أَنْ يَجْعِفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا كَانَ قَوْلُ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيُحَكَمْ بِيَنَّهُمْ أَنْ يَقُولُوا إِسْمَاعِيلَ وَأَطْعَامًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُغْلَبُونَ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْخَشَ اللَّهُ وَيَتَقْبَهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَابِدُونَ﴾ (۴۸/النور: ۵۲)

”اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں سے کچھ لوگ من موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرمائیں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یقینی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلا یا جائے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا، انہیں لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈر تار ہے، اور اللہ سے نجع کر لئے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔“

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا لَمْ يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا إِنَّمَا قَضَيْتَ وَيَسِّلَمُوا سَلِيمًا﴾ (۴/ النساء: ۶۵)

”تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مون نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خلی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔“

﴿وَمَا كَانَ لِيُؤْمِنُ وَلَا مُؤْمِنٌ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَيْرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (۳۳/الاحزاب: ۳۶)

”اور موسیٰ مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے، تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گراہ ہوا۔“

یہ اطاعت اور مطلاقاً سرا فگنگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حکم وقت اور سلطان زمانہ کے لیے نہیں، یہ انہیاں لیلۃ النبی کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزوی شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعے نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم بہوت، نور بہوت، فیضِ حکمت، شرح صدر، تبیین حقيقة اور ارایت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعے فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ اپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے حکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انسانی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشواؤ اور ہادی و راہنماء فرمایا ہے یعنی بہوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات بجسم ہدایت و راہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و راہنمائی کے دوچار غوش ہوتے ہیں، جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہودا پیشی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ لَطَّيْعَةَ قَرِيبًا مَّا مِنَ الظَّرِيفَةِ إِذَا دَرَأَتْكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ
لَكُفَّارِينَ وَكَيْفَ تُكَفِّرُونَ وَإِنَّمَا تُنَزَّلُ عَلَيْكُمْ أَيُّهُنَّ الظَّالِمُونَ فِيْكُمْ رَسُولُهُمْ﴾

(آل عمران: ۱۰۰-۱۰۱)

”اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے درآئماں کیم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔“

آیت کے آخری مکملے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس

تحسیں ایک تو آیاتِ الہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسرا خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیض صحبت اور اثر سے ان کو بیکھنے نہ دے گا اور خلافالت سے مانع آتا تھا اگر صرف کتابِ الہی اس کتاب کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی بھی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ ﷺ نے جمۃ الوداع سے والہمی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

((انی تارک فیکما الشقلین کتاب اللہ وستی)) ﴿۱﴾

”مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔“ (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

ترکیہ

انبیاء ﷺ کا عالم اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف ترکیہ ہے، ترکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمد یہ ﷺ کے اس وصف کا ذکر ان آقوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیرا و صاف پہلے دو وصف سے الگ ہے یہ پاک و صاف کرنا، آیاتِ الہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ محبت، حسن اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے ایچھے، بد نیک اور اشرار، اشیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء ﷺ کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بد کار قوموں میں مبعوث ہوئے ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سیئیں، مصیبیں جھیلیں اور آختر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا ان کا یہ وصف ترکیہ، وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الہی سے مترنم ہو یا خاموش ہر آن آفتاب حق کی کر نیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرز میں کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

﴿۲﴾ یہ روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کمی کتابوں میں ہے۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب: ۶۲۲۵؛ ترمذی: ۳۷۸۸؛ دار می: ۳۳۱۶؛ موطا امام مالک: ۱۶۶۲؛ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹۔

اس لیے نبوت کا سینہ صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا جسم پر ظلمت کدھ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وجی ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندر ہے دیکھتے، مگر اہل پاٹے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں خدا آپ کو مناطب کر کے فرمایا گیا:

(يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًّا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسَرَاجًا مُّنِيرًا)

(۴۶، ۴۵) (الاحزاب: ۳۲)

”اے نبی! ہم نے تجوہ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلاں والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔“

یا اس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول ﷺ کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان، زبان و دل، علق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنابدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی روایت

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوت سامنے سے نداۓ غیب کو سنتے اور صدائے وحی کو سماعت کرتے ہیں اسی طرح ان کی آنکھیں بہت سچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

(وَكَذَلِكَ نُرِيَ إِبْرَاهِيمَ مَلَائِكَةَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُؤْفِنِينَ)

(۶/ الانعام: ۷۶)

”اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔“

استعداد نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لیے یہ روایت و بصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت ﷺ کے مشاہدات روحاں کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

(لِتُبَيِّنَ مِنَ الْيَتَأَمَّلُونَ) (۱۷/ بنی اسرائیل: ۱)

”تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔“

دوسرو جگہ ہے:

(مَا كَذَبَ الْفُوَادُ مَا رَأَىٰ وَمَا تَرَوْنَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ وَلَقَدْ رَأَهُ نَزَلَةٌ أُخْرَىٰ)

(١٢-١١/٥٣)

”دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، اس پر اس سے جھوڑتے ہو اور دوسرا بار اس کو اترتے دیکھا۔“
﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ أَيْتَ رَبِّهِ الْكَبِيرِ﴾

(١٨، ١٧/٥٣)

”لگاہ نہ بھکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔“

ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ يَالْأَفْقَى الْمُبِينِ﴾ (٢٣/التکویر: ٨١)

”اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کناروں میں دیکھا۔“

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسِ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماع غیب

جس طرح آیات و مکتوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسِ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسِ بصارت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے **﴿وَكَلَمَ اللَّهُ مُؤْسَى تَكْلِيمًا﴾** (٤/السَّاء: ١٦٤) اور خدا نے موئی سے بات کی۔“

حضور کو حکم ہوا:

﴿وَلَا تَنْجَلُ إِلَّا قُرْآنٌ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُعْظَمَ إِلَيْكَ وَحْيٌ﴾ (٢٠/طه: ١١٤)

”اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجوہ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔“

خدانے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سینیں ”آدیں“ ہم نے پکارا، ہار بار یہ الفاظ ق آن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبیغ و دعوت

نبی کا سب سے پہلا اور ہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے، اس سے اور لوگوں کو بھرہ درکرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ جو لوگوں کو سناد دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو ختنی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی

پیش آئے اس کو راحت جانتا، جو مصیبت درپیش ہواں کو آرام سمجھنا، جو کانے بھی اس وادی میں اس کے تکوں میں چھیس ان کو رگل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سراخاۓ اس کو کچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سگر را ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضا مندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء ﷺ کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسروں نیکیوں کا اس طبع زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلا واسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہیں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنے فرض خود کو سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء ﷺ، جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کو پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل کر نہ فہموں کو حقیقت سمجھاتے اور انہوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔ انبیاء ﷺ کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

﴿إِلَّاَذِيْنَ يُّلِّيْغُونَ رِسُلَتِ اللَّهِ وَيَكْثُرُونَ وَلَا يَكْثُرُونَ أَحَدًا إِلَّاَ اللَّهُ طَوْكَفِي بِاللَّهِ حَسِيْبِيَّاً﴾

(الاحزاب: ۳۹)

”جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب اعمال کے لیے۔“

حضرت موسیٰ ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

﴿إِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغِيَّاً﴾ (۲۰ / طہ: ۲۴)

”فرعون کے پاس جا کر اس نے سرکشی کی۔“

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام رباني کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ تمہاری حفاظت کا خود شہنشاہ عالم ذمہ دار ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أَنْوَلَ إِلَيْكَ مِنْ رِبِّكَ طَوْ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسُلَتَكَ طَوْ وَاللَّهُ يَعْلَمُكُمْ مِنَ النَّاسِ طَوْ﴾ (۵ / المائدۃ: ۶۷)

”اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترے ہے، اس کو پہنچا دے اور اگر یہ نہ کیا

تو، تو نے اس کے پیغام کو پہنچانے کے فرض کو ادھریں کیا، اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔“
انبیا کی تبلیغ و دعوت میں تفسیر اور انداز اردوں ہوتے ہیں، تفسیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا
اور انداز ار لیعنی خدا کے جلال سے ڈرانا عذاب الہی کا خوف دلانا اور ان کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرتا اور انبیا
کی آمادشان سے ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں بر جھت تمام ہو جائے:

﴿رَسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ يَعْلَمُونَ لِتَابِسٍ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرَّسُولِ ﴾

(٤) النساء: ١٦٥)

”یہ پیغمبر خوش خبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے خدا برکوئی جدت نہ رہے۔“

ان سب نے پیغامِ الہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیرخواہی، دلسوzi و اخلاص مندی کا اعلان کیا:

﴿أَبِلْعَكْمَرِسْلَتْرَنِي وَأَنَالَّكْمَنَا صَحْمَأَمِينٌ ﴾ (٧/ الاعراف: ٦٨)

”میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمہارا اہانت دار خیر خواہ ہوں۔“

﴿يَقُولُ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ بِرِسَالَةِ رَبِّكُمْ وَنَصَّحْتُ لَهُمْ وَلَكِنْ لَا يَجِدُونَ النُّصْحَيْنَ﴾

(٧٩: الاعراف)

”اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری خیرخواہی کر چکا، لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔“

﴿إِنَّ قَوْمًا لَقَدْ أَلْغَاثُمْ رَسُولَنَا رَبِّنَا وَنَصَّاحُتُ لَهُمْ فَكَيْفَ أَسِي عَلَى قَوْمٍ كَفَرُيْنَ ﴾

(٧/الاعـافـة: ٩٣)

”اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیرخواہی کر چکا، تو پھر کسے نہ مانے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔“

یہ بھی فرمایا کہ

﴿لَا سُلْكٌ لِمَنْ عَلَيْهِ أَجْرٌ إِنْ أَجْرٍ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي﴾ (١١ / هود: ٥١)

”میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو خدا پر ہے، جس نے مجھ کو یہاں لے کر آکیا۔“

»لَا أَسْكُنُمْ عَلَيْهِ مَالًاٌ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ« (١١ / هود: ٢٩)

”میں اپنی تبلیغ کے بدلتم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔“

ایک شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھتے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ ”رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے“ اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بیانوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف ”وجی الہی کی تبلیغ ہے“ یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بیعثتہ پہنچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریع اور مطالب کی توضیح کا نہ اس کو منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ برکی ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریع کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بندگا فائدہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ ”رسول“ سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے، کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، ”نبی“ (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ذرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، بھائی (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا)، مزکی (پاک و صاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ برکی طرح کوئی سردا ر نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریع و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور نہ اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعا کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریع کا اس کو حق تھا، ﴿إِنَّ هَذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ﴾ (۲۸/۵) (عن: ۵) ہم نے پچھلے صفات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے استباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کو بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہو گا لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے، کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارع قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جو جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریع کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضح قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارع ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرے جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغام برکو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریقہ کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا، حکم ربی ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتوں جن کے معنی یہ ہیں، کہ ”ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے“ ان کا میشانہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوش خبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، راجهنا اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار، اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے:

﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِّرٌ﴾ (۱۳/الرعد: ۷)، ﴿۷۹/النازعات: ۴۵﴾

”تو صرف ڈر سنانے والا ہے۔“

ایک جگہ ہے:

﴿إِنَّمَا أَنَا مُنذِّرٌ﴾ (۳۸/ص: ۶۵) ”میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔“

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں:

﴿أَكَمَّا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلْمُ الْمُبِينُ﴾ (۵/المائدۃ: ۹۲)

”ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچادیتا ہے۔“

کام مفہوم نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رسان اور مقصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچادیتا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزرگوں کو مسلمان بنادیانا نہیں، جبراً مسوانیلینا نہیں اور نہ پیغام پہنچادیتے کے بعد تمہارے کفر و انکار و عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتوں آئی ہیں، ان کا مشاہدہ اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

﴿وَقَلَ لِلّٰهِيْنَ أُوْلُو الْكِتَبِ وَالْأَمْمَيْنَ عَآسْلَمُمْ طَ قَلَنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَكَلَنْ تَوَلَّوْا﴾

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْمُ طَ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعَبَادِ﴾ (۲۰/آل عمران: ۳)

”کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے، کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا ہدایت پائی، اور

اگر منہ پھیر اتو تجوہ پر (اے رسول ﷺ) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔“ مفہوم بالکل ظاہر ہے، کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردست نہیں، اگر لوگ قول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول ﷺ کا کام صرف پیغام پہنچادینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا اس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں:

﴿فَإِنَّمَا عَيْنَكَ الْبَلْغٌ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (۴۰/الرعد: ۱۳)

”تو یہ افرض صرف پیغام پہنچادینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔“

اس کی مزید تفصیل سورہ غاشیہ میں ہے:

﴿لَفَدَّكُرْتُ إِنَّمَا أَنْتَ مُذْبِحٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِعُصْبَرٍ إِلَّا مَنْ تَوَىٰ وَكُفَّرَ قِيَعَبَهُ اللَّهُ

الْعَذَابُ الْأَكْبَرُ إِنَّ إِلَيْنَا إِلَيْهِمْ تُمَرَّانٌ عَيْنَنَا حَسَابُهُمْ﴾ (۲۶-۲۱/الغاشیہ: ۸۸)

”تو (اے پیغمبر) اتو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا، تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور نہیں پران کا حساب ہے۔“

یہی مفہوم سورہ شوری میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما، داروغہ اور فرمادبا کرنیں بھیجا گیا، کہ لوگوں سے بزو را پی بات مولے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَهَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَقِيقًا إِنْ عَيْنَكَ إِلَّا الْبَلْغٌ﴾ (۴۲/الشوری: ۴۸)

”تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجوہ کو ان پر تنگہ بان بنا کرنیں بھیجا، تیرا کام صرف پہنچادینا ہے۔“

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹالیا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچادینا ہے، ماننے نہ ماننے کا

تمہیں اختیار ہے:

﴿قَالُوا مَا أَنْتُمُ إِلَّا بَشَرٌ قَتَلْنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمُ إِلَّا كَذَّابُونَ قَالُوا

رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمْ يُسْأَلُونَ﴾ (۳۶/یس: ۱۵-۱۷)

”کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتنا را، تم جھوٹ کہتے ہو،“

رسولوں نے جواب دیا، ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارا فرض

صرف کھول کر پہنچادینا ہے۔“

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے، کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں

کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں، بلکہ ان تک ہمارا پیام پہنچانا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهِ مِنْ شَيْءٍ تَحْمُنُ وَلَا أَبْأُدُنَا وَلَا

حَرَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَ الرَّسُولِ إِلَّا
الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿٤٥﴾ (١٦ / النحل: ٣٥)

”اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کوئی پوچھتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، کیا ہمارے پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟“

﴿وَإِنْ تَلْكِيدُوا فَقَدْ كَذَبَ أَمْمَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴽ٤٦﴾

(١٨ / العنكبوت: ٢٩)

”اگر تم جھٹاؤ، تو (کیا ہے)، تم سے پہلے بھی تو میں جھٹا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔“

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علم الغیوب جو چاہے سو کرے:

﴿مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴽ٤٧﴾ (٥ / المائدۃ: ٩٩)

”رسول پر نہیں ہے، لیکن پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے، جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔“

باقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ رَبَّكُمْ فَاعْلَمُ أَنَّهَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴽ٤٨﴾ (٥ / المائدۃ: ٩٢)

”اور اللہ کافرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔“

﴿فُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّهَا عَلَيْهِ مَا حُوِلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُسِنَتِ الْمُطْعَنَاتِ ﴽ٤٩﴾

﴿وَإِنْ تُطِعُوهُ تَهْلِكُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴽ٥٠﴾ (٢٤ / النور: ٥٤)

”کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں، تو رسول پر وہ ہے جس کا اس پر بوجہ ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجہ تم پر ہے، اگر اس کی اطاعت کرو گے توہ دیت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔“

﴿كَذَلِكَ يُعَذِّبُ عَمَّا هُنَّ عَلَيْهِمْ لَعَذَابُهُمْ سُلْطَانٌ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّهَا عَلَيْكُمُ الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴽ٥١﴾

(١٦ / النحل: ٨١، ٨٢)

”اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا، تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔“

﴿وَأَطِیْعُوا اللَّهَ وَأَطِیْعُوا الرَّسُولَ، فَإِنْ تُكَلِّمُ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِینُ﴾ (۵۰)

(۱۲/التغابن)

”اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔“

پیغمبر کا قول ہے:

﴿فَإِنْ تُوَلُوا فَقَدْ أَبْغَثْتُمْ هَذَا أَرْسَلْتُ إِلَيْكُمْ﴾ (۱۱/ہود: ۵۷)

”تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔“
(یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آئیوں کا تعلق نبوت کے مکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لمحاظ کے قابل ہے، کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے، اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں، بلکہ امر و نہیں بھی کرتا ہے، کوئی حکومت، دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزرور مجبور کیا جائے گا، کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء ﷺ کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا اوس اور عمل کی پرسش، اس لمحاظ سے انبیاء ﷺ کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لیے فرمایا کہ ﴿شَرْعٌ لِكُلِّ مِنَ الِّذِينَ مَا وَطَّى يَهْ نُوحًا﴾ (۴۲/آلیۃ) (۱۳: الشوری) یعنی ”خدانے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جنون و غیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے۔“ لیکن انبیاء ﷺ کی تعلیم کا ہم الاصل اور سب سے ضروری جزو توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازالی تراث ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں، ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی و عقلي بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں، یا ہندوستان کے اوتار، لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں، تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں، کہ پیغمبر اس تعلیم کی پہچان ہی تو حید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحَى إِلَيْهِ أَنَّهُ لِإِلَهٖ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (۵۰)

(۲۱/الانبیاء: ۲۵)

”اور ہم نے تمھے سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن ان کو یہ دھی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں،“

میری ہی پرستش کرو۔“

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا إِنَّا عَبْدُهُ وَاللَّهُ وَاجْتَبَيْوَا الظَّاغُوتَ﴾

(۱۶/النحل: ۳۶)

”اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا، کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعا نبوت کی تبلیغ کا ہم ترین جزو تو حیدر نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیاء ﷺ کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خلیفانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے، جس کو مدعا ظاہر کرتا ہو، نہ کہ گواہ۔

انبیاء ﷺ کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز آئندہ کے بھولے ہوئے ازلي عہدو پیمانہ بندگی کی یاد رہانی ہے:

﴿إِذَا آخَذَ رَبِّكَ مِنْ بَنَى أَدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيْتُهُمْ وَأَشَهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ إِنَّهُمْ
بِرَبِّكُمْ قَالُوا يَا إِنَّا شَهِدْنَا أَنْ نَّقْتُلُو أَيَّمَ القيمةِ إِنَّا لَنَا عَنْ هَذَا غَفِيلُونَ﴾

(۱۷۲/الاعراف)

”اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی بیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی، کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔“

اس لیے ضروری ہوا کہ ان کو موقع بمحوق ان کا یہ وعدہ یاد دلا لایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے، کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام جدت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا، اس لیے فرمایا:

﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لَا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرَّسُولِ﴾

(۴/النساء: ۱۶۵)

”رسول خوشخبری سنانے والے اور ذرا نے والے، تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی جدت باقی نہ رہے۔“

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور راہنمائی ہے، کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے

مظہر اور مورد ہیں، اسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لیے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا:

﴿وَلِكُلٍّ قَوْمٌ هَادِيٌّ﴾ (الرعد: ۷)

”اور ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا۔“

سورہ شوریٰ میں فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْكِنِيٍّ﴾ (الشوری: ۵۲)

”اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔“

سورہ انبیا میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَيُّهَةً يَهْدُونَ يَا مُرْسَلِنَا﴾ (الانبیاء: ۷۳)

”اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوایا تھا، جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔“

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جوان کو دی گئی تھیں، بار بار ہدیٰ (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو

خیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور راہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ وہ بندگان الہی کو باطل کے اندر ہیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لا تے ہیں، انسان جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انہی ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لا تے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَى عَبْدِهِ آيَاتٍ يَبَيِّنُ لِتَعْبُرِ حَمْدَهُ قِنَ الظَّلَمَتِ إِلَى التُّورٌ﴾

(الحدید: ۹)

”وَهِيَ اللَّهُ جَوَابُنِي بَنْدَهٖ پَرَكَلَ آیَتِيں اتارتا ہے، تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لاۓ۔“

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تغیری پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد و نماہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو و جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلاہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا اتفاق کاراس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حریت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے، جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حریت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:

﴿وَالسَّمَاءُ رَفِعَهَا وَأَضَمَّ الْبَيْزَانَ ﴿۶﴾ أَلَا لَكُلُّهُو فِي الْبَيْزَانِ ﴿۷﴾ وَأَقْيَمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا

تُخْسِرُوا الْجَيْزَانَ ۝) (٥٥ / الرَّحْمَن: ٩٧)

”اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور قول کوٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔“

یہ توازن اور برابر قول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی قول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہوئی چاہیے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور بالا ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طہانتی اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کا نظام درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَيْنَا بِالْبُيُّنَاتِ وَأَنْذَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَعْلَمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

(٥٧) / الحدید: ٢٥

”ہم نے بے شہہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اساتری، تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔“

انہیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پر شور بنادیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوہ و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہی دخیلی مباحثت سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی چجائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چکتی ہے، وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلی ہے، کوئی دین دار ہو یا مخدود، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحرائی کا دشتی، رومی ہو یا یازگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، بھوی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو، یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربیانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم، یا یورپیں فلاسفہ کی تعلیم و تصنیف و تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی،

نیکوکاری، حسن غلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسول کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے مطابق ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے مذکور ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقتدر اور معترف ہیں، اسی لیے انہیاں علیهم کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار حسنة و هدیٰ، رحمت اور راہنمائی کی غرض سے بھیجے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تراہی غرض و غایت کی تشریح ہے، اسی لیے خاتم نبوت محمد رسول اللہ علیہ السلام کی ذات والاصفات تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آئی، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۲۱/الأنبیاء: ۱۰۷)

”اور ہم نے تجھ کو (اے محمد) انتام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

تاسید و نصرت

انہیا علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ، خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا:

﴿وَلَقَدْ سَيَّقَتْ كَلِمَتَنَا لِعِصَادِنَا الْمُرْسَكِينَ ﴿۱۷۳﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمُسْتُؤْدُونَ ﴿۱۷۴﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَلِيلُونَ ﴿۱۷۵﴾﴾ (۳۷/الصفت: ۱۷۱-۱۷۳)

”اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیے پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا شکر غالب ہوتا ہے۔“

نصر اس دنیا میں بلکہ جھر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی:

﴿إِنَّا لَنَصْرَرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ أَمْنَوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ إِنَّمَا لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَهُمْ سُوَّدُ الدَّارِ﴾ (۴۰/المؤمن: ۵۱، ۵۲)

”اور بے شبه ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے، جس دن گناہ گاروں کو ان کے بہانے کا منہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لیے برآگھر ہوگا۔“

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھانی نہیں دیتی اور عذاب میں دری ہونے کے سبب سے ان کے مذکریہ بمحنت لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی حکمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعۂ امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تاسید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیے کھول دیے جاتے

ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا:
 ﴿ حَتَّىٰ إِذَا أَسْتَيْسَ الرُّسُلُ وَظَاهِرُوا أَكْفَمُهُمْ قَدْ كُلُّذُّ بُوْجَاءُهُمْ نَصْرَنَا ۚ ﴾

(۱۲) / یوسف: (۱۱۰)

”یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوس ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری بدداگئی۔“

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت و حفاظت دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے رسولوں کو تھیلیوں پر لیے بھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر، تبغیخ و خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آ ماہ نہیں ہوتے، منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تہائی کو دیکھ کر، ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوئے ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

﴿ فَلَا يَحْسِنَ اللّٰهُ خُلِفَ وَعْدَهُ رُسُلُهُ ۚ ﴾ (۱۴) / ابراہیم: (۴۷)

”سو تو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔“

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخریت ہوگی:

﴿ لَكُتبَ اللّٰهُ لَا يُغْلِبُنَّ أَنَا وَرُسُلِّي ۚ ﴾ (۵۸) / المجادلة: (۲۱)

”اللہ کھچکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔“

خاتمه: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا:

آبگینہ راز گوہر واشناس

فلسفی را از پیغمبر واشناس

جزدمے کہ گوہرے آری بدست

آبگینہ رانہ پنداری بدست

آبگینہ شدیسیہ چون پر زاغ

چون گھر آمد بدست شب چراغ

نر دبان دارد بخور شید بلند

فلسفی اندرین چاہ نژند

پس بخاک افتدى گون گشته سرش

نر دبانش می برد تا چند ارش

رشته افگنندہ سونئے خاکیاں

و آن پیغمبر خود زبام آسمان

پس برآ تابارگاہ آفتاں

رشته جاں رابدین رشتہ بتاں

فلسفی از خاک پرواڑت دہد

زاں مان پیغمبر آوازت دہد

ایں زدورت رہ نماید سوئے جاں

وان بخواند خود ترا از کوئی جاں *

* از دیوان فارسی مولانا حمید الدین بیہقی التوفی ۱۹ جمادی الثانی ۹۳۲ھ (۱۹۲۰ء)، نوائے پہلوی، ص ۲۸-۲۹

شبِ ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی نہ ہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ حق ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پچانی جاتی ہے، بارش کی حکمت اس کے بعد ہی زیادہ خوشنگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاریخ میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو جلی کی چک اتنی ہی زیادہ درخشان نظر آتی ہے تو اس میں شب نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں بٹلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لیے پیغمبر انس دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرمائچے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُعَاوِنُونَكَ إِنَّمَا يُعَاوِنُونَ اللَّهَ ۚ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْمَانِهِمْ﴾ (الفتح: ٤٨)

”جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔“

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی معاشرتی دعوت تھی، اس بناء پر ہمیں دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرہ ارضی تھا جس پر آتاب نہیں چکتا تھا تو بالکل حق ہو گا، تمام دنیا میں سچ اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواتی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں بٹلا ہو کر اس طرح عضو مظلوم ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مراد فکر کھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی روکنے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ حق ہے کہ سچ نے چھ صدی قبل ترکیہ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی حق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر بدایت ونجات کی ایک شمع جلا تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طوبی بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی حق ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلاگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینوں سے سرد ہو چکا تھا یہ بھی حق ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ درت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ لکا تھا مگر حادث

کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحر اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برس پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی، نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خیش کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر معبر کی خوبیوں انسان کے جامدہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور جسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریخی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے مقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسانی کا منجات دہنندا، آخری بار و جود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں، جو عرصہ دراز سے پرا گنہ اور منتشر ہو رہا تھا، پھر ظلم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاک تھا، تفصیل کے لیے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت انسانیت پاریسہ بن چکی تھی خود عرب و مضائقہ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً: نابتی، حیری، سبائی وغیرہ مدت گزری کے ان کا خاتمه ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صحیح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنجالے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب جو سیاست تھا، جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسیٰ تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے میتوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدم امت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

محوس فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا، مگر عہد بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا، مسلسل بغاؤتوں، سفا کا نہ خوزہ زیوں اور سیاسی بد امنیوں نے اس کو تبدیل بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جو ہر کو، جس کے خیر سے قوم کی

زندگی کی تغیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں باہل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لشکر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نہیاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزد اور اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی محدود بُنیٰ، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے میسیحیت اور مجوہیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلفہ کا ایک ایسا گور کھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر تک اس قوم کو ٹکٹانا نصیب نہ ہوا۔ **❶** اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمه ہو جائے۔ **❷** اخلاقی حیثیت سے محرومات کا وجد ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیرہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بھن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ **❸** یہ سن کر کس قدر حیرت ہو گئی کہ یہ زدگر دشائی جو پانچویں صدی عیسوی کے اوسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر دالا۔ **❹** عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے، عورتوں کی بے وفاکی بد اخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پر اనے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلطین اور امراء رجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو مجیدے کیے جاتے تھے۔ **❺** ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی پیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی اور رعایا ان کے ظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔ ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائیٰ جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آوریزش کا مختتم سلسہ قائم تھا جب روی فتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تغیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے، اس کا ایک مختصر سانچہ تورا کے قصہ البریں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتاح عیسائیوں پر وہ جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گھن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرقاب قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا۔ **❻** قباد نے قید خانہ سے بھاگ کرتا تاریوں کے پاس

❶ کتاب الفہرست ابن ندیم ذکرمانی، ص: ۴۵۸ و ما بعد و کتاب البدء والتاريخ مقدسی، ج: ۴، ص: ۲۴۔

❷ تاریخ غرر الاخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پرس، ص: ۵۰۲۔

❸ ایضاً، ص: ۲۷ و ابو داود میں ہے کہ حضرت عمر بن عثمان نے اپنے زمانہ میں حرمیا کو مجوہیوں کو اس فعل شنیت سے باز کھا جائے کہاب الخراج والامارة والنفي، باب فی اخذ الجزية من المحووس: ۳۰۴۳۔

❹ مورخوں کی تاریخ عالم، ج: ۸، ص: ۸۴۔

❺ غرر الاخبار الفرس ثعالبی، ص: ۵۰۰ پرس۔ **❻** انیکو پیڈیا برنا یک طبع یار دھم، جلد ۲، ج: ۲۲۳۔

پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت پہنچ لیتی ہوئی کہ اس عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کی خاص شخص کی ملکیت نہیں بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔ اس نہ ہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج اور اشاعت میں غما یا حرص لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جواہر پر مسلکتا تھا، وہ ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشیں سرشار ہو گیا۔

۵۳ میں قباد کی جگہ نو شیر والا نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو پرمبارک لقب اپنے عنزیزوں اور انفرادوں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدلت ملا، مزدک فتنہ کو اس نے تکوar کے زور سے دبانا اور کیش زردی کیوں کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بینا نو شہزادیتیث پرستی کی طرف مائل تھا، اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زرد شیوں سے صفائرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۴ میں نو شیر والا نے وفات پائی اور ایران کا تخت، ہر مز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندر ورنی بدنظری اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تنافل شعاراتی اور امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ **۵۶** میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ تمثیلی ہوئی تھی، ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہو گا کہ ایران کی سرز میں نغمہ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوتی، اخلاق کے متعدد ابواب یہیں جوان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یہ دال و اہر من، فور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھیلوں نے ان کو ہمیشہ سرگردان رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخلیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ رض مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھادیا، انہوں نے جواب میں کہا: ”هم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسراے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔“

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیے کوئی

* غرر الاخبار الفرس ثعالبي، ص: ۵۹۸ تا ۶۰۰ پيرس۔ * تاريخ طبرى واقعات الحج، ۱، ص: ۲۷۴ مطبع بريل۔

دوسرا پرده تیج میں حائل نہ ہوا، ہر جان ملکم جن کا سمجھی تعصب، عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے ”قرا قان عرب“ کا لقب دلاتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

”یزد جرد خالث کا عہد حکومت اس لیے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تحفہ برہمن ”سونار خواروں“ کے ایک درستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغروہ، ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے، اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا (مسلمان) فارسی موئی خین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنابر اس واقعہ کو ایک مجذہ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد ﷺ کی صداقت کو ظاہر کر دیا تھا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فروزنظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت، جو عیش پرستی کے ہاتھوں لا غر و نحیف ہو چکی تھی، جس میں اندر وہی مناقبات کے باعث بدنظمیاں بھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر ختہ و ناتوان ہوا اور جو اپنی کبریٰ اور نقاہت سے قصر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لیے پر جوش ”قرا قان عرب“ کی مدافت کرنا سخت دشوار تھا۔“ *

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نزاد ساسانیوں کی خشگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری، قرا قان عرب یہ کی ترقی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گری نہیں باقی رہی تھی، نور و نلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی ”یزوں اور اہر مُن“ کی دو عملی حکومت نے روحاںی امن و امان کی سلطنت بر باد کر دی تھی، بیسوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم ما نوی فرقہ تھا، جو عیسائیت اور مجوسیت کا مجنون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا ** نوشروں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلمہ میں با دشاؤ عادل و دادگر کا خطاب پایا، تاہم ایران کی روحاںی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنیب رہی، جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خنک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجائے۔

عیسائی روم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحاںی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پرا گنہ تھے روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خور دنہ تھی حالانکہ یہ وہی رومتہ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد

* ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۱۳۲۔ ** تفصیل کے لیے تہرسٰت اہن ندیم دیکھو صفحہ ۹۷۸۰۔

دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تکمیلی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جو لیس سیز رکانام ہمیشہ کے لیے قیصری صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مراد ف بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں معموت ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنایا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہو گئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا، اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعاں کی خاک میں اصل عیسیویت ہمیشہ کے لیے فتن ہو گئی اور باپ، بیٹے، روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا اور تورۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے ۱۰ وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعا (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی، ۱۱ میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور فتح پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تسلیمی الوبیت میں ہر بیان ملک جو فتح ہوتا، اس کا دیوتا کی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا تھا تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ، کلیساوں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا اس کے لیے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کوئی رسولوں نے خدا کے دین کا خاک کے تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہرنی کوشش، نئی مذہبی تفہیق کا پیش خیمه ثابت ہوئی اور ایک عیسیوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۱۲ میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکسترا گ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی، ایمان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں اور باہمی ناقص اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دو یورپ ان حکومت کے حصے میں آئی ۱۳ ناقابل فرمان رواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوچھ، وڈاں وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملہ شروع کیے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسیوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۴ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے نیچے میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے بارہ کرسکوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے

۱۵ انجلی متن: ۵ - ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ - ۲۰ یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا تصریح نہ کرو ہیں۔

۲۱ گین کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، ج ۱، ص: ۴۸۸ - ۴۹۱۔

۲۲ ایضاً، ج ۲، باب ۳۶ و باب ۳۸

پورا ہونے کا وقت آگیا۔ مورخ گھنیں اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

”اس پیشین گوئی نے، جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمه پر جب کہ ہر طرف سے ذلت و بد قسمتی کا سامنا تھا، اہل روم کو یا اس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت، مخالفین کی نظر و میں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعرا ری تھی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصارف روزافروں تھے اسی نسبت سے لیکن میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔“

امری نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی تقلیل آمدی سے بھی محروم ہو گئی اس کی عدم ادا اپنی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمنے لگی اور رومن حکومت پر ہر وقت حشی سے حشی سلطنت کی حکومت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنادشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندر وہی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گھنیں کے الفاظ میں:

”اگر اس وقت روم کے تمام بیردنی و حشی مخالفین بھی فنا ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بر بادی سے چانہیں سکتی تھی۔“

پانچویں صدی کے خاتمه پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد، بشرتی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر درجنہ و میل تک کی سر زمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۴۲۵۰۰۰ تھی، اب شاہ حسنیں کے زمانہ (یعنی ۷۵ء) میں گھٹ کر ایک چوڑائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ ارہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و افتراء مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوں ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسروں جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرا سے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کر لے۔“

* ایضاً، ص: ۴۶۱۔ ** ایضاً، ص: ۴۶۱۔

*** حوالہ مذکور، ج ۳، ص: ۱۱۳۔

اندرونی بندیمیوں پر مستزدیہ تھا کہ یہ رونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لو مبارڈ، گوھس اور وندالس وغیرہ کے چیم حملے روم کی رہی سبھی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمه پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گپن کے اپنے زوال کے پست تین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گپن کی زبان میں اس کی مثال بجیئہ اعظم الشان درخت کی ہو گئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آبا دھیں مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور شہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تناخک ہو رہا تھا خود پا یہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھاپا ہوا تھا کہ تقریباً کل کار و بار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن راست چھپل پہل رہتی تھی اب دیراجہ اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرتو کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجدی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشغیل کر سکیں۔

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ لخراش تصویر نظر آتی ہے بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوچائیں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی عدائی کے معتقد تھے حضرت عیسیٰ اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کے لئے نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آگئی تھی یہاں تک کہ ۲۵۰۰ میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۲۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔

اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسارہ کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بناء پر شخص ہب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، ان پادریوں کے ایک استقف اعظم یہ نت سرل نے جو جو سفا کیاں کی ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کر دیا اور ان کا مال اس باب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معاذبز میں کے برابر کر دیے گئے، سرل کا حریف ارشس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارشس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا۔

سرل کی ایک خاتون دوست بلیشا نامی تھی ایک روز وہ اپنی درسگاہ

* گین، ج ۳، ص: ۳۷۲۔ * گین، ج ۳، ص: ۴۴۔ * اپنا، ص: ۳۲۷۔

سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتا کر کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھستیتے ہوئے اسے کلیداں میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیر کے گز سے اس کا خاتمه کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت بڈیوں سے جدا کیا گیا، غش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور آلاش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ **❷** یہ ایسے واقعات ہیں جن کے ذکر سے آج قلم ارضا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ٹکڑوں کی تھی جہاں روڈیوں کے زیر سایہ عیسیوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسیوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور راز صوبوں اور ٹکڑوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے، تائیں کی کنسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معمر کہ آ رائیاں ہوئیں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ”شہزادہ امن“ کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ و بر باد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو، نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار تقرار دیتے ہیں اپنی ”تاریخ ہندوستان“ میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

”اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو جریج کو بخس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان، جو جریج میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی میسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن، بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندر ورنی نزاکوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قصرِ فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطینی کے سیکی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لیے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمه کرنا چاہے، اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش اور ناروا دار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنہوں نے ان کے معبدوں آتش ششی“ کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے بر باد شدہ معبدوں اور ڈھنے ہوئے معبدوں پر ماتم کر رہی تھی اور ان کے انقام کے لیے آمادہ اور مستعد تھی۔“ **❸**

مارس صاحب خود واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی سمجھی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحبت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال موڑھیں کا بیان ہے کہ تیسرا صدی سے لے کر ساتویں صدی تک میسیحیت کی جو حالت رہی

❷ ایضاً، ص: ۳۲۷، ۳۲۸ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس صفحہ: ۱۵۵۔

❸ مارس کی تاریخ ہندوستان، ج ۱، ص: ۱۸۳۔

ہے وہ اس کے لیے باعث نگ ہے مشرکانہ رسم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل روی بہت پرستانہ عقیدوں نے سمجھی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیح کی ناسوتی اور لا ہوتی دو عضروں کی تحلیل، مصر کو قابو میں لانے کے لیے کی گئی تھی جس سے حضرت مسیح کے ”وہی ایک ہے“ کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ان کے مذہب سے مت گئی، ضعیف الاعقادی اس درجہ بڑھ کی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، ﴿ مسیح و مریم، روح القدس اور حوارین اور میسیحیت کے دیگر اساطیر کے مجسمے بنانے کا ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظریہ زمانہ با بعد کے رومی یکتوں فرقہ کی بہت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔ ﴾

یہ صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ”گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے نکڑے نکڑے کرڈا لے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمان میں اکثر وہ توہات جور و من چرچ کے لیے باعث نگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کیے گئے خصوصاً لیوں اور بھروسوں کی پرستش نہایت بے شری سے ہونے لگی۔ نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا، اور ایرنیس، سلینیس، نسطور نیس اور یونیکنیس کے جھگڑوں میں نکڑے نکڑے ہو گیا، انصاف علائیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بد عنوانیاں ہوتی تھیں، مغربی چرچ میں ڈنیس اور ارسلیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخڑ نیس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نیس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۷۷۱ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لیے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تھے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و اعتمام سے نکلتے تھے اور ان کے دستخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسمیں کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے خالفوں کو مارڈنا کوئی جرم ہی نہ تھا:

”بادشاہوں اور پادریوں میں عقاائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبدل ہو گئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہوا اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور غیاشی میں اڑاتے تھے۔“ عقاائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ قسطنطینی کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدی اور مظالم کے لیے مشہور تھے، آنحضرت ﷺ کے

سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج على المرأة: ۱۸۵۳۔

سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ، صفحہ: ۲۶، ۲۵۔

وقت تک ملک کا مغربی حصہ گلاتھ (GOTHS) لوگوں نے رونڈ الاتھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رویوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا، اس کی تصویر ڈرپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ ”دونوں (عیسائیت اور بہت پرستی) کی باہمی تکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گرتھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل مژملین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اضمام پرستی کا غصر مغلوط ہو گیا..... عقیدہ تسلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، مریم عذر اکتو (خدائی ماں) کا القب دیا گیا۔“¹

اسی زمانہ میں ایک گروہ ”مریمی“ کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم صلوات اللہ علیہ و آله و سلم و آمیتہ کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثالثہ!² کے، اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورہ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات روی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیے گئے اور نام بدل کر روی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسول، مقدس عیسائی کلیساوں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شدود میں پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنی پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشتہ ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔³

یہ تو مسکی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومی امپائر کی متحی میں مذہبی مناصب کے لیے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خوزیر یزجنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیے دوپاریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷۴ آدمی کام آئے۔⁴

اس سفرا کا نہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ حقیقی نیس غذا میں پادریوں کے دست خوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔⁵

سلطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیر و دوں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ

¹ مزرکہ مذہب و سائنس، ڈر پیر، ص: ۲۲، ۶۵۔ ² ایضاً، صفحہ: ۲۲، ۶۵۔

³ ایضاً، ص: ۲۶۔ ⁴ ایضاً، صفحہ: ۲۶۔ ⁵ ایضاً، صفحہ: ۲۸۔

ہوا کہ بد اخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سراستی کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے وردی کے ساتھ اپنے مسروقات لہو و لعب اور عیاشی میں اڑا لتے۔ ❶ پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿إِنَّهُ دُونَنْدُوْا أَجْبَارُهُمْ وَرَهْبَانْهُمْ أَرْبَابُهُمْ إِنْ دُونَنْ اللَّهُ﴾ (التوبۃ: ۳۱) ۹۰ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔“ دینداری کا سب سے اہم جزو تجدی زندگی اور رہنمائی تھی ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف وہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر جتلارکھنا، بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندر ہیری کوھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں، باپ اور عزیز و اقارب، دینداری و تقویٰ شعرا ری کی راہ میں کائنے تھے، ان سے پہیز، بلکہ ان سے نفرت، کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان

دنیا کے ان متعدد ملکوں میں جہاں کوئی بااثر نہ ہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندوویہ ک عہد، جودو ہزار سال قم سے لے کر تقریباً چودہ سو سال قم تک قائم رہا، دوسرا دور جنگ، یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوؤں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو سال قم سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما اور عقلمندان کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسح سے لے کر تقریباً تیسرا صدی قبل مسح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس نہ ہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمه تک رہا، پانچواں دور پر ایک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے، پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اوخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور ناقلوں سے معسور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:

❷ شرک جوابنداہی سے ہندوستان کے خیر میں داخل تھا اب وہ حد انتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۲۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۲۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔ ❸

❹ تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔ ❺ آری دلت کی ہندوستانی قدیمی جلد ۳، صفحہ ۲۷۶۔

۲ دیدک عہد میں اصحاب کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم راجح ہو گئی۔

۳ مندروں کے حافظین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔

۴ دیدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لیے بنا کر تھی۔

۵ عورتوں کو حکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔

۶ تو نہیں اس قدر غیر مقول و نامصنفانہ وضع کیے گئے جن سے علانية بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جرس تم مقصود تھا مثال کے لیے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) بہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی لگنیں جراحت کا مرتكب رہ چکا ہو سزا موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اوپنی ذات کے مرد کا کسی پنچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ را ہبہ کی عصمت دری کی سزا میں پکھ جرم آنکھ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ه) اگر کوئی پنچی ذات والا اپنے سے اوپنی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کرڈا ناچاہیے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔

۷ راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے راجح تھی اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامد عصمت اتار ذاتی تھیں۔

۸ شاہراہوں پر آوارہ گرد اور جراحت پیش افراد کا مجھ لگا رہتا تھا۔

۹ خدا کی تلاش آپادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو سخت سے سخت ایسا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

۱۰ اوہام و خیالات فاسدہ، بھوتوں پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا نہ ہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سر بخود ہونا ان کا دھرم تھا۔ جتوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا شہر اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب

۱ آری دت کی ہندوستان قدم جلد ۳، صفحہ: ۲۸۱۔ ۲ ایضاً، ص: ۲۸۳۔ ۳ ایضاً، ص: ۳۰۷۔

۴ ایضاً، ص: ۳۳۱۔ ۵ ایضاً، ص: ۳۳۲، ۳۳۳۔ ۶ ایضاً، ص: ۳۶۹۔

۷ آری دت کی ہندوستان قدم، صفحہ: ۳۶۹۔

سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپشا کرنے والے جو گوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر افسوس آتا ہے ۔ اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سنہہ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں ان کے معبدوں میں پچاری عورتوں اور دیوادیسوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں ۔ وہ حدود جہہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور نہ ہی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جو دوں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے ۔ وہ یوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں اور اسی لیے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتی ہو ناپسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر دلتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے ۔ نہ ہی تھواروں میں شراب پی کرایے بدست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرانی کی تیز باتی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ تنکی کام سمجھتے تھے۔ شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں بنتا تھا کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسمہ پگھلا کر دال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی یو یوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذائقوں پر تھی۔ عورتیں فردخت کی جاتی تھیں۔ اس مختصر سے خاک سے معلوم ہوا ہو گا کہ ابتدئے اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھوی بھی شیطانوں کے اس جاں میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہو سکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الہی کی امانت داری، اس لیے قرآن نے ان سے کہا: ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوْلَى كَافِرِيْهِ مَ﴾ (۴۱: البقرة: ۲) ”او سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الہی کے منکر نہ بنو“، مگر یہ قوم مخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پھرروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے پٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینے کا دل پتھری رہا۔ قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو عطفہ دیا:

﴿فَهُنَّ كَالْجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (۷۴: البقرة: ۲)

”ان کے دل پھرروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔“

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر دالا، حضرت

• دیکھو ابو زید سیرانی کا سفر نامہ، صفحہ: ۸۱، ۱۱۸، ۱۱۵ ایس و آثار البلاد فرزدقی، صفحہ: ۸۱۔

• سفر نامہ ابو زید، ص: ۱۳۰، اور احسن التقاضیں مقدسی، ص: ۴۸۳۔

• مہابھارت کے تصویر کا آغاز پڑھو۔

• سیار تھہ پر کاش سوال گیرا، ص: ۹۲۸، ۳۷۳ مطبوعہ سیوک اٹلیم پر لیس لاہور ۱۹۱۲ء۔

موی علیہ السلام اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہیں آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہوا اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بدعافہ کی ہو۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا:

﴿لَعْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَهُودَ إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى اُبْنِ مَرْيَمَ طَذِلَكَ يَهُوتَ عَصْمَوَةَ كَانُوا يَعْتَدُونَ وَكَانُوا لَا يَتَنَاهُونَ عَنْ مُثْنَدِرِ فَعْلَوَةٍ طَلِيْسَ مَا كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾

(۷۹، ۷۸ / المائدۃ: ۵)

”بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے، جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے تھے ان کا کام کتنا برآ ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے

میں کیا ہے۔ زبور ۸۷ میں ہے:

”اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوں، سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں، بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریار اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنادل مستعدنہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریایا کاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے، کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے، لئنی بار انہوں نے بیابان میں اس خدا سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا۔ تاں پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشۂ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی اور وہ میری ہی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔“

زبور ۸۸ میں ہے:

”اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجوہ پر گواہی دوں گا، اے بنی اسرائیل! اگر تو میری نے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں، جو تجوہ مصر کی سرز میں سے باہر لایا، اپنا منہ کھوں کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے لیس میں چھوڑ دیا۔“

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد علیہ السلام سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے متعلق یہ بدعا کی:

”کہ تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، وہ جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بد کرداروں سے عدالت رکھتا ہے، تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں تا بود کر دے گا، اے خداوند! اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں سراسر کھونا پن ہے اے خدا! تو انہیں ملزم جان، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گرجائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب سے نکال پھینک کر انہوں نے تجھے سر کشی کی ہے۔“ (زبور۔۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انہیں میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

”اے ریا کا رفقیو! اور فریسیو! تم پر افسوس کر تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی بذریعوں سے اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریا کار اور شرارت سے بھرے ہو۔“

”اے ریا کا رفقیو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنواراتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیانا بھرو، اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔“ (متی ۲۳-۳۲) (متی ۲۳-۳۲)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحُقْقِ ۖ ذَلِكَ يَبْأَسُهُمْ وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۚ﴾ (۶۱/ البقرة)

”او وہ ناحن پیغمبروں کو مار دلتے ہیں، اس لیے کہ وہ نافرمان اور حدستے بڑھنے والے ہیں۔“

﴿فَلَمْ يَقْتُلُونَ أَئِيمَّةَ اللَّهِ مِنْ قَبْلِ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝﴾ (۹۱/ البقرة)

”کہہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے۔“

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام

ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكُفِرُونَ بِأَيْمَانِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حُقْقٍ لَا يَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ

بِالْقُسْطِيٍّ مِنَ النَّاسِ لَا يَكُفِرُهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝﴾ (۲۱/ آل عمران)

”بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آئیوں کا انکار کرتے اور بیغبروں کو ناخن قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے، تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنادے۔“

سورہ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوم کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سُنگدی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ ہے جو اسلام سے ۲۰،۵۰ برس پہلے میں پیش آیا کہ یہودیوں حیریوں نے نبیان کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حضرت ناک منظر کا تمثاش دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درود استان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دیا:

﴿ قُتِلَ أَصْحَبُ الْأَخْدُودِ ﴿ التَّارِدَاتُ الْوَقْدُودُ ﴾ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قَعُودٌ ﴾ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴾ إِلَّا مُؤْمِنِينَ شَهُودٌ ﴾ وَمَا نَقْمُدُ مِنْهُمْ لَا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴾ ﴾

(البروج: ۸۴-۸۵)

”گڑھے والے لوگ مارے گے، بھڑکتی آگ کے گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔“

جزیبات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

① ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور رہتا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں، ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا:

﴿ تَحْنُنُ أَبْنَاؤَ اللَّهِ وَأَجْتَأْوَهُ ﴾ (۱۸ / المائدۃ: ۵)

”ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔“

﴿ وَقَالُوا كُنْ تَهْسَنَ النَّارُ إِلَّا أَكَيْمًا مَعْدُودَةً ﴾ (۸۰ / البقرۃ: ۲)

”اور کہا، ہم کو وزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، لیکن چند روز۔“

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

﴿ قُلْ إِنْ كَانَتْ لِكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً فَمِنْ دُونِ النَّاسِ فَمَنْتَوْا الْبُوَتَ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ﴾ (۹۴ / البقرۃ: ۲)

”کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔“

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

﴿ذلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُجْبِي لَهُ مَنْ يَشَاءُ﴾ (٦٢ / الجمعة: ٤)

”یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔“

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلیوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الہی کا درجہ دیتے تھے:

﴿يَعْرِفُونَ الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا وَاضَعُهُ﴾ (٥ / المائدۃ: ٤)

”ولناظموں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔“

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَتَبَوَّءُونَ الْكِتَابَ إِلَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لَيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَّا قَتِيلًا طَفَوْيِلَ لَهُمْ قَبَّا لَكَبَّتْ أَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مَمَّا يَكْسِبُونَ﴾ (٧٩ / البقرۃ: ٢)

”تو پھٹکار ہوان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔“

جو ان میں ان پڑھا اور جاہل تھے وہ اپنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے:

﴿وَمِنْهُمْ أَقْيَّوْنَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَآ آمَّا يَرَى وَإِنْ هُمْ لَا يَظْعَفُونَ﴾

(٧٨ / البقرۃ: ٢)

”اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں، جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناؤی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔“

احکام الہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا، اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے:

﴿نَبَدَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَا كِتَابَ اللَّهِ وَرَأَءَ ظُهُورُهُمْ كَانُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(١٠١ / البقرۃ: ٢)

”جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔“

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهُوَى أَفْسَكُمْ إِسْتَلْبَرُمْ فَرِيقًا كَلْبَتُمْ وَفَرِيقًا لَكَثَثُونَ﴾

(٨٧ / البقرۃ: ٢)

”کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو، تم نے غور کیا تو پچھ کو جھلایا اور پچھ کو مار دلتے ہو۔“

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لاچکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ ”تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟“ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشبیہ کرتے ہیں، آپ نے ان سے تورات طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلق حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو تھے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نو مسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند امیں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کروں گا۔“

آپ میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاق قورقبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا:

﴿لَئِنْ أَنْتَمْ هُوَلَاءُ تَقْتَلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْتُلُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ قُنْ دِيَاٰهُمْ تَظَاهِرُونَ عَلَيْهِمْ إِلَالِثُو وَالْعُدُوانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أَسْرَى نَفْدُوهُمْ وَهُوَ حَزَّرٌ عَيْلُمٌ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِعِضِ الْكَلِّيٰنِ وَتَكْفِرُونَ بِبَعْضِهِ﴾ (۸۵ / البقرة)

”پھر تم ہی لوگ آپ میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو جا لائے ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے پچھے حکموں کو مانتے اور پچھے کا انکار کرتے ہو۔“

② دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالج اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَخْرَصَ النَّاسَ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا إِيَّاهُمْ لَوْ يَعْمَلُوا أَحَدُهُمْ لَوْ يَعْمَلُ﴾ (۹۶ / البقرة)

”ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالج پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔“

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور بخشنہ تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح سختی اور بد دینی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہب امنع نہیں، قرآن نے اس

صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب احکام اہل الذمہ و احصانہم اذا زنووا و رفعوا الى الامام: ۶۸۴۱؛ مسلم، کتاب الحدود، باب رجم اليهود: ۴۴۰؛ ابو داود، کتاب الحدود، باب فی رجم اليهودین: ۴۴۶، ۴۴۷۔

معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیل اہل کتاب کی نسبت فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمِنَهُ يُدْيَنَارًا لَا يُؤْدَهُ إِلَيْكَ الْأَمَادُمْتَ عَلَيْهِ قَالِمَاطْ ذَلِكَ بِإِنَّهُمْ قَاتُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمَمِينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِيبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

(۳/آل عمران: ۷۵)

”کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینا بھی امانت رکھنے کے لیے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں، جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔“

توراۃ میں ”اپنے بھائی“ کے علاوہ ”اخبی“ سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لے اور اہل عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سے سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تجب پر تجب یہ تھا کہ ان کے علماء کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

﴿وَتَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَايِعُونَ فِي الْأَيْمَ وَالْعُدُوَانِ وَأَكْلُهُمُ السُّجْنَ طَلِيسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ لَوْلَا يَعْلَمُهُمُ الرَّبِّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْأَنْمَ وَأَكْلُهُمُ السُّجْنَ طَلِيسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۵/المائدۃ: ۶۲، ۶۳)

”اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھئے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے کرتوت کتنے بڑے ہیں ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔“

﴿سَمَعُونَ لِلْكَذِيبِ أَكْلُونَ لِلسُّجْنِ طَ﴾ (۵/المائدۃ: ۴۲)

”جوھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔“

﴿وَأَخْذُهُمُ الرَّبِّيُّو وَقُلْ نَهُوا عَنْهُ وَأَكْلُهُمُ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ط﴾ (۴/النساء: ۱۶۱)

”اور ان کے سود لینے کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔“

اسی لیے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حلیے تراشتے تھے کہ وہ حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنالیتے تھے، خدا نے فرمایا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرِيَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا الْتَّيَّبُونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالْتَّيَّبُونَ وَالْأَحْبَارِ يَبْأَسُونَ اسْتُعْظِضُوا مِنْ كِتْبِ اللَّهِ﴾ (۵/المائدۃ: ۴۴)

”ہم نے تورات اتنا ری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق نبی جو تابع دار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا کر کھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔“

اس کے بعد اس کے احکام کے اجر اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ بِهَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكُفَّارُ﴾ (۴۴ / المائدۃ)

”اور جو خدا کے اتنا رے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔“

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جب اور طاغوت کی پرستش میں بتلاتھے
قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَبَ أَمْنُوا بِهَا نَزَّلَنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُتَرَكَ

يَهٗ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنِ يَشَاءُ﴾ (۴ / النساء: ۴۸-۴۷)

”اے کتاب والو! ہم نے جو اتنا رہ وہ تمہاری کتاب کی تقدیم کرتا ہے، اس پر ایمان لاوے
ٹک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کروے۔“

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا تَحْسِيْنًا قِنَ الْكِتَبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجُبُوتِ وَالظَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ

لِلَّذِينَ كُفَّرُوا هُؤُلَاءِ أَهْدِيَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سِيِّلًا﴾ (۴ / النساء: ۵۱)

”کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتو اور شیطانوں پر ایمان
رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ سمجھ راستہ پر ہیں۔“

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گند، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت
سلیمان علیہ السلام کی تعلیم ہے (بقرہ) لبید اعصم و غیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو گنجیوں اور بالوں میں
منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور
شہروں میں اس طرح پر اگنہہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر
جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غربی
عربوں کو اپنے گراں شرح سودا اور قرضوں کے پار میں اسی طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے
غلاموں کی تھی اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کپوری حالت کے اندازہ کے لیے کافی ہوگا:

محمد بن عثیمین بن مسلمہ النصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور
ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے انہوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص محمد (رسول

اللہ عزیز) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو حق کردار ادا میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا، خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بے زار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا، میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا، مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے؟ انہوں نے کہا، تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، اپنی بیویاں گروی رکھو! انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں گروی کیسے رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا، اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو کہا، ہم اپنے لڑکوں کو گروی کیسے رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں ہم اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ *

اس سوال و جواب سے اندازہ ہو گا کہ یہودی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جانکتی تو اس کی عزت پہنچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لائق میں، موقع پاتے تو بے دردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے۔ علاوہ اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ ﷺ نے کیا تھا۔ لفظی موشکافیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جو ہر ان سے ٹھوک گیا تھا اسلام جو ابراہیم خیف کے تراۃ تہ توحید اور موسیٰ ﷺ کی صدائے طور کی آواز بازگشت تھا وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ بر اعتماد کہتے تھے کہ ”ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں۔“ (۴/ النساء: ۵۱) اسلام کی اس مصالحانہ دعوت:

﴿فَلْ يَأْهُلَ الْكِتَبِ تَعَاوَلُوا إِلَى كَلْمَةٍ سَوَاعِدَتْنَا وَيَنْكِمُمُ الْأَنْعَدُ لِإِلَهٍ وَلَا نُشِرِّكُ بِهِ﴾

شَيْئًا وَلَا يَتَعْقِلُ بَعْضًا أَرِبَابًا هُنَّ دُونَ اللَّهِ ۝ (٦٤) /آل عمران:

"اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں، جو ہم میں تم میں مشترک ہے ہم

خدا کے سوا کسی کو اپنا معمود نہ بنا سکیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنارب بنا سکیں۔“

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بر ماوی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے: «وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيزٌ اَنَّ اللَّهَ» (التوبہ: ۳۰) اپنی دولت و شرودت کے غور میں وہ کہتے تھے: «يَدُ اللَّهِ مَغْلُظَةٌ» (آل عمران: ۶۴)

”خدا کے ہاتھ بند ہوئے ہیں۔“ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں

* صحيح بخاری، کتاب المغازی، قتل کعب بن الاشرف: ٤٠٣٧۔ * دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب۔ علامہ شلی نے سیرۃ ابن حصہ اول پر غزوہ بن نضیر کے اتفاقیہ سب کے پیش آنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کی بیوی نقاب پوش بیوجودی کی دکان میں آئی تو بیویوں نے اس کی بے حرمتی کی ایک مسلمان نے غیرت سے بتا ہوا کہ بیوی کو قتل کر دالا۔ ممکن ہے کہ یہ صاحب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ * صحيح بخاری، کتاب الدیبات، باب من افاد بالحجر: ٦٨٧٩۔

ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ﴾ (۲/ البقرة: ۸۸) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہود یوں کی پراگنڈہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں ان کا مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کھو چکے تھے ان کے نزد ہی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح نبی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے کرنیش رب کے اوس و خزر ج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔ *

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صحیح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

* سیرت ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ، جزء اول، ص: ۲۵۹۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیالب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو میں فٹ تھی، تو اس کا پائے تخت مارب اور اس کے اضلاع دفعتہ تباہ و بر باد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ ﴿ قرآن مجید نے اسی سیالب کو سیل عرم کہا ہے، اس سیالب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرماز و اذونوں سے جو مذہب یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاوجش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذنوں کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمه ہو گیا۔ ۲۰۳ء میں قبلہ حیر کے ایک با حوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبلیہ یمن سے نکلے، ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں جوں سے متاثر تھی، دوسرا قبلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے۔ ﴿ چونکہ یہ خاندان رومنیوں کے زیر اثر تھا اس لیے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تدبیں پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ محبوبیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یمنی وادی القفری اور خیر و دک تمام تر یہودی آبادیاں تھا اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خداد کا اعتقاد

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات و متیاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتا اس کا اما اللہ نہیں بلکہ اللہ ہے۔ عرب شمال کے عرب جو ناتھی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید اللہ عبد اللہ ﴿ خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:

﴿ اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تینیں مشکل ہے اور اسی لیے اس کی تعریف میں کمی نظر یہی ہیں ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت پر معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بننے رہے آخری وفع پانچویں صدی عیسوی میں بالکل بر باد ہو گیا۔ (سلیمان) ﴿ اکثر علمائے انساب کا بیان لکھی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائیں اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان) یہ کہے حصہ اول زیر عنوان سہا حیر۔ ﴿ میں نماہب و اخلاقی کی انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، صفحہ ۳۲۳، حکومت پاکستان کی

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتُهُمْ مَنْ حَلَقَ الشَّمُوْتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ط﴾ (٣١ / لقمان: ٢٥)
 ”اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔“

یہ اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گواہ الدان میں سب سے بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر رنج ہو گیا کہ اور معبدوں کے انکار سے ان کو اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کار و بار اور روز مرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداوں سے انعام پاتی تھیں اور کام اکثر انہیں خداوں سے پڑتا تھا اس لیے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سارہ گیا، انہی خداوں کی پرشیش کرتے تھے، انہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بننا کر بیکار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدا یا ان اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:
 ﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَةً أَشْمَاكُتُ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ

دُونِيهٖ إِذَا هُمْ سَتَبِّعُونَ﴾ (٤٥ / الزمر: ٣٩)

”اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ، جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن جب خدا کے سوا اور وہ (معبدوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو وہ دفعتہ کھل جاتے ہیں۔“

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبدوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿مَا نَعْبُدُ هُمُ الْأَلْيَقُونَ وَنَا إِلَى اللّٰهِ رُازِغُونَ﴾ (٣٩ / الزمر: ٣)

”ہم ان بتوں کو اس لیے پوچھتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔“

ملائکہ کی الوہیت: شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْمُونَ الْمَلِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثَى﴾ (٥٢ / النجم: ٢٧)

”جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔“

﴿الْكَمَالُ لِلّٰهِ الْكَرُوْلَهُ الْأَنْثَى﴾ تلک إذا قُسْمَةٌ ضَيْلٌ (٥٣ / النجم: ٢١، ٢٢)

”تمہارے توڑ کے ہوں اور خدا کے لڑکیاں ایسا تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔“

اس لیے جس طرح بعض یہود عزریکو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں

کو خدا کی اولاد بھج کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

﴿وَلَا يَأْمُرُهُمْ أَن تَنْجِذُوا الْمَلِكَةَ وَالنِّسَنَ أَرْبَابَ الْأَبَادَاتِ﴾ (آل عمران: ۸۰)

”اور نہ تو خدام تم کواس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔“

﴿وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادَةِ جُزُءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ۗ أَمْ اتَّخَذَ مِنَّا مَحْلًّى بَنَتْ وَأَصْفَلَهُمْ بِالْبَيْنَنَ ۝ وَجَعَلُوا الْمَلِكَةَ الَّذِي نَّهُمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ إِنَّا نَعْلَمُ أَشْهِدُوا خَلْقَهُمْ سَنَتِبْ شَهَادَتَهُمْ وَيُسْأَلُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدُنَاهُمْ ۝﴾

(الزخرف: ۴۳) (۲۰-۱۹-۱۵)

”اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔“

﴿فَاسْتَفْتِهُمْ أَلِيْلَكَ الْبَنْتُ وَلَهُمُ الْبَنْوَنَ ۝ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلِكَةَ إِنَّا نَعْلَمُ وَهُمْ شَهِدُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ قَنْ إِنْ كَهُمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَكَ اللَّهُ وَلَا يَهُمُ لَكَذِيْبُونَ ۝﴾ (الصفت: ۳۷) (۱۴۹-۱۵۲)

”تو ان سے پوچھ کر کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا، وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔“

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بینیں گے۔ خدا نے اس کی تردید میں کہا:

﴿وَكَمْ قَنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ هَيْنَا﴾ (النجم: ۵۳) (۲۶)

”اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔“

تمام میں فرشتوں سے پرس ہو گی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

﴿يَقُولُ الْمَلِكَةَ الْهُؤْلَاءِ إِنَّا لَمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝﴾ (سبا: ۴۰) (۳۴)

”پھر خدا فرشتوں سے کہہ گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔“

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کے عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿وَجَعَلُوا بِيَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسِيَّاطٍ﴾ (١٥٨: ٣٧) الصفت

”اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنادی۔“

اس لیے وہ جنات کو خدا کی خدائی کا شریک کرتے تھے:

﴿وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرْكَاءَ الْجِنَّةِ وَخَلَقُهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَيْنَ وَبَيْنَتِ يَغْيِرِ عِلْمٍ﴾

(١٠٠: الانعام)

”اور انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور میں جانے خدا کے لیے
بیٹھے اور بیٹھیاں گھریں۔“

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری
تھی چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کو بھی پوجا کرتے تھے * «بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّةَ أَكْثَرُهُمْ
يَعْبُدُونَ قَوْمَنُونَ» (٤١: ٣٤) ”بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھتے
تھے۔“ سافر جب راستے میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پوکار لیتے تھے، قرآن میں ہے:
«وَكَانَتِ الْجَنَّةُ رِجَالًا قِنَ الْأَلْئِسْ يَعْوِذُونَ بِرِجَالٍ قِنَ الْجِنِّيَّ قِنَ أَدُوْهُمْ رَّجَالًا» (٧٢: الجن: ٦) ”اور بات
یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنادیا تھا۔“ چنانچہ بعض
مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام دراهم تھا جہاں
کے رہنے والے جنوں (مکان الدراهم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے
ان کی شرارت سے محظوظ رہیں۔ * قبیلہ خزاعم کی شاخ بولیخ خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور بلکہ کا
بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَكْرَدُونَ مِنْ دُفُونَ اللَّهِ وَيَعْبَادُونَ مُثَالَكُمْ﴾ (١٩٤: الاعراف)

”خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پوکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔“

بت پرستی

جن خداوں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لیے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے
تھے۔ یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، انہا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی،
زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک
تو وہ بنا لیا ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دھوپا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبد بن جاتا تھا
چنانچہ بخاری کتاب المغازی باب وفديٰ حنفیہ ٢: ٣٣٧ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

* صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالى: اولئک الذين يدعون يتغرون الى ربهم الوسيلة..... ٧٥٥٧ ت ٧٥٥٤۔

** لسان العرب لفظ سکن، ج ٢، ص: ١٧٤۔ *** کتاب الاصنام هشام الكلبی مطبوعہ مصر، ص: ٣٤۔

اس بات پرستی کی ابتدائیوں ہوئی کہ قبیلہ خزانہ کا ایک شخص جس کا نام عمر و بن الحی تھا اور جو قبیلہ جرمہ کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لیے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہم سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزیٰ تھے۔ منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خرزج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے، حلفیہ معابدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مرنی کہتا ہے:

انی حلفت یمین صدق برہ بمناء عند محل آل الخزرج

”میں نے منات کی پچی قسم کھائی آل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔“

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقامِ طائف میں نصب تھا، اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔ عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا، قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے:
 وَاللَّاتُ وَالْعَزَى وَمَنَأَةُ الْقَالِهَةِ الْأُخْرَى إِنَّهُنَّ الْغَرَانِيَّةُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَهُنَّ لَتُرْتَجِحُ.

”لات، عزیٰ اور تیرا مناۃ یہ یڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔“

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی براہیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت ﷺ کے جدا مجدد المطلب نے جو اپنے صاحب زادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی کہندرسم کی تقلید تھی۔

بیکرہ سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سائٹ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر ”ہاں“ ایک پر ”ناں“ لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے بچاری سے کہتے فال نکالے، ہاں کا تیر رکھتا تو اس کو کرتے درندہ باز رہتے۔ جالمیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں اضام و اوثان، انصاب اور بیوت۔ اضام و اوثان جن کا واحد صنم اور وشن ہے یہ انسانی ٹھکل و صورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیر کہلاتے اور اگر رنگ اور مصالے سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے، انصاب اور نصب بن گھرے پھر ہوتے

۱۔ یہ پوری تفصیل مجمجم البدان لفظ مناۃ، ج ۸، ص: ۱۶۸، ۱۶۷ میں ہے۔

۲۔ مجمع البدان لفظ لات، ج ۶، ص: ۱۶۶ و کتاب الاصنام للکلبی، ص: ۱۹۔

۳۔ نیل العوام فی تفسیر آیات الاحکام، ص: ۱۱۰، ۱۱۱۔

تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے۔ بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رام، قلیں وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیے جاتے تھے جن بتوں کے اردو چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پھر وہ کا ذہیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر گاتے تھے اس ذہیر کو رجمہ کہتے تھے۔ جامی شاعر کہتا ہے:

کماطاف بالر جمة المرتجم

”جیسے پھر وہ کے ذہیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔“ *

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی انکی کوئی انتہا نہ تھی۔

ع قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بیت تھے * ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزی (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعقوب (۶) نمر (۷) و (۸) سواع (۹) بعل۔ لیکن جاہلیت کے پرانے مورخوں اور راغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں تحریخ اور تتملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تتملہ میں چھایا لیں نام اور بڑھائے ہیں میں اور ججاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المقد، عشتار، بکرہ، قبیان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو مکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزی	قریش و بنو شیان بن جابر۔
منات	اوی و خزر و حج اور عام عرب۔
یغوث	بنو مدح و بنو اہل جوش۔
یعقوب	بنو همدان اور اہل خیوان۔

* ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔

* صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ۔ ۴۲۸۷۔

نمر	جیبر۔
وذ	بنوکلب۔
سواع	بنوچیان۔
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
ناکله	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیر	قضاصد و تم و جذام و عاملہ و غطفان۔
باجر	ازدواجی و فضائی۔
ذوالخاصہ	بنوامام، نعم، بجال، ازدالسراء۔
رضایا رضی	بغریبیہ کا بت خانہ۔
رمام	جیبر کا بت خانہ۔
سبح	
سحد	بنی مکان بن کنانہ۔
سیعر	عزرہ۔
ذوالشری	بنو حارث۔
عامم	ازدالسراء۔
قلس	خولان۔
ذوالگفین	طی۔
مناف	بنودو۔
نیم	قریش۔
ہبل	مزنيہ۔
بعل	قریش۔
یغیوب	قبائل بنی عدنان۔
اشہل	حدیلہ (بنی طی)۔
اوال	بنو عبد الاہل۔
	کبر وتغلب۔

بس	غطافان کا بت خانہ۔
بعین	ایک لکڑی کا بت۔
بلج	ایک بت۔
حیہ	ایک بت۔
جُریش یا جَریش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
چہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنعبد الدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل	چجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شش	بنعبد شش۔
صدرا	عاء کا بت۔
صمودا	عاء کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداوس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزان	منذر اکبر۔
عقب	قطاع۔
عرض	بکر بن واکل۔
عوف	ایک بت کا نام۔
غصب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔
فراض	سعد العثیر۔
کثری	جدیں و طسم۔
کمع	ایک بت کا نام۔
محرق	بکر بن واکل۔
مدان	عبد الدان۔
مرحب	حضرموت۔

ایک بنت کا نام۔	مہب
عاد۔	ہبا
ایک بنت کا نام۔	ذات الودع
عبد یا میل۔	یا میل

ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لیے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ (۴۱ / حم السجدة: ۳۷)

”نے سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔“

یمن میں سما کی قوم سورج ہی کو دیوی مانتی تھی (۲۷ / انمل: ۲۳) یمن کے بادشاہ شریعت نے سورج دیوی کا مندر بنوایا تھا۔ * سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعری کی بڑی قدروں منزالت تھی، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿وَأَكَّهُهُوَرَبُّ الشِّعْرِيِّ﴾ (۵۳ / النجم: ۴۹)

”اور ہی خدا شعری کا مالک ہے۔“

صاعداندلسی التوفی ۶۲۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبلہ حمیر سورج کو پوجا تھا، کنانہ چاند کو، نیم دریاں کو، حرم اور جذام مشتری کو، طی سنبھل کو، قیس شعری العبور کو اور اسد عطا رکو۔ *

جن اور شیاطین اور بحوث پلیت

جن اور شیاطین کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقدات تھے وہ جن اور شیاطین بہوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجھے جنگلوں اور سیدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکور بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبد بن ایوب الشیری

و غولا قفرة ذكر و اثنى کان عليهما قطع البجاد

”اوہ بیان کے دوغول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمل کے نکڑے پڑے ہیں۔“

* تاریخ ملوك الارض حمزة اصفهانی، ص: ۱۱ کلکھ۔ ** طبقات الامم قاضی صاعداندلسی، ص: ۳، ۴ بیروت۔

مونٹ کو سعلاۃ کہتے تھے:

ازل و سعلاۃ و غول بقفرة اذا اللیل واری الجن فیه اریت
 ”میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پر دہ پوش ہوتی تھی تو اس میں
 بہوت آواز دیتے تھے۔“
 عمر بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی
 راجز کہتا ہے:

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ۔ ”خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔“

بلقیس ملکہ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یا کاشڑ گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے:

کم حبیت دونک من بھماء مظلمة تیہ اذا ما مغئی جنه سمرا
 ”کتنی اندر ہیری گھپ راتوں میں، میں نے صحراء کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مخفی افسانہ
 گولی کر رہا تھا۔“

یہ صحرائشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ جائزوں میں جب بداؤاً گ جلا کر بیٹھتے تھے یہ
 بھی آگ تاپنے کو آ جاتے تھے، لیکن جب ان کو کھانے پر بلاستے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا
 نہیں کھاسکتے۔

اتواناری فقلت ممنون انتم فقالوا الجن قلت عمواظلما
 دعوت الى الطعام فقال منهم زعيم نحسد الانس الطعام
 ”وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم جن ہیں، میں
 نے کہا: اس تاریکی میں خوش رہو۔ میں نے ان کو کھانے کے لیے بلا یا تو ان میں سے ایک
 سردار نے کہا: ہم انسان کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔“

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی بقار اور عقر تھے:
 ”بدی کے جن، جن کے قدم جسے
 ع: جن البدی رو اسیا اقدامها“

”زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔“
 ”تحت السنور جنة البقار
 ع: عليهين فتیان كجنة عقر
 ”اور ان پر شہسوار جوان عقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔“

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہاں کثیر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے، حضرت علیؑ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو انہا کر لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ عمر وہ بن عذری نجی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذبہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا کے لے گئے تھے مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باقی میں بیان کرتا تھا۔ ❶

ان اجنبیہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں تابطہ شر اور ابوالبلاء طہبی زیادہ مشہور تھے۔ طہبی نے ایک دفعہ ایک بہوت گوت کو مارڈا اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں:

لقيت الغول تسرى فى ظلام	قصدت وانتحيت لها بغض
حسام غير مؤتسب يمانى	فقد سراتها والبرد منها

فخرت لللّٰدين والجوان ❷

”میں غول بیباپی سے ملا جو رات کو اندر ہیرے میں چلتے ہیں گواں نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصلیں تواریے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زر ہوں کو کاٹ دیا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل ز میں پر گر پڑا۔“

انہیں اجنبیہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا۔ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہو گا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر راستیلا تھا:

﴿يَعْشَرُ الْجِنُونَ قَدْ أَسْتَكَدْرُتُمْ مِنَ الْإِنْسَانَ وَقَالَ أَوْلَيَاهُمْ مِنَ الْإِنْسَانِ إِنَّمَا أَسْتَكَدْتُمْ بَعْضَنَا بَعْضِهِ﴾ (٦/الانعام: ١٢٨)

”اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا اور ان کے دوست دار انسان بولے، اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔“

❶ شماںیل ترمذی، باب ما جاء في كلام رسول الله ﷺ في السمر: ٢٥١۔ ❷ یہ تمام تفصیل کتاب الحج انجا ماظہ سے مخذوذ ہے اس نے کئی اور حق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، ویکھو کتاب مذکور از صفحہ ۲۷۸ صفحہ ۸۰ جز ششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر۔

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشیں گویاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتماد اور خود کا ہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن ❷ رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل و صورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیتے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر بن الخطابؓ کے سامنے سے ایک آدمی گزر انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے مجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا: میں ایک روز بازار میں پھر باتھا کہ میرا جن گھبرا یا ہوا آیا اور کہا:-

اللَّمَ تَرَى الْجِنَّ وَابْلَاسُهَا وَيَسِّهَا مِنْ بَعْدِ انْكَاسِهَا وَلِحُوقَهَا بِالْقَلَاصِ وَاحْلَاسِهَا۔

”کیا تم جنون کی سر ایسیگی ان کی نامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔“

حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: حق کہتا ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لا کر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلا یا:-
یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا الله الا الله۔

”اے جلیح، کامیاب امر، ایک فتح شخص لا الله الا الله کہتا ہے۔“

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی صحیح بخاری (تفہیم سورہ والضحی) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کی عبادت کے لیے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یا ابوالہب کی زوج تھی) نے آنحضرت ﷺ سے کہا:-

انی ارجوان یکون شیطانک قد ترک ❸۔

”میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے مجھ کو چھوڑ دیا۔“

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:-

﴿هُلْ أَنْتَمُ عَلَى مَنْ تَنْزَلُ الشَّيْطَانُ هُنَّ تَنْزَلُ عَلَى مُلْكِ أَقْلَمِ أَثْيُورٍ يَقُولُونَ التَّمَمُ وَالثَّرْهَمُ كُلُّذِيْوَنَ ط﴾ (۲۶/الشعراء: ۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اترتا ہے جو سنائی بات القا کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

❶ کتاب البيان والتبيين للجاحظ، ج ۱، ص: ۱۱۳ مطبوعہ علمیہ مصر۔

❷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ والضحی: ۴۹۵۰۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور زیارات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنابر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطح، عزی بہت مشہور تھے جاخط نے ان کے کاہنا نہ فقرے، کتاب البیان، ج ۱، ص: ۱۳۳ میں نقل کیے ہیں:

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بني
الشعراء للجاد السناء۔

”قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی
بیون عشر اپر غالب آگئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔“

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف اور مقتضی اور مسجع فقرے ہوتے، اس لیے جب
ایک رفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقطِ احمد بچہ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اس کی دیرت کا فیصلہ کیا
تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراض کیا:

ارأيت من لا شرب ولا اكل ولا صاح فاستهل اليك دمه بطل۔ ❶
غور فرمائے کہ جس بچنے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخانہ رویا، کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔
آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے۔“

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بست کے پیاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب
کی بات پوچھتے یادِ خود آئندہ کے متعلق پیشیں گولی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے،
مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں جو کہ نہ کہلاتی تھیں یہ مصیبتوں اور بلاوں کے دور کرنے
کے لیے بست پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول
کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے وہ علائیہ اپنے خد ع و فریب کا اعتراف کرتے تھے ان کو
نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تخفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا لیعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے تھا،
اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔ ❷

غرض ان کاہنوں نے عوام فرمی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ انہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم
کی وہم پرستیوں میں بیٹلا ہو گیا تھا۔

شاعر کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار
القا کرتا ہے، چنانچہ تحبل شاعر کی شیطان، عمر و کی بیٹی تھی اور اعشری جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام
محمل تھا، اعشری خود کہتا ہے:

❶ صحیح بخاری، کتاب الطبل، باب الکھانۃ: ۵۷۶۰، ۵۷۶۸؛ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب دیۃ
الحسین: ۴۳۹۱۔ ❷ بخاری، کتاب الطبل، باب الکھانۃ: ۵۷۶۱۔

دعوت خلیلی مسحلا و دعو الہ
بجهنم یدعی للهجن المذم
حبانی اخی الجنی نفسی فداء ه
یاقبع جیاس العشیات مرجم *
”میں نے اپنے دوست محل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لیے جہنم کو پکارا اور یہ کمینہ بد
اطوار کے لیے بایا جاتا ہے، مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو، شاموں
کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت پتھرا کرنے والے کو دیا۔“
جو اعلیٰ درجے کا شاعر ہوتا اس کا شیطان یا جن مذکور ہوتا تھا، ابو الجم کہتا ہے:

انی وکل شاعر من البشر شیطانہ ائی و شیطانی ذکر۔
”ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میر اشیطان مذکر ہے۔“

شنتان اور شیطان رو سائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے۔ ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا
علم اسی شیطان کی اولاد سے ہے:

ولی صاحب من بنی الشیصان فطورا اقوال و طورا ہو
”میرا ساتھی شیطان کی اولاد ہے تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔“

اوہام پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ * یہ
اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو بامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک
سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاتتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی
پرندہ دلائی جانب سے اڑا تو مبارک بھجتے تھے اور با میں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے۔
بکری کا جب بچ پیدا ہوتا تو اگر زہر توبت پر چڑھادیتے، اوئی جب دس بچ جن لیتی تو اس کو چھوڑ دیتے وہ
سائنس کی طرح جھوٹی پھرتی۔ کسی شخص کے پاس جوانوں کی تعداد ایک ہزار تک بیج جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ
پھوڑ دیتے کہ لظہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یاد نہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگادیتے
اور سمجھتے کہ اس سے پانی بر سے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈور وغیرہ باندھ کر گردہ لگادیتے واپس آ کر
دیکھتے اگر گردہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بد کاری کی۔ سفر میں راست بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن
لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راست مل جائے گا * یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزی کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام
ہو جاتا ہے * ہاتھوں میں پیٹل کی انکوٹی پہننے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے * اس قسم کے

* اُشی کے دیوان مطبوعہ دیانا صفحہ ۲۵ (اور شعراء النصرانیۃ القسم الثالث، ص: ۳۷۷) میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا
بھی دوسرا صدر اس طرح ہے: جهنم جدعا للهجن المذم۔ * ابو داود، کتاب الادب، باب فی قتل الحیات:
۵۲۵۰۔ * یہ بالتمی بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ * دارمی، کتاب الصلوة، باب
فرض الوضوء والصلوة: ۶۵۲۔ * ابن ماجہ، ابواب الطہ، باب تعلیق النہائم: ۳۵۳۱۔

سینکڑوں اوهام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات و خیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی ان کے اخلاقی معابر میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد رجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنادیا تھا۔

جنگ جوئی

ذر اذ راسی بات پر لڑنا مرنا اور ایک دوسرے کا سرکاث لینا ان کے نزد یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے بر سر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزیوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ انہیں لڑائیوں کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متوجہ ہے۔ میدانی نیشاپوری المتنوی ۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هذا الفن لا يقتصر على الأحصاء فاقتصرت على ما ذكرت۔

”یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قاعدت کی۔“

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس و ذیيان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحص اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری مشہور لڑائی حرب بوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹی کلیب بن والل کی چراہ گاہ میں جا پڑی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو خنچی کر دیا اس بات نے قبیلہ میں آگ لگادی کلیب جان سے مارا گیا اور بکرو تغلب میں خوزیر یز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقعہ پا کر ایک کو قتل کر دیا گیا اس کے انتقام کے لیے خون کی ندیاں بہیں۔ بکرو تمیم میں ایک چراہ گاہ کے معاملہ میں خوزیر یز لڑائی ہوئی۔ اوس و خرزج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاثت ہے، جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا خاتمه انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجر ہے۔ ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

كتاب الامثال للعداني، ج ۲، ص: ۳۷۱۔

الغرض عمومی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہوا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔ ان میں لڑاؤں اور مرننا جاہلیت کا شرف اور ایک قبلہ کی آنکجی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفا کی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فتن و فنور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میٹے کدھہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا، ان کے نام یاد رکھنے گئے تھے۔ دوست و احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوئے کھیلتے، ان میں اوتھوں کی ہار جیت ہوتی، جو جیتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلادیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کر ڈھیر کر دیتا اور لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھلاتے اور کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے، سامنے فاہشہ عورتیں گاتیں بجا تیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

فَانْتَبِغْنِي فِي حَلْقَةِ الْقَوْمِ تَلْقَنِي
وَانْتَقْتَصِنِي فِي الْحَوَانِيْتِ تَصْطَدِي
”پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔“

مُتَىٰ تَانِتِي أَصْبَحْكَ كَاسَارِوِيَّةً
وَانْ كَنْتَ عَنْهَا غَائِبًا فَاغْنِ وَازْدَدِ
”بیتب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاوں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر نہ آئے تو جا اور بے نیازی کر۔“

نَدَامَى بَيْضَ كَالنَّجُومِ وَقِينَةً
تَرُوحَ الْيَنَابِيْنَ بِرَدْوَ مَجَسَدَ
”میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں ایک مغزی ہے جو شام کو ہمارے پاس یعنی چا در اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔“

رَحِيبُ قَطَابِ الْجَيْبِ مِنْهَا رِفِيقَةً
بِجَسِ النَّدَامِيِّ بَضَّةَ الْمَتَجَرِّدِ
”اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست اندازی سے مانوس، اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔“

ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھو: عقد الفرید ابن عبدربه، ج ۳، ص: ۴۴ اور امثال میدانی الجز الثاني، الباب التاسع والعشرون في اسداء العرب، ص: ۲۶۰ وما بعد۔

اذ انحن قلنا اسمعینا انیرت لنا
على رسلاها مطروقة لم تشتد
”جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ساؤ تو آہستہ آہستہ زناکت کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔“

ومازال تشرابی الخمور ولذتی
ویبعی وانفاقی طریقی و متلدى
”اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا
شعار ہے۔“

ولو لا ثلث هن من لذة الفتى
و جدك لم احفل متى قام عودي
”اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میں اپنی موت کی پروانہ کرتا۔“

فمنهن سبقى العاذ لات بشربة
كميت متى ماتعمل بالماء تز بد
”ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ و سیاہ رنگ شراب کا
پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔“

وتقصیر يوم الدجن والدجن معجب
ببهکنة تحت الخبراء المعتمد
”اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمرہ کے نیچے
حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔“

كریم یروی نفسه فی حیاته
ستعلم ان متنااغدا اینا الصدی
”میں وہ نیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد
معلوم ہو گا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔“

وبرک هجود قد اثارت مخافنی
بواديها امشی بعضب مجرد
”اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اوٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے الگوں کو بھڑکا دیا جب
میں نگلی تلوار لے کر چلا۔“

فمررت کھاۃ ذات خیف جلالۃ
عقیلۃ شیخ کالو بیل یلنند
”تو ایک موئی اونٹی جو ایک بڑھے کی، جو ایک لٹھ کی طرح جھنگرا و تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔“
وقال الاما اذا ترون بشارب
شدید علینا بعینه متعمد
”(اور جب میں نے تلوار سے کوئی کاٹ کر اونٹی کو گردایا) تو اس بڑھے نے کہا: اس بد مست
کو دیکھو جو جان بوجھ کر ظلم کر رہا ہے۔“

فظل الاماء يمتلئن حوارها
ويسعني عليها بالسديف المسرهد

❶ شرح المعلقات السبع للزووزنى، ص: ٥٧ وما بعد۔

”تو لوٹ دیاں اونٹیکے بچ کو (جو اس کے پیٹ سے اکلا تھا) بھونے لگیں اور جربی دار کو ہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔“

لبید بن ربيح جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہے:

بل انت لا تدرین کم من ليلة طلق لذيد لهوها وندامها
”بلکہ تو نہیں جانتی کہ تئی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلپیسی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔“

قد بث سامرها و غایة تاجر وافیت اذ رفعت وعز ندامها
”میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔“

اغلی السباء بكل ادکن عائق او جونة قد حلت وفضن ختماها
”میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔“

وصبح صافية وجدب كرينة بموتر تأثاله ابهاماها
”اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغزی کا عود کو ٹھیک کرائے انگوٹھے سے دبانا۔“

بادرت حاجتها اللدجاج بسحره لا علّ منها حين هب نيمها
”میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جانگے سے پہلے دہرالوں۔“

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخری یہ میں کہتا ہے:

الاهبی بصحتك فاصبحينا ولا تبتقى خمور الاندرينا
”ہاں اپنا پیالہ لیکر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین کے (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹئے نہ پائے۔“

مشعشعة كان الحض فيها اذا ما الماء خالتها سخينا
”پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاو۔“

تجور بذى اللبانة عن هوا اذا ما اقاها حتى يلينا
”غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو زرم کر دے۔“

* شرح المعلقات، ص: ۱۰۹ و مابعد۔

تیری اللحر الشجیع اذا امرت
علیه لماله فیها مهینا
”شک دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لتا دے۔“

صبنت الكأس عنا ام عمر و
وكان الكأس مجرهاها اليينا
”اے عمر وکی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹالیا حالانکہ پیالہ کا دور وہ اپنی طرف تھا۔“

وما شر الثالثة ام عمر و
بصاحبک الذی لاتصلبنا
”حالانکہ تیرا وہ ہم نہیں جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔“

کأس قد شربت بیعلبک
واخری فی دمشق و فاقرینا ❶
”اور ایک وہ پیالہ جس کو بعلبک میں پیا اور دوسرا وہ جودمش اور قاصرین میں پیا۔“

ان اشعار سے اندازہ ہو گا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دو کافیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غاییتہ کہتے تھے (دیکھو اپر لبید کا دوسرہ اشعار) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا متراود بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمر بن قدر کہتا ہے:

اذا سحب الريط والمروط الى
ادنى تجاري وانقض اللمم ❷
”یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھستیتا ہوا قریب ترین شراب خانے میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔“

بدر میں قریش کے جو دولت مندرجہ سامارے گئے تھے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بر بادی کا ماتم کرتا ہے:

وماذا بالقلیب قلیب بدر من القینات والشرب الکرام ❸
”بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔“

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھانی سونام ہیں اور علامہ مجدد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ تمام گھروں میں شراب کی محالیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساتی بنتے تھے۔ یہ شعر اپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبنت الكأس عنا ام عمر و كان الكأس مجرهاها اليينا

”اے ام عمر! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹالیا حالانکہ پیالہ کی گردش وہ اپنی طرف سے تھی۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم

❶ شرح المعلقات السابع، ص: ۱۱۷، ۱۱۸۔ ❷ دیوان حماسہ، جزء الثانی، باب الادب: ۱۰۔

❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الہجرة واصحابہ الی المدينة: ۳۹۲۱۔

سے میں یہ سنا کرتا تھا: اسقینا کامسا دھافاً ”شراب کا ایک لبریز پیالہ تم کو پلا۔“ * صحیح بخاری کتاب الاشریۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس تھی جس میں حضرت ابو جانہ، ابو طلحہ رضی اللہ عنہما، سعیل بن بیضا شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کسن تھا ساتی گری کی خدمت انہام دے رہا تھا۔ *

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہو گا * جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔ غزوہ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال نخیمت میں سے ایک اونٹی ملی تھی خمس میں سے ایک اور اونٹی آنحضرت علی رضی اللہ عنہ نے عطا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگ میں جا کر کراذ خر (ایک گھاس کا نام) لا کیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں اس ارادہ سے باہر نکل تو دیکھا کہ ان کی اونٹیوں کے کوہاں کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے لکھی جنکاں لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا یہ کام کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنية نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا:

الا یا حمز للشرف النساء ”اے حمزہ! موئی اونٹیوں کے لیے۔“

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے لکھی جنکاں لیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر آنحضرت علی رضی اللہ عنہ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت علی رضی اللہ عنہ نے چادر اور اوڑھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لے کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ محور تھے، آنحضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا: ”تم سب میرے باب کے غلام ہو۔“ آنحضرت علی رضی اللہ عنہ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ۳ ہیں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہو گا کہ تمام ملک کس طرح اس میں بیٹھا تھا۔ کس طرح وہ مقبول عام ہو پہنچی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کتنا یہ اشاروں سے گزر جب تک صاف ممانعت نہیں کردی گئی لوگ سمجھنیں سکتے۔

ابوداؤد کتاب الاشریۃ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتادے۔“ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللَّهُمَّ بِينَ لِنَافِي الْخَمْرِ بِيَانًا شَفَاءٌ

* صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجahلیyah: ۲۸۴۰۔ * صحیح بخاری، کتاب الاشریۃ، باب نزول تحريم الخمر وہی من البسر والتمر: ۵۵۸۲، ۵۵۸۳۔ * صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ بدر: ۴۱۰۳۔ * ابو داود، کتاب الاشریۃ، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۰۔

”اے خدا شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔“
اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت اتری:

﴿يَسْلُوكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِنَّهُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۹)

”لوگ تم سے شراب اور تمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔“
اس آیت کے اتنے کے بعد بھی لوگ شراب پینے پلاتے رہے ہیں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور جل رہا تاکہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا ایک صاحب ﷺ نے امامت کی، مگر نہ کے غمار میں ﴿قُلْ يَا يَهُآ الْكَافِرُوْنَ لَا﴾ کی سورہ کو پکھ

* شراب کی حرمت یہ تدریجی صورت حضرت عمر بن الخطاب (ترمذی)، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ مائدۃ: ۴۹، ابو داود کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۵۱) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (ابو داود، کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشیکی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر ہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام اور تیری سری میں کوئی مہاجر مکرور ہے حضرت الاستاذ نیرۃ جلد و دم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابو داود کتاب الاشربة باب فی تحريم الخمر: ۳۶۷۱ کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا تھا مگر یہ تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی ارادی عطا، بن السائب عن ابی عبدالرحمن ہے ابو عبدالرحمن سلی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشیک میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ میں وہ روایتیں ہیں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے:

۱- (عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنعت لنا عبدالرحمن بن عوف طعاماً فدعانا من الخمر فأخذت الخمر منا وحضرت الصلوة فقد مونى فقرأت قل يا يهآ الكافرُونَ لَا أَعْدُ مَا تَعْبُدُونَ ونحن نعبد ما تعبدون فنزل الله ﴿يَا يَهُآ الَّذِينَ أَمْنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى﴾) (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ نساء: ۳۰۲۶)
”ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمن سلمی سے، ابو عبدالرحمن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا تیار کر لیا اور شراب پلائی، جب ہم شراب کے نشیک میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے ﴿قُلْ يَا يَهُآ الْكَافِرُوْنَ لَا أَعْدُ مَا تَعْبُدُونَ لَا﴾ و نحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری: ﴿يَا يَهُآ الَّذِينَ أَمْنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى﴾) (یعنی مسلمانوں انشیکی حالت میں نماز نہ پڑھو“)

۲- (عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی علیہ السلام ان رجلاً من الانصار دعاه عبدالرحمن بن عوف فسقا هما قبل ان تحرم الخمر فامهم على في المغرب فقرأ ﴿قُلْ يَا يَهُآ الْكَافِرُوْنَ﴾ فخلط فيها فنزلت ﴿لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حتی تعلموا ما تقولون﴾
(ابو داود، کتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۱) ﴿يَا يَهُآ الْكَافِرُوْنَ﴾

(۱) گرہست سے یوست) سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمن سلمی سے، ابو عبد الرحمن سلمی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبد الرحمن بن عوف کو مدح و کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علیؓ سے نماز مغرب کی امامت کی اور فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ پڑھی لیکن اس میں گذمکرو یا اس پر آیت اتری («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَإِنْتُمْ سَكَارَى هَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ») نشی کی حالت میں نماز کے پاس نہ جائیہاں تک کجو پکھ کہتے ہو، اس کو جان لو۔“ وہ روایتیں جن میں عبد الرحمن بن عوفؓ کا نام ہے۔

۳۔ ((حدثنا سفيان عن عطاء بن السائب عن أبي عبد الرحمن السليمي عن علي قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فقدم عبد الرحمن بن عوف و صلى بهم المغرب فقرأ قل يا ايها الكافرون))

فالتبیس عليه فنزل («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَإِنْتُمْ سَكَارَى») (مستدرک حاکم الاشربة، ج ۴، ص: ۱۴۲) ”سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمن سلمی سے، ابو عبد الرحمن سلمی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدح کیا تو عبد الرحمن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور («فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ») پڑھی، لیکن اس میں خلط ہو گیا اس پر آیت اتری («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَإِنْتُمْ سُكَارَى») ”نشی کی حالت میں نماز پڑھو۔“

۴۔ ((سفیان عن عطاء بن السائب عن ابن(؟) عبد الرحمن عن علي انه كان هو عبد الرحمن ورجل آخر يشربون الخمر فصلى بهم عبد الرحمن بن عوف فقرأ (فُلْ یا ايها الكافرون) فخلط فيها فنزلت («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ»)) (مستدرک حاکم، کتاب الاشربة، ج ۴، ص: ۱۴۲)

”سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابن عبد الرحمن سے، ابن عبد الرحمن نے حضرت علیؓ سے یہ روایت کی ہے کہ وہ او عبد الرحمن بن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پر ہے تھے اور ان کو عبد الرحمن بن عوف نے نماز پڑھائی اور («فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ») پڑھی جس میں خلط ملطک کر دیا اس پر آیت اتری («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ»)۔“

۵۔ ((خالد بن عبد الله عن عطاء بن السائب عن ابن عبد الرحمن ان عبد الرحمن صنع طعاماً فدعاه ناساً من أصحاب النبي ﷺ فيهم على بن ابي طالب فقرأ: («فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ لَا أَبْدَ مَا تَعْبُدُونَ») ونحن عابدون ما عبدتم فأنزل الله عزوجل («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ») الآية)) (مستدرک حاکم، کتاب الاشربه، ج ۴، ص: ۱۴۲) ”خالد بن عبد الله، عطاء بن سائب سے، عطاء بیوی عبد الرحمن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کرجن میں علی بن ابی طالبؓ پر یہ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے فُلْ یا یٰهَا الكافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر آیت اتری («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ») الآية۔“ وہ روایت جس میں نام کی تعمیں نہیں۔

۶۔ ((سفیان عن عطاء بن السائب عن ابن عبد الرحمن عن علي قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضرت صلوٰۃ المغارب فقدم عبد الرحمن فقرأ («فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ») فالتبیس عليه فنزلت («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ») الآية)). (مستدرک حاکم، تفسیر سورہ نساء، ج ۲، ص: ۳۰۷)

”سفیان، عطاء بن سائب سے، عطاء، ابو عبد الرحمن سے وہ حضرت علیؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے ہم کو کیا نماز مغرب کا وقت آتا تو ایک آدمی نے امامت کی اور («فُلْ یا یٰهَا الْكَفَرُونَ») پڑھی لیکن اس میں خلط ملطک کر دیا اس پر آیت اتری («لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ») الآية۔“

ان چھ روایتوں میں مختلف تمثیل کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ دوسری عبد الرحمن بن عوفؓ پر یہ تھے، دوسری اور چھٹی میں ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ۱۹۸)

(۱) گزشتہ سے پوستہ کردائی کوئی الصاری تھے۔ پوچھی میں دعوت کے بغیر جلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علی ؓ تھے، جنہوں نے نہیں کچھ کچھ پڑھ دیا، تیسرا، پوچھی، پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبد الرحمن بن عوف ؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علی ؓ تھے دوایت ہے کہ کوئی آدمی امام نہ۔

(۳) اور راویوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، جھٹی میں شراب کا مطلب ذکر نہیں ہے، بلکہ شخص جو امام یا خادم یا شاہکہن سے پی کرایا ہو گوکہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی ؓ تھے کہ پینا جو چیز سے آنحضرت ﷺ کی محبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد «فُلِّ فِيهِمَا إِنَّمَا كَبِيرٌ» (کہدے کہ شراب اور جوے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علی ؓ تھے کہ پینا اور بھی زیادہ و اقدحی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبد الرحمن سلمی جن کا نام عبد اللہ بن جبیب ہے وہ پہلے حضرت علی ؓ تھے کا طرفدار حادی (شیعہ) تھا، بعد کوئی عنانی (خواہی کا طرف دار) اور حضرت علی ؓ تھے کا مقابلہ ہو گیا، پھر اس کا یہ دعوی کہ راوی اس نے حضرت علی ؓ تھے سے ملے ہیں، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن الی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، (نهذیب التهذیب، ج ۵، ص: ۱۸۴) روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظ شراب ہو گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گویفیاں کی اس سے روایتیں حافظی کی خرابی سے پہلے کبھی جاتی تھیں، مگر اور پر کوئی راویوں میں دیکھو کہ خود غیاثیان کی روایتوں میں کسی وہی ناقابل تلقین اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ زیارات غیر مسلم میں (نهذیب التهذیب، ج ۷، ص: ۲۰۵) اور ادعی کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس میں دعوت کی تھی جس میں حضرت علی ؓ تھے اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور ایک صاحب جو خور تھے نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آئیں خلط ملط پڑھ دیں جو نکل دیں اسی واقعہ کے بعد حضرت علی ؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لیے یا تو ابو عبد الرحمن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء بن زریں بھول میں واقعی نسبت اور ہر سے ادھر کروی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہ ؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی مندرجہ سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷۔ (عن ابن هریرہ قال: حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله ﷺ المدنیة وهم يشربون الخمر وياكلون العیرون المسئر فسألوا رسول الله ﷺ عنهم ما فائز الله على نبيه ﷺ: ﴿يَسْتَأْتِلُكُمْ عَنِ الْحُمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِنَّمَا كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ الْنَّاسِ ذَرْ وَمُهْمَمًا أَكْبَرُ مِنْ فَعْهَمَهُ﴾) الآية (۲۱۹) / البقرة: ماجرم علينا انما قال ((فيهما إنما كبر)) و كانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين ام اصحابه في المغرب خلط في قراءته فائز الله فيها اية اغلظ منها ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَتُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَفْلُؤُونَ)) وكان الناس يشربون حتى ياتي احدهم الصلوة وهو مفique ثم انزلت اية اغلظ من ذلك ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَتُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَذْلَامُ وَرَجُسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ)) فقالوا انتهينا بـ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَتُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَفْلُؤُونَ)) وكان الناس يشربون حتى ياتي احدهم الصلوة و حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول الله ﷺ مدیر تشریف لائے تو لوگ شراب پینے تھے اور جوئے کام کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دو فوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی: ((يَسْتَأْتِلُكُمْ عَنِ الْحُمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِنَّمَا كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ الْنَّاسِ ذَرْ وَمُهْمَمًا أَكْبَرُ مِنْ فَعْهَمَهُ)) الآية (۳۵۱) مسنون احمد، ج ۲، ص: ۲۰۱) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول الله ﷺ مدیر تشریف لائے تو لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے تم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دو فوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب بھی لوگ شراب پینے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر تھے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی تراءت میں خلط ملط کر دیا، اس لیے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ حخت آیت اتری ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَتُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَفْلُؤُونَ)) اب بھی لوگ شراب پینے رہے البت جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو وہ کی حالت میں جاتا تھا، بھر اس سے زیادہ حخت آیت نازل ہوئی: ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَتُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَذْلَامُ رَجُسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ)) اب لوگوں نے کہا کہ خدا نہ دندہتم بازارے۔ اس میں حضرت علی ؓ تھے کا ((يَا حاشیاً لَكَ صَفَرٌ))

کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری:

﴿لَا تَقْرِبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّىٰ تَعْلَمُو مَا تَنْهَوْنَ﴾ (۴۳/ النساء)

”نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ تم جو کہواں کو سمجھ بھی سکو۔“

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے علاوہ اور واقعات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد بن وقار بن شعبان کی دعوت کی۔ اس میں شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مارپیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر حکم آیا:

«يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَذْلَامُ رِجُسْ قِنْ عَمَلَ الشَّيْطَنُ

فَاجْتَبَيْهُ لَعْلَكُمْ تَفَلَّمُونَ ۝» (۹۰/ المائدۃ: ۵)

”اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان سے بچو، تاکہ فلاح پاو۔“

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اینہ حمدہ الاماء اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، ابو طلحہ بن عوف کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور جل ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربة میں خود حضرت انس بن عوف کی زبانی روایت ہے:

كَنْتَ اسقِيَ ابَا عَبِيدَةَ وَابَا طَلْحَةَ وَابِي بَنْ كَعْبٍ فَجَاءَهُمْ أَنْتَ فَقَالَ: إِنَّ الْخَمْرَ

حَرَمَتْ ۝

(۱) گزشتہ سے پورت (کہیں ذکر نہیں، حضرت علی بن عوف چیزی قرآن کے صاحب نہیں کی نسبت یہ خیال کرنا کہ یہی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکتے تھے، قبول کے قابل نہیں، مددیں میں حاکم نے مستدرک میں جھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علی بن عوف کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علی بن عوف روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں:

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ فَائِدَةٌ كَثِيرَةٌ وَهِيَ أَنَّ الْخَوَارِجَ تَنْسَبُ هَذَا السُّكْرَ وَهَذَا الْفَرَاءَ إِلَى امِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى بْنِ ابْي طَالِبٍ دُونَ غَيْرِهِ وَقَدْ بَرَأَ اللَّهُ مِنْهَا فَإِنَّهُ رَاوِي هَذَا الْحَدِيثَ (مستدرک تفسیر سورہ نساء، ج ۲، ص: ۳۰۷)

”اور اس حدیث میں بہت براکنکھ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس غلط قراءت کو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب بن عوف کی طرف منسوب کی تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔“

وَرَحْقَيْتُ وَأَقْوَمُ كَصْرَ فَرَادِي تَسْتَعِيْلُنِيْنِ عَمَلَنِيْنِ اُور خارجی راوی نے خود حضرت علی بن عوف کو صاحب واقعہ بنا یا۔

۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی فضل سعد بن ابی وقار: ۶۲۳۸۔

۲) صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب نزل تحريم الخمر: ۵۵۸۲۔

”میں، ابو عبیدہ ابی بن کعب اور ابو طلحہ کو شراب پلار ہاتھا کر ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔“
حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے
کہ اس جلسے میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جن میں حضرت معاذ بن جبل رض بھی شریک تھے، اس موقع پر رکاظ
کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتلوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ * تاہم
جوں ہی آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے پوچھ چکھتک نہیں کی اور فعلتہ جام و
سبتوڑا لے۔ یہ صرف ابو طلحہ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے فی کوچون میں شراب کی ندیاں بہے گئیں۔
بخاری باب المظالم میں ہے:

فجرت في سكك المدينة- ② ” مدینہ کی گلیوں میں شراب بہت پھرتی تھی۔“

انندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا عام رواج ہو گیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اس لیے جو بھی انہیں کے ذریعہ سے کھلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعيّرنا البانها ولحومها وذلك عار يا بن ربيطة ظاهر

”کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں، اے اب ریطہ! ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتے۔“

نحابی بها اکفاء نا و نهیننا و نشرب فی اثمانها و نقامر

”هم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور انکو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب بیٹتے اور جو کھلتے ہیں۔“

اس غرض سے اونٹوں کو زعیر کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور انہی ٹکڑوں پر پانے والے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں فذ، توام، رقب، حلس، مسلب، معلل، منافش، منجح، سفع، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جو اکھیلے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گلڈ مڈ کر کے ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جس کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو

^{٣١} فتح الباري، ج ١٠، ص: ٣١ بحواله روایت ابی عاصم -

² صحيح بخاري، كتاب المظالم، باب صب الخمر في الطريق: ٢٤٦٤.

مکونے مجنع ہوتے تھے ان کو فقیر و بحاجوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لیے قمار بازی کی محلوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ”برم“ کا خطاب دے رکھا تھا۔ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے، ان سے شادی بیوی کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جانشی شاعر اپنی بی بی کو دعیت کرتا ہے:

و اذا هلكت فلا تریدي عاجزا
عنسا ولا بسرا ولا معزا الا
”اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں
”قوم سے عیینہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔“

جوئے کی ایک صورت جس کو ”رہاں“ کہتے تھے یہ تھی کہ شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے چنانچہ جب رو میوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رو میوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لیے چہ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رو میوں کو فتح و ظفر فریض نہ ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنا پڑی۔ یہ قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگاتے تھے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عس و ذیان کی چھل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سودخوری

عرب میں سودخوری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب نے جوقریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھاتے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سودخوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جمعۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقیقی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یا لیل، جسیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے، ہم میرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے میری سے سود کا تقاضا کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

۱ یہ پر مفصل تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱ میں ہے۔

۲ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الروم: ۳۱۹۴ جوئے کی صورت کو رہاں کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔

۳ تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱۔ ۴ تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۵۴۰۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَقُوَّا اللَّهَ وَدُرُوا مَا يَقْتَي مِنَ الرِّبَوَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾

(٢٧٨) / البقرة

”مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔“

ان کے علاوہ طائف ایک سربراہ اور دولت منہ شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خوری نہ کریں گے۔ * اسی طرح یمن کے بخاری سوداگر بھی سودی کا رو بار کرتے تھے ان سے بھی بھی شرط کی گئی۔ *

سود کا عام اور متبادل طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے اور راس المال کے ادا کرنے کے لیے میعاد مقرر کر دیتے تھے جب میعاد گزر جاتی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادائیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھایتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لیے کسی کو مشائلاً سور و پیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادائیں کر سکتا تو میعاد اور بڑھادیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروالیتے تھے یہاں تک کہ بھی بھی یہ اضافہ دو گنی چو گنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جاگہ امتغزق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تنام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً بیدیوں کے ہاتھ میں اگر و تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لیے نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوَا أَضْعَافًا مُضْعَفَةٌ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِمُونَ ﴾

(۱۳۰) /آل عمران

”مسلمانو! دونا، چار گناہ سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائزیات پیدا ہو گئی تھی مشائلاً: اگر رہنمی میعاد متعینہ پر بالی مر ہونہ کو چھڑانہ سکتا تھا تو مر ہن اس کا مالک ہو جاتا تھا * مال و دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کوہ بن رکھواتے۔ *

لوٹ مار

عرب میں روز کی لوٹ مارنے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گرا اور راہران بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جھتے تھے، جنہوں نے راہرانی کو بنا بائنکل ذریعہ معاش اور عام مشغله بنا لیا تھا، اس قسم کے

* فتوح البلدان بلاذری فتح طائف، ص: ۶۲۔ * ابوداود، کتاب الامارة، باب فی الحدالجزیہ: ۳۰۴۔

* مؤط امام مالک، ص: ۳۰۴۔ * بخاری، کتاب المغازی قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷۔

لوگوں کو "لصوص" کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔ یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافری قافلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشیں گوئی کی کہ "وہ دن آئے گا کہ جب حیرہ سے ایک پردہ نین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی۔" چونکہ دقبیلہ طے کے رہنمی تھے اور ان کو اس قبیلے کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تاجرتوں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے میدان میں سے بسلامت نہیں گزر سکتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہاتک کر لے جاتا تھا۔ چنانچہ صحن کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لیے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صحن کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا۔ کامیاب ڈاکو اپنے کارنا میں کاظم کرتے تھے اور غیر یہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

الصَّابِحُ فَالْغَانِمُ فَالْأَئِبُ
 يَا الْهَفْ زِيَادَةً لِلْحَارَثٍ
 ”اے زیادہ کافوس حارث کے لیے جو صبح کوڈا کہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت
 واپس جانے والا ہے۔“

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ کے ماں و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لیے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاک کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بد دوں میں چوری کا رواج عام تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلمہ اور تابطہ شرہ اشہرت عام رکھتے تھے، تابطہ شرہ اکا ایک قطع جماں میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلگری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تھا رت کے سب سے دولت بھی تھی اور خود خاصہ کعبہ میں تھکنوں اور نذر انوں کا خزانہ جمع رہتا

^١ صحيح بخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام: ٣٥٩٥.

تھا، اس لیے ان میں چوری کے موقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرالیا تھا۔ بلکہ اس کے لیے خاص طور سے ابوالہب کا نام لیا جاتا ہے۔

عام بعد عربوں میں یہ براہی جتنی عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عروتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاهدہ بھی لیتے تھے کہ ”وہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔“ بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاهدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چہری کے کنارے ایک ٹیڑھالوہا (ججن) لگا کر کھا تھا جس کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکولوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جمینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔

پونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لیے اس کے لیے غیرہ بیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ واقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا چنانچہ مدینہ میں بشیر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے، جن کو ”بنو ایرق“ کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجوں میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاعتنا می ایک شخص کے بالا خانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ ﷺ نے رفاعم کے ہتھیار والیں دلائے، لیکن رفاعم نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لیے قرآن پاک نے عروتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿وَلَا يَرْثِقُنَ﴾ (٦٠ / الممتتحة: ۱۲) یعنی ”وہ چوری نہ کریں گی۔“ شرفاً اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے اس لیے یہ براہی رکنے نہیں پاتی تھی،

١- فتح الباری، ج ۱۲، ص: ۷۷۔ ٢- كتاب المعارف لابن قتيبة، ص: ۵۵۔

٣- صحیح بخاری، كتاب الحدود، باب الحدود كفارۃ: ۲۷۸۴۔ ٤- ٦٠ / الممتتحة: ۱۲۔

٥- مسلم، كتاب الكسوف، باب ما عرض على النبي ﷺ في صلوة الكسوف من أمر الجنة والنار: ۲۱۰۲۔

٦- بخاری، كتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار وزمینة: ۳۵۱۶؛ مسلم، كتاب المناقب، باب من فضائل غفار واسلم وغفار: ۶۴۴۴۔ ٧- ترمذی، كتاب التفسیر سورة النساء: ۳۰۳۶۔

چنانچہ اسلام کے بعد ہی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو تخت ترددہوا اور لوگوں نے کہا، اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسماء بن زید ؓ کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟" پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "گزشتہ قویں صرف اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمدؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔"

خود شہر کے اندر اس قسم کی واردات کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سور ہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑالیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا یا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کا نئے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔"

سفاق کی وبے رحمی و وحشت

رات دن کی لوت مار اور کشت و خون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہاں اور چکیاں کاٹ کر کتاب لگاتے اور یہاں کی بڑی مرغوب خذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنچتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پیں گے۔

سرزادینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دور ختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سر پٹ دوڑا دیتے، اس کے بدن کے نکٹے اڑ جاتے، اس قسم کی سزا میں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسادیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے ترپ کر مرجاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں "صبر" تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مرجاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے۔

* بخاری، کتاب الحدود، باب کراہی الشفاعة فی الحدود اذارفع الى السلطان: ۶۷۸۸ -

* دارقطنی، کتاب الحدود والدیات، ۳ / ۲۰۴ - ۳۴۳۰

زن اور فو احش

زن اور فو احش و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخر یہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے۔ امر القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور ولی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ، اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو افعال شنید اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، باوجود اس کے کاس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچ پچ کی زبان پر تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالا علان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ حکم خلا کرنا تو کہیہ پن ہے لیکن چھپ کرنے میں مضائقہ نہیں ۱۴ فاطمہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر پیٹھیں تھیں ۱۵ اور صاحب جائد اکھلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برادر سمجھی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے ابی عورتیں خود مکہ معظملہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام ”عناق“ تھا۔ مرشد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے انجذبیت میں عناق سے نکاح کروں۔ اس پر یہ آیت اتری ۱۶

﴿وَالْزَانِيَةُ لَا يَكِنُهَا إِلَازَانٍ أَوْ مُشْرِكٍ﴾ (۲۴ / النور: ۳۰)

”اور زانی عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔“

بڑے بڑے روسا گھر کی لوٹدی یوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کمالا کیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کارمیں تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ بھرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوایا تھا کہ اس کو بادشاہ بنانا کر پہننا کیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے۔ عبداللہ بن ابی کی دو لوٹدیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیکہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرنے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری ۱۷

﴿وَلَا تُنْرِهُوْ فَتَيَّبُكُمْ عَلَى الْيَقَاءِ﴾ (۲۴ / النور: ۳۲)

”اپنی لوٹدیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔“

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، پچ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آ جائیں گے جس کا یہ نظر ہے۔

دوسرہ طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے

۱۴ نفسیر طبری آیت: محصنت غیر مساخت، ج ۵، ص: ۱۳، مصر۔

۱۵ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا نکاح الا بولی: ۵۱۲۷۔

۱۶ ابو داود، کتاب النکاح، باب قوله: الزانی لا ينكح الا زانیۃ: ۲۰۵۱۔

۱۷ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ ﴿وَلَا تکرھوْ فَتَيَّبُكُمْ عَلَى الْيَقَاءِ﴾: ۷۵۵۳۔

پاں جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجنی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بینا سمجھا جاتا۔ تمرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیازہ شناس کو بلوا بھیجنیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نکاح الا بولی: ۱۲۷ میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔ ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعدد کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورتہ چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرم و بے حیاٰ

شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے تھے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادرزاد ننگ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں:

الیوم یَدْوُ بَعْضَهَا اُوكِلَهُ فَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أَحْلَهُ

”آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گایسا را اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔“

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ *

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ *

پاخانہ پیشاب کے وقت پر دہ نہیں کرتے تھے * جلوسوں میں بیٹھتے تو یو یوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے * سوتیلی ماوں پر وراشہ قبضہ کر کے بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، سورث کے متزوکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تواریک پڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی

* صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالى: ﴿لَخَلُونَا زِينَتُكُمْ عِنْدَكُلِّ مسْجِدٍ﴾: ۷۵۵۔

* نسانی، کتاب الغسل، باب الاستمار عند الغسل: ۴۰۶۔ * ابو داود، کتاب الطهارة، باب الاستبراء

من البول: ۲۱۔ * ابو داود، کتاب النکاح، باب ما يكره من ذكر الرجل ما يكون من اصابته اهلة: ۲۱۷۴۔

اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود واس کے کہ سب کے ناموس بر باد ہو چکے ہوتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اشعار میں ادا کرتے۔ بنو ضہبہ نے جب بنو عاصم پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوایا۔ فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

فظلت و ظلت يربکون هبیرها وليس لهم الا عوايلها ستر

”تو لوگ عورتوں پر متصروف ہو گئے اور اگر کوئی پر دہنچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔“

قہیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ حر حان کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نكحت نساء هم بغیر مهور ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمر و معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب بر باد ہوئی تو عمر نے کہا:

امن ریحانة الداعی السمیع ”کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے۔“

یورقنى واصحابى هجوع ”جس نے گوجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔“

اذالم تستطع امرا فدعا ”اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر

وجاوزه الى ماتستطيع وہ کرو جو کر سکتے ہو۔“

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدالت نہیں لیتی جب تک شوہر چاہے ہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ غیلان بن سلمہ ثقیفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدی نے اسلام قول کیا تو ان کے عقد نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ *

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹی کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں بھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت نیک کوثری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جانے خوبیوں غیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوثری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں میگنی وہی جاتی وہ میگنی کو پھیلک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی۔ * عورت کا جو مہر مقرر ہوتا

۱۔ کتاب الاغانی، جزء ناسع، ص: ۱۲۔ اخبار درید بن الصمة۔

۲۔ ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم و عنده نساء اکثر من اربع: ۲۲۴۱۔

۳۔ ابو داود، کتاب الطلاق، باب احادیث المתוی عنها زوجها: ۲۲۹۹۔

وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَهْدُمْ بِالأنْتِلْيٰ طَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًا وَهُوَ لَظِيمٌ يَتَوَلَّ إِنَّ الْقَوْمَ مِنْ سُوءٍ مَّا يُفْكِرُهُ طَائِسَةٌ عَلَى هُوْنَ أَمْيَدُشَةٌ فِي التَّرَابِ﴾ (۱۶، النحل: ۵۸، ۵۹)

”اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کر لے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔“

ابو حمزہ ایک رئیس تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یا اشعار پڑھ پڑھ کر پھی کو لوریاں دیتی تھیں:

مالا بی حمزہ لا یاتینا بیت فی بیت اللئی تلینا
”ابو حمزہ کو یہاں ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔“

غضبان الا نلد البنینا تاللہ ماذاک بایدینا
”اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹیں بنتے، خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔“

ونحن کا لزرع لزار عینا نبت ما قد زرعوه فینا
”ہم بطور کھیت کے ہیں، ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔“

رفتہ رفتہ دفتر کشی کی رسم جاری ہو گئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر زمین کھوڈتے اور زندہ گاڑو یتے اس کو عربی میں واد کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ فن کیں۔ *

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تواریخ چلائے۔
عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائزہ نخواہ بن جاتی۔ *

وحشت و جہالت

حلال و حرام کی کوئی تیز نہ تھی ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے۔ حشرات الارض عام غذا تھی،

۱ تفسیر ابن جریر تفسیر سورہ ﴿إِذَا الشَّمْسُ تُكَوَّرَتُ﴾ جز ۲۰، ص: ۴۰؛ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورہ مذکورہ، جز ۴، ص: ۴۷۸۔ ۲ تفسیر ابن جریر، تفسیر ﴿يُوَصِّبُكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِي كُلُّ حَطَّ الْأَنْثُرِينَ﴾ جز ۴، ص: ۱۹۲ تفسیر ﴿وَلَا تَعْضُلُهُنَّ﴾

۳ ایضاً، ص: ۱۷۱۔

چھپکی تک کھا جاتے تھے، خون کو جمالیتے تھے اور قاشیں تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ ❶
چڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے، گروں مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے، ❷ گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ ❸

عرب کا مشہور جاہلی شاعر عاشی، سیمون جس نے آغازِ اسلام کا زمانہ پایا اور اہل عرب نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں:

وَايَاكَ وَالْمِيتَاتِ لَا تَأْكُلُنَّهَا ❹

”مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔“

وَذَا النَّصْبِ الْمَنْصُوبِ لَا تَنْسَكِنْهُ ❺

”اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر اور اللہ کی عبادت کر۔“

وَلَا السَّائِلَ الْمُحْرُومَ لَا تَرْكِنْهُ ❻

”اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لیے مت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بند ہے ہوئے قیدی کو۔“

وَلَا تَسْخِرْنَ مِنْ بَائِسْ ذِي ضَرَارَةٍ ❻

”اور نہ کسی مصیبت زدہ مغلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کر مال آدمی کے لیے ہمیشہ رہنے والا ہے۔“

وَلَا تَقْرِبِنَ جَارَةً أَنْ سَرَّهَا ❻

”اورنہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر، وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر لے اور یا کنوار اڑ جا۔“

❶ اسباب التزویل سیوطی آیت «حُرُمَتْ عَلَيْكُمُ الْمُتَّهِّنَةُ» بر حاشیہ تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، ص: ۹۸۔

❷ تفسیر طبری، سورۃ مائدۃ بیان ماکولات۔

❸ صحیح نسائی، کتاب الصید والذبائح، باب تحریم اکل لحوم الحمر الahlیة: ۴۳۴۵، ۴۳۴۶۔

❹ دیوان اعشنی مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء، ص: ۱۰۳ و شعراء النصرانیة، قسم ثالث، ص: ۳۶۵۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بنے کی الہیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی انہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحبتِ نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح انسگی ہے۔ شہلی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متوار روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی، تو رواۃ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے، چنانچہ ریورنڈ فارمنٹ نے ۱۸۲۳ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متین کی ہیں، قدیم یہودی مؤرخ یوسفیوس نے بھی یہی لکھا ہے ॥ اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسمائیل لفشنون نے تاریخ اليهود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحبت پر دلیلیں پیش کی ہیں ॥ اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لیے یہ نسبت پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے ॥ اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا:

﴿مَلَّةٌ أَيْنَكُمْ أُبَرِّهِمٌ﴾ (۲۲/الحج: ۷۸) “تمہارے باپ ابراہیم کا نہ ہب۔”

حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام بنا مسلمان نسب کے پانچھے میں پشتلوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ عوی کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرآن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو رواۃ نے میں قائم و باقی ہے وہی خیسے ہیں، وہی صحراء ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بد و یانہ زندگی ہے، وہی رسم و رواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ کا حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قریب ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ مشہور جرم من محقق نولڈ یک کہتا ہے:

٢٥۔ ترجمہ انگریزی ۱۸۲۳ء جلد اول، ص: ۲۵۔ ۲۵۔ تاریخ اليهود فی بلاد العرب لا سرائیل ولفشنون مطبوعہ مطبعة

الاعتماد مصر، ص: ۷۶، ۷۵۔ ۲۵۔ سیٹ پال گلکنیز کے نام باب ۲۵۔ کتاب العہد الحمدی، ص: ۵۸۱۔

”اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔“ *

الم عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور سبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کے سلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے محفوظ رکھتے تھے قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشائیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ خصوص ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جوں اور کسی خاص طبق نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لیے محدث رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی پدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی پر درکی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعاء مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل میں دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصادق بننے کے لیے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ خصوص کیا۔
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات و اخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً: وہ باوجود داداں کے کہ ہر چار طرف سے مختلف بڑے بڑے نہیوں سے گمراہ ہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ مجوسیت غلط فارس سے لے کر یہیں تک حکمران تھی، یہودیت یہیں اور جماز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسیٰ یسیت اپنی فوج و شکر اور راہبوں اور قسمیوں کے دل بادل کے ساتھ یہیں سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسیٰ بنا بھی چکی تھی مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیدار لوگ ہوتے تھے وہ جوئی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیم کا پیر و کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام ”دین علیفی“ رکھتے تھے اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دین ابراہیم کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلارہے۔

* انسیکلوپیڈیا برائیک اٹھ یا زدہم مضمون ”النس سامی“ میں نے ارض القرآن، جلد اول، ص: ۱۰۷ سے ص: ۱۱۶ اس پر مدل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے کیجا کر دیے ہیں۔

حاکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر یوز بر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا کہ، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صد یوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر تدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو ٹکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنے حرس و آڑ کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر ہیں، گستاخ یوسائی چمیشیوں نے میکن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے جھرمٹ کے ساتھ مکہ معظمه پر چڑھائی کی مگر قدرتِ الہی نے ان کو بتاہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام و انتظام اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جابران قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد بر باوند کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری نہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیہ فطرت کے سواہ قسم کے کتابی علم سے وہ نا آشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلائی اور کچھ بحث نہ ڈھنیت سے پاک تھے وہ اُمی تھے، تاکہ ایک اُمی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار ہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسرا طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بھری جائے موقع نے اس کو جزاً اور دوسرے ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لیے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر، ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزاں، تیونس، مرکش اور اپیں تک جا پہنچ اور بھری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر افریقہ، جبکہ، زنجبار پھر اہر جزاں کرہند، جواہ، سماڑ، اور چین تک ان کا گزر رہا، اور دوسری طرف ساپرس، کریٹ اور سلیمی تک ان کا پر چم لہرا یا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میراۓ کے عرب کی جائے موقع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اپیں اور سلیمی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ در کار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشتری اور مغربی طاقتیوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برا بر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موجود نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پہنچوں سے نجات دینا با آسانی ممکن ہو۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاہد، نمونہ اور مصلح بننے کے لیے پکھا اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسری و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

بر جوش تھے

ساتھ ہی وہ پر جوش بھی تھے اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے نکلا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے۔ بحودیر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزمِ راست سے ارکانِ عالم کو متنزل کر دیا۔

۱۷

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنادیا تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جونفاق کا غضیر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا اور نہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کام اک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش و ایقان

باوجدوں کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، خالد، ابو عبیدہ بن الجراح میں شہدا وغیرہ پیشکروں ہزاروں صحابہ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو کوئی تجھیاں کیس وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متقدم تو ممون سے جس طرح انہوں نے معاملہ، ہراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے لمحے سے لمحے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سمجھایا وہ خود اسی تجھے کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعر کے کلام، ان کے مقرر دوں کی تقریریں، ان کے فصحاء کے مقولے سنئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا

اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ عل و گہروہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے قیز تھے

نظرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قومی بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قومی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں ان کے بعض قومی بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اور اراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا میکی سبب ہے کہ ان کے شعر اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو بربازان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریری کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہت سرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ آئینیں کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سر ما بڑا تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سیکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف حرفاً اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہل عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انعام دیا۔

فیاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑادیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لیے ادنوں کو ذخیر کر کے کھلا دینا یا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات و ذکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے مکحوم نہ ہوئے تھے اور نہ وہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لیے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو دل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکا نہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لا ایماں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقة کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے۔ اہل عرب کے اس جذبے نے حق گوئی مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مددی۔

عملی تھے

اہل عرب کے فطری اخلاق و کردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایمان اور اہل ہند کی طرح محض تخلیق پسند، خیال آراء اور نظریہ بازنہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچار اور کیسے، کیونکہ کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کار و باری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوز اعمال بن جاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجنے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہر تن عمل اور صرف عمل تھے اسی بنا پر شارع غایلہ نے ان کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنادیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور دور دور سے بدھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے اور شک و جھٹ اور مناظر وہ قیل و قال کے بغیر فراکض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنانیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی اور دنیاوی فائدہ اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر مترزاول یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہل عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے پاک و مبرار کھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق اور شمال و جنوب میں اسلام کا پھریریا آسان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ا Hazel سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے ان کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آپنے چتوان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لیے خزانہ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہندو ہجوم میں تھانہ روم و فرنگ میں اور نہ ترک میں تھانہ زنگ میں، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے ہاتھ میں پرستی کی، آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ابراہیم غایلہ

کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو هاشم اور بنو هاشم میں سے مجھ کو۔ * ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں عبدالمطلب کے بیٹے عبد اللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے ان تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں میں (عرب و عموم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصے میں یعنی عرب میں بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔ *

• صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ: ٥٩٣٨؛ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ٣٦٠٦، ٣٦٠٥۔
 • جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ٣٦٠٧۔

سعادت حج

دنیا اور عرب کی سرز میں اس ظلمت میں تھی کہ صحیح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غافلہ برپا ہوا، ظلمت شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پر ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گودنیا کروشن کرنے لگا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی زمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرور کائنات علیٰ گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا اور اس بناء پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لیے ابتدک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کار آمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصور یہو، وہ جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنس عملی خطیب بن کر گرد و پیش کوایا ہم زبان اور ہم عمل بنالے۔

اس بنا پر خاتم الانبیاء ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے (آنیٰ فَكَلَّمُهُمْ عَلَى الْعِلَمِينَ ۝) (البقرہ: ۲۷) ”هم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی۔“ کاتا ج پہن چکی تھی لیکن اوپر تفصیل گز رچکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کرتی کی رو حفا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا مشیت ایزدی نے اسی کوتا کا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درنہ بن چکا تھا (كُنِمْ خَيْرَ أَمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوُنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) (آل عمران: ۱۱۰) ”تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے (پرہ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔“ کامظہر بن گیا۔

شادہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیر نہ قدمِ عالم کے لیے معموت ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں بیس چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

يدعو قوماً إلى السنة الراسدة ويزكيهم ويصلح شانهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه في jihad اهل الأرض ويفرغهم في البلاد وهو قوله تعالى: «كُلُّمَّ خَيْرٍ مَا أَخْرَجَتِ النَّاسُ».

”حجۃ اللہ البالغہ، ص: ۱۲۳ مطبوعہ ہند)“
 ”وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے، پھر ان کو اپنا درست و باز و بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعے سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہتر ان امت ہو جو دنیا کے لئے یاد کے گئے ہو۔“

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوا الزَّكُوْةَ وَأَمْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (٤١/الحج: ٢٢)

”وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔“

اصلاح وہادیت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح وہادیت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گوناگون اور لا اعلان مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قادر انسانی سے بالآخر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزرا کا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے مخچہ ستم سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر رذالت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر سخت سلطنت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خداداد نوں جا کر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے کدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتبے امرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر مفترض نہیں ہو گئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا ضریب نہ ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جهالت

عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاو، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جوان کے کان میں پڑتا تھا ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کے اس جاہل نہ حیرت و استعجاب کو متعدد آئیوں میں ذکر کیا ہے:

﴿لَيْسَ هُوَ الْقُرْآنُ الْكَيْمُونُ إِنَّكَ لَوْمَنَ الْمُرْسَلِينَ لَكُمْ عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ تَنْذِيلُ الْعَزِيزِ

الرَّحِيمُونَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَا أَنذَرَ إِلَيْهِمْ فَهُمْ غَافِلُونَ﴾ (٦١/یس: ٣٦)

”قرآن حکیم کی قسم ہے تو بے شبه بغیروں میں سے ہے، راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اتراء ہے، تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔“

یہ بیوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی نہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

وَعَجِّلُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ قَنْتَهُمْ وَقَالَ الْكُفَّارُونَ هَذَا الْحَرُكَدَابٌ إِنْ جَعَلَ اللَّهُهَ إِلَهًا
وَاحِدًا إِنْ هَذَا شَفَاعٌ عَجِّلَابٌ وَانْطَلَقَ الْمُلْكٌ مِنْهُمْ أَنْ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَى الْفَتْكِمُهُ
إِنْ هَذَا شَفَاعٌ عَيْرُادُهُ مَا سَمِعْنَا بِهِدَى فِي الْيَوْمَ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

(ص: ۳۸ / ۷-۴)

”اور انہوں نے تجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو، جادوگر ہے اس نے اتنے خداوں کا ایک خدا بنایا، یہ عجیب بات ہے، ان کے نئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبدوں پر جئے رہو، اس میں اس کی پیغمبری کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنایا سب گھری ہوئی بات ہے۔“

﴿بَلْ يَعْجِزُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ قَنْتَهُمْ فَقَالَ الْكُفَّارُونَ هَذَا شَفَاعٌ عَجِّلَابٌ ۝﴾

(ف: ۵۰ / ۲)

”بلکہ ان کو تجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا: یہ تو بڑے تجب کی بات ہے۔“

صفاتِ الہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد ان میں سے ہر بات کوں کروہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جائے تھے اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں اس منصب پر تو فرشتوں کو متاز ہونا چاہیے تھا:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا كُلُّاً أَنْزِلْنَا عَلَيْنَا مَلِكَةً ۝﴾ (الفرقان: ۲۱)

”اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے مکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔“

﴿إِذْ جَاءَتْهُمُ الرَّسُولُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهُ طَقَالُوا لَوْشَاءَ
رَبِّنَا الْأَنْزَلَ مَلِكَةً فِي تَأْبِيَّاً أَرْسَلْنَاهُ لِكُفَّارِنَ ۝﴾ (السجدۃ: ۴۱ / ختم السجدۃ)

”پیغمبر جب ان کے سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو، تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجننا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔“

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَى إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولاً ۝ قُلْ
لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلِكَةً يَمْشُونَ مُظْبَّتِينَ لَكُلُّنَا عَلَيْهِمْ قِنَ الشَّمَاءَ مَلِكًا رَسُولاً ۝﴾

(بیان اسراء بل: ۹۵ / ۱۷)

”ہدایت آنے کے بعد صرف اس شہر نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا غدر نے

آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے نہتے ہوتے تو
البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔“

نبی کا تخيّل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراء صورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات
سے منزہ ہو، اس کے پیچے خدا اور فرشتوں کا پراہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں:

﴿وَقَالُوا لَنَاٰنْ تُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَنْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْتَوِعًاٰٰ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ تَخْيِيلٍ
وَعَنِيٰ تَفْقِيرًا لَا يَهْرُكُهَا تَقْحِيرًاٰٰ أَوْ سُقْطًا السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًاٰ أَوْ تَأْنِيٰ بِاللَّهِ
وَالْمَلِكَةَ قَبِيلًاٰٰ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ رُخْرُفٍ أَوْ تَرْقِيٰ فِي السَّمَاءِٰٰ﴾

(۱۷/ بنی اسراء یہل: ۹۰، ۹۳)

”انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے
ہمارے لیے تو چشمہ نہ بہادے، یا تیری ملکیت میں کھبوروں اور انگوروں کا کوئی باعث نہ ہو، جن
میں نہیں جاری کروی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہم پر بادل کا کوئی نکولاً کرادے، یا خدا اور فرشتوں
کو پراہنا کرنے لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔“

﴿وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولُ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِٰ لَوْلَا أَنْزَلَ إِلَيْهِ مَلِكٌ
فَيَكُونَ مَعَهُ نَزِيرًاٰٰ أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كُنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَاٰٰ﴾

(۲۵/ الفرقان: ۷، ۸)

”انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی
فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈرایتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال
دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باعث ہوتا جس سے یہ کھاتا۔“

پیغمبر کے لیے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی
بڑی جائیداد ہو، میواؤں کے ہرے بھرے باعث اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشته
آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لیے مک اور طائف کے جو روسادولت مند تھے وہ
اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِيلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ قَنْ الْقَرِيبَيْنَ عَظِيمٌٰ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۳۱)

”وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کدے یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترًا۔“
کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی

کھاکی ترشی تر شائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے جمع میں اترائے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كُفَّرُوا إِنَّ الْوَلَا تُزَيلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً﴾ (۲۵/ الفرقان: ۳۲)

”کافروں نے کہا، اس پر قرآن بیکارگی کیوں نہیں اترائے۔“

﴿وَلَئِنْ تُؤْمِنَ لَرَوْقِيَّكَ حَتَّىٰ تُتَزَّلَ عَلَيْنَا كَلِيَّاً فَقَرُوَةً﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۳)

”اور کافروں نے کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے، جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔“

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كَلِيًّا فِي قُطْلَابِنِ فَلَمْسُوْهُ يَأْنِيْهُمْ لَقَالَ الَّذِينَ كُفَّرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ (۶/ الانعام: ۷)

”اور اگر کاغذوں میں لکھا ہوا کوئی قرآن آسمان سے تم پر اترے جس کو تم اپنے ہاتھ سے نٹول بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“

غرض ایک آسمانی نہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ الہیت اور صفاتِ الہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، بزدل کتاب کی حقیقت ہر چیزان کے لیے حیرت اور استجواب کا سرما یا تھی:

﴿أَفَلَمْ يَذَرِّبُوا الْقُولُ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ أَبْعَاهُمُ الْأَوَّلِينَ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمُ الْمُمْنِكُونَ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۶۸، ۶۹)

”کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔“

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدائے ناماؤں نہ تھے ان تک آواز پہنچنے کی دریتی وہ سرتاپالیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفی کے آغوش پر دردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی سبی حال تھا، مشرکین کلامِ الہی کا جواب خندہ تحقیر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دلناچشم پر نہ اور دل پر کیف تھے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْلَحَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا مَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَسْأَلُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا﴾

(۱۷/ بنی اسراء: ۱۰۷، ۱۰۹)

”جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاری) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ بحد میں گڑ پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے

(ایک بیخبر آخراً زمان سمجھنے کا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رکروہ منہ کے مل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوں کو اور بڑھاتا ہے۔“

﴿وَلَتَعْدَنَ أَقْرَبُهُمْ مُّؤْمِنَةً لِّلَّذِينَ أَمْنَوْا إِنَّمَا نَصَّارَىٰ طَلِيكَ يَأْكُلُونَهُمْ قَيْسِيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَالْهُمَّ لَا يَسْتَأْلِعُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْهِ الرَّسُولُ تَرَىٰ أَعْيُّهُمْ تَقْفِيْضُ مِنَ الدَّرْدُمْعِ مِنَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَمْنَا فَأَلْتَبَانَمَ الشَّهِيدِيْنَ ﴾ ۵)

(الماائدۃ: ۸۲، ۸۳)

”ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہی ہے کہ ان میں قیسیں اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو بیخبر پر اتراتے ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پیچاں کر آنسو بھاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا یا! ہم ایمان لائے ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔“

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینا اور تعصّب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی کو راٹھنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، تاہم ہشم دل کو بنیش حق سے بازیں رکھ سکتے تھے:

﴿الَّذِينَ أَتَيْتُهُمُ الْكِتَابَ يَعْرُفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْيَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۴۶)

”جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس بیخبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔“

﴿وَلَئِنْ جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلٍ يَسْتَقْبِطُونَ عَلَىٰ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا أَفَرُوا إِيمَانَهُمْ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۸۹)

”اور جب خدا کے پاس سے بیخبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو بچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کراس کا انکار کرتے ہیں۔“

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تو بھی یہ حقیقت مشکف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا گا ہوں کا جو یاں ہے، حضرت سعید بن زید، عثمان بن مظعون، صحیب روی، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، علی بن ابی طہہ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے۔ ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن واکل وغیرہ قریش کے مشرکین خدا کا کلام

تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی نگین میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار تقریباً آن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، کہ کے مشرک ترپن (۵۳) برس تک آپ کے چہرہ پر نور کو دیکھتے رہے لیکن نور الہی کو نہ پہچان سکے اور عبد اللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پر انور کو دیکھا اور پکارا ٹھے کہ یہ حق کی جگل ہے۔ رو سائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نژول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جتنی نہیں کرتے، نجاشی حکومت کی مند پر اور ہر قل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غالباً نہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور ترپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو خکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اسی دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جمال، بنی پر پھر بر ساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی مخصوصیت دیکھ کر دل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ یہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نام حرم دعوت حق کا جواب ایس برس تک تخفیف و سنان سے دیتے ہیں، لیکن پیرب، بحر، یمن، عمان، بحرین کے بڑے بڑے عیسائی اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوہیوں کے اثر سے ان رموز سے کس قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعۃ مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر قریب کو غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ اس کے قول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں۔ دوست و آشنا کا چھوٹا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جامد اوسے دوست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع اور وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الافت، حق و باطل کی تیزی اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بد و یادہ خصوصیتیں جو تواریخ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سماں قوموں سے مت لگیں مگر عرب میں اس وقت بھی نہیاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں وہیں ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں متاثرا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے ان کے شعر و شاعری اور فخر و مبارکات کا سب سے پر جوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی آبائی دین کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرا یا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ أَتَيْعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا إِنَّا نَتَّبِعُ مَا أَفْيَانَا عَلَيْهِ أَبَاءَنَا إِنَّا أَنُوْكَانَ﴾

﴿أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (۱۷۰ / البقرة)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتا رہے اس کی پیروی کرو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)۔“

﴿بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا أَبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةً وَإِنَّا عَلَىٰ أُثْرِهِمْ مُهَتَّدُونَ وَلَكِنَّا لِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ

فَيْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَزِيلٍ إِلَّا قَالَ مُتَرْفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا أَبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةً وَإِنَّا عَلَىٰ أُثْرِهِمْ

مُهَتَّدُونَ قُلْ أَلَوْ جِئْنُكُمْ بِأَهْدِي وَمَا وَجَدْنُمْ عَلَيْهِ أَبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا يَهْيَا أُرْسَلُمُرِيهِ

كُفِّرُونَ﴾ (۴۳ / الزخرف) (۲۴-۲۲)

”بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روشن پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر راہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اپنے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روشن پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر! کیا اگر چہ میں اس روشن سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستے لے کرتہ ہمارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم انہیں کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو (جودے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔“

﴿وَإِذَا فَعَلُوا فَاحْشَأْهُمْ قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهِمَا أَبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمْرَنَا بِهَذَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ

بِالْفُحْشَاءِ إِلَّا قَوْلُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۷ / الاعراف)

”اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ داۓ پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔“

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ يَعْلَمُوا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

أَبَاءَنَا إِنَّا أَنُوْكَانَ أَبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (۵ / المائدۃ)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور اس کے رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے، وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)“

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّبِينٍ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَتَعْلَمُ
مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَعْلَمُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ أَبَاعَنَاهُ أَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُهُمْ إِلَى
عَذَابِ السَّعْيِ﴾ (۲۱، ۲۰ / لقمان)

”کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور وشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)“

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسم کو چھوڑنا کس درجہ حال نظر آتا تھا، آپ ﷺ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرسی کی علانیہ نہ مت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بلا جرم ہبھی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تختیر، بزرگوں کی تو ہیں اور آبائی رسم و رواج کی نہ مت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر بلیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جوازرات قائم کیے وہ یہ تھے ”اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے نمہب کی تو ہیں کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گراہ بتاتا ہے تو یا تو تم ان کو روکو، یا ہم کو اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔“

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا۔ ابوطالب نے ان کو سمجھا بھتیجا کرو اپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر انہا مطالبه ان الفاظ میں پیش کیا ”اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم! ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی جو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لٹنے پر آمادہ ہو جاؤ“، اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ”اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارة کیسا خوش و جوان ہے تم اس کو متمنی بنالو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیے ہمارے حوالہ کرو کہ اس نے تمہارے اوپر تمہارے بزرگوں کے دین و نمہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پر اگنده کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔“ سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں

نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا: ”امے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو رکھا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا گرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔“ *

ان الزمات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پر حکوم معلوم ہو گا کہ آبائی دین، موروٹی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بارخا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے۔ موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر تو حید کا پیغام سناتے تھے تو ابوالہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ ”لوگوں ایہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشثہ کرتا پھرتا ہے۔“ *

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے، سمجھنے بار بار کہا: ”بچپا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔“ ابوطالب نے جواب دیا: ”جان پدر! اس سب کچھ تم پر شار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور زرع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ”بچپا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔“ ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ جوان کے پاس بیٹھے تھے کہا: ”ابوطالب! کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔“ آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابوطالب نے مہی کہا کہ ”میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔“ اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، * صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ ”اے سمجھنے اجو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں محضی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔“ * ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہتہ سے وہ فقرہ کہہ دیا * بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی خالقین کے پاس باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ پر زور اور پراثر دلیل نہ تھی کہ ”ابوطالب! کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟“ اس سے معلوم ہو گا کہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں یہ تخلیل کتنا بڑا پھر تھا۔

* یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں تفصیل مذکور ہیں۔ ملاحظہ ہوں سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۵۲۔

* مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۱۵ کتاب الایمان۔ * صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذاق المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ: ۱۳۶۰۔ * صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی صحة الاسلام من حضرہ الموت الخ: ۱۳۵۔ * ابن ہشام وفات ابی طالب، ذکر الاسراء والمعراج، ج ۱، ص: ۲۵۳۔

تو ہم پرستی

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی تو ہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں بیج کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلا کیں آ کر ہم کو پلت جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، بتوں سے یہ خیال رائج چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتا ہی کی گئی تو آسمان سے پانی برستا بند ہو جائے گا، فرزند نزیرہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں بچل نہ آئیں گے، اسی بنابر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخيیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے حواب میں ثبوت نے کہا:

﴿إِنَّنِيْ نَقُولُ إِلَّا أَعْتَرِلُكَ بَعْضَ الْهَمَنَاسِوْعَطِ﴾ (۱۱/ ۵۴: هود)

”ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آ کے ستایا ہے۔“

ابتداء میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعواز بالله) پاگل سمجھ لیا جامیلت کے زمانہ کے بعض کافرا حباب ہمدردی کی راہ سے جہاڑ پھونک کرنے آئے ضمام بن تعلبہ رض ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزی کی نذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ”ضمام! ان کو بران کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔“ حضرت زینہ رض مسلمان ہونے کے بعد بصرات سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا ”لات و عزی نے ان کو اندا کر دیا ہے۔“ حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے دُلپن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ”دیکھو والشی (بت) کہیں بر بادنہ کر دے۔“ فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو پکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزی، منات، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے۔ خاص مدینہ سے رائج الایمان مسلمان بھیج گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا۔ پوچار یوں نے کوئی مراجحت نہ کی وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون تو رکسلتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود بتا وہ بر بادنہ کر جائے گا۔

۱) ان کی تفسیر سورہ حمود، (آیت نمبر، ج ۲، ص: ۳۳۹) زختری، ج ۸، ص: ۱۷؛ ابن حیان، ج ۵، ص: ۳۳، بغوي و غيره تمام مفسرین نے لکھا ہے۔ ۲) دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص: ۳۰۲، و تفسیر آیت (ما اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَعْنَوْنَ ۵) و نیز «ما بصالحهم من جنة» صحيح مسلم، کتاب الجمعة، باب تحفیض الصلوة والخطبة: ۲۰۰۸۔ ۳) دارمی، کتاب الصلوة، باب فرض الوضوء والصلوة: ۶۵۲۔ ۴) اسد الغایب، ترجمہ حضرت زینہ، ج ۵، ص: ۴۶۲؛ و سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین علی المستضعفين، ج ۱، ص: ۱۹۰۔ ۵) اسد الغایب ذکر طفیل بن عمرو دوسی، ج ۳، ص: ۵۴؛ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۲۳۔ ۶) ابن سعد جز ثانی، قسم اول، ص: ۹۹؛ و طبری ذکر هدم اصنام، ج ۳، ص: ۱۶۴۸۔

تو ہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن قانونیں گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اس طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلم، عرب کے بد و اور اعراب ابتداء مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتہ وہ متزلزل ہو جاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب الفیہر میں ہے: ﴿

كَانَ الرَّجُلُ يَقْدِمُ الْمَدِينَةَ فِي سِلْمٍ فَإِنْ وَلَدَتْ أُمُّهُ غَلَامًا وَنَتَجَتْ خَيْلَهُ قَالَ

هَذَا دِيْنُ صَالِحٍ وَانْ لَمْ تَلِدْ أُمُّهُ أَهْلَهُ وَلَمْ تَنْتَجْ خَيْلَهُ قَالَ هَذَا دِيْنُ سُوءٍ -

”بَاہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا نہیں یہ نہایت براندہ ہب ہے۔“

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی: ﴿

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حُرْفٍٖ فَلَنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ إِطْمَانٌ بِهٗ وَلَنْ أَصَابَهُ

فِتْنَةٌ إِنْ قَلََّ عَلَى وَجْهِهِ﴾ (۱۱/الحج: ۲۲)

”اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچ تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر بتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً اور برگشته ہو جاتے ہیں۔“

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے تو اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بد دعاوں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چچہ میں کے بعد عبد اللہ بن زبیر رض پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔ ﴿ سوئے اتفاق یہ کہ اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں حضرت ابو بکر و حضرت بلاں رض پیدا ہوئے تو خخت یہاں ہو گئے ﴿ حضرت طفیل بن عمرو دوی رض نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموفق ہوئی ﴿ اگرچہ مخصوص ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگوار یوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی نظرت ثانیہ ہو گئی تھی وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے

١۔ تفسیر سورہ الحج: ۶۷۴۲۔ ٢۔ ایضاً

٣۔ مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۵۴۸ و اصحابہ ذکر عبداللہ بن زبیر، ج ۴، ص: ۶۹۔

٤۔ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب عبادة النساء الرجال: ۵۶۵۴ و باب مقدم النبي ﷺ المدینۃ: ۳۹۲۶۔

٥۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان قاتل نفسه لا یکفر: ۳۱۱۔

سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب دہوا کی غرض سے ان کو ادنوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گودہ صحیح ہو گئے تاہم مردہ ہو گئے ۲۱ اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوئے اتفاق سے دوسرے دن بخار میں بٹلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ﷺ نے تمیں بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فتح کر دی، تو آپ نے ﷺ فرمایا:

((المدینة کالکبیر تنفی خبثہا وتنصع طیبہا))

” مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میں کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہ رکھا لص کر دیتا ہے۔“

انہی اسباب کی بنابر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

((اللّٰهُمَّ حِبْ الْيَنَا الْمَدِيْنَةَ كَحِبْنَا مَكَّةَ او اشَدَ اللّٰهُمَّ وَصَحَّهَا وَبَارَكْ لَنَا فِي مَدَّهَا وَصَاعَهَا وَانْقَلَ حَمَاهَا فَا جَعَلْهَا بِالْجَحَّافَةِ)) ۲۲

” خداوند مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیے مدینہ کو محبوب بنادے، اس کو امراض سے بچ کر دے اس کے پیانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جسم میں منتقل کرو۔“

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا اندر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبل میں ایسے مستر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کامنًا قرباً بمال تھا، انہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الارث تھی کہ ایک شخص کے خون کے لیے قبیلہ کا قبیلہ مث جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چل آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچ بچ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچ بچ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنجانے کے وقت سب سے پہلے ”ثار“ کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لیے بچ بچ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ”ثار“ ہوتا تھا۔

اس بنابر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معا اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے بوت کے لیے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، ہاشمیہ کی مخالفت اس کے لیے لا محال ہوتی تھی۔ مدینہ میں اوس و خوزرج و قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑاکر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو

۱ صاحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب لم یست المرتدون المحاربون حتى ماتوا: ۶۸۰۴۔

۲ صاحیح بخاری، کتاب فضائل المدینة، باب المدینة تنفی الحديث: ۱۸۸۳ و باب اعتصام السنة: ۷۳۲۲۔

۳ صاحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبي ﷺ المدینة: ۴۹۲۶۔

گودنوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تا ہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انہیا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں بھرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نمازی کامات کے لیے باہر سے ایک تیرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عارقا۔

خزانعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی۔ خزانعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب نظر کرو کہ انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکو کاری اور پاکیزہ نفسی کے بیکر بن گئے لیکن شارکے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃ مشتعل ہوجاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اویس اور خزرج) کی تواریں میان سے نکل آئیں اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردان اڑا دیتا ہوں، اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالا دوں گا، اس پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے رہیں تھے، دفعۃ کھڑے ہو گئے اور کہا:

کذبت لعمر اللہ لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما
احببت ان يقتل.

”خدا کی قسم ا تو جھوٹ کہتا ہے، تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔“

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار العیان الا وس والخرج حتی همُوا ان یقتلوا ورسول الله قائم على المنبر۔

”پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آ مادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔“

ابن هشام ذکر یہ عقبہ عرض رسول اللہ ﷺ نفسمہ علی القبائل، ج ۱ ص: ۲۶۱۔ اصحابہ تذکرہ اوس بن قطبی، ج ۱، ص: ۸۸؛ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ ذکر ہے، مجمع عبد اللہ، ص: ۱۲۷۔

صحیح بخاری، کتاب المعازی، باب حدیث الافک: ۴۱۱۔

ایک بار حلم بن جثام لیشی نے عہد اسلام میں قبیلہ الشیع کے ایک شخص کو قتل کر دا لا، آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قاتل کے تعلقات کی بنار پر عینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بات بڑھی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ ﷺ نے عینہ سے فرمایا: ”دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے؟“ اس نے کہا: ”خدا کی قسم! اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو متایا ہے۔“ اس پر شور و غل ہوا آپ نے پھر یہی الفاظ دہرانے اور عینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لیے قبیلہ بنویٹ کے ایک شخص نے جو شیع کھڑا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدلتا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہو گا، لیکن آنحضرت ﷺ پونکہ سفر میں تھے اس لیے دیت میں ۵۰۰ اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ ﴿ الْ عَرَبُ مِنْ يَهْدِ إِلَيْهِ أَنْقَاصَهُ ۚ ۝ ۶۱﴾ اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گوآپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تماوار کو میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذلیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جارہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزانہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لیے اس کوڈھونڈر ہے تھسوسے اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ بنت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع با تھنا آئے گا۔ آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابو بکر، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سفارش کی، آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

”خدانے مک کو دار الحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیے اس کو میرے لیے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار دا لا، تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر دا لا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔“

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔ ﴿ ۶۲﴾

بنو ثعلبة کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزر ج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبة اسلام لا کر

* ابو داؤد، کتاب الدیيات، باب الاماام یا مر بالعفو فی الدم: ۴۵۰۳۔

* مسند امام احمد بن حنبل، ج ۴، ص: ۳۱۔

جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ ہمارے محض میں ان سے تھا صد لا یعیے، آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ((الا لا یجئنی والد علی ولدہ)) یعنی ”لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔“
ان واقعات سے انداز ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رُگ رُگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختنہ میں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقامیں تھے و مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزع اور جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلے کا نام پکارتا تھا تو قوی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپٹا مار دیا انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یا اللهم مہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ ”یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔“

((ما بال دعوى الجاهلية)) ॥ یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔“

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے اس لیے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تأمل ہوتا تھا۔ عمر بن افیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قول کرنے کے لیے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی۔ ان مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وكان له ثار في الجahليّة وكره ان يسلم حتى يأخذنه ॥

”ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔“

اسی طرح حضرت عمر بن ما لک ﷺ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا: ہونکیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لا لیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت بوعقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ ॥

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندی، رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی،

۱ دارقطنی، کتاب البيوع، ۴۴/۳، ۲۹۵۷۔

۲ صحیح بخاری، کتاب المناقب باب ما ینہی من دعوى الجاهلية: ۱۸/۳۵۔

۳ اسد الغایہ، ج ۴، ص: ۸۵۔ ۴ اصحابہ فی تمییز الصحابة ذکر عمر و بن مالک، ج ۳، ص: ۱۳۔

تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یادگیر قبائل عرب بھی اسلام کے آگے سرنہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے خاندان بھی تھے وہ بھی حرم کے مناصب دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے متاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فونائد اور اقتدار کا بالکل خاتم ہے ابو جہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ ”محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تہاری کیارائے ہے“ تو اس نے صاف کہا کہ ”میں کیا کہوں محمد ﷺ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعوی کیا اور ثبوت میں دعوییں کھلا کیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان سے دعوییں دیں، انہوں نے خون بھاڑیے ہم نے بھی خون بھاڑیے، انہوں نے زر پاشیاں کیں ہم نے نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدشوش ہو چکے تھے کہ دفعۃ ان کی طرف سے یہ دعوی پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برا داشت کریں، خدا کی قسم! ہم بھی محمد ﷺ پر ایمان نہیں لاسکتے۔ * یہی ابو جہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتب وقت حضرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ *

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثلاً: غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہت کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف وہم عبد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے، انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے * خیبر اور غطفان ایک مدی دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاؤ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لیے آتا تھا اور آستانہ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاہر معنوی پہنڈے نہ تھے بلکہ خیم و خرگاہ، تنغ و پیر، جاہ و چشم غرض ریاست و امارت کے تمام تر سرو سامان رکھتے تھے، اس لیے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام جیسیں نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت، صرف قریش کی متابعت پر مدد و نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام رو سائے قبائل کو پہنچاتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور

* ابن ہشام، حصہ اول، ص: ۱۹۳ اسلام حمزہ۔ * صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل: ۴۰۲۰، ۳۴۶۳۔ * طبری واقعہ حیرر، ج ۳، ص: ۱۵۷۵۔

مال غنیمت سے چوتھو صول کرتا تھا جس کو ”مرباع“ کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آ جاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام ”صفی“ تھا یہ گویا چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، بادپ کے مرلنے کے بعد بیماری میں منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی زراعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے۔ یہ روزہ سالام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔ قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لیے ایک کے بدلوں میں دو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر اس کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جو زخمیں۔ *

حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں جبلہ بن الاشلم خاندان غسان کا اخیر فرمانرو اسلام لا یا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپر کھینچ مارا اس نے بھی برادر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمر بن الخطاب کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمر بن الخطاب نے واقعہ سن کر کہا، اس کا کیا تصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا یہ میرارتہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا۔ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا: جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے، میں اس سے بازاً تاہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔ *

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حیر کا ایک ہی درجہ تھا اس لیے عرب میں تمام روزے سائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو جاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پہلیے تھا ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان وسلحہ و افراد کھلتے تھے، دولت کی بہتان تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تہبا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک براہی کوٹشت از بام کیا اور ان کے مذہبی و قارن کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہی طاقت ملک میں جز پکڑ کر ان کو نیخ و نیمیار سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بن نصیر، بن قبیقان اور یثرب، نجیر، فدک، تیما، وادی القری وغیرہ کے

١- ابو داود، کتاب الجنہاد، باب فی المبارزة: ٢٦٦٥۔

٢- فتوح البلدان بلاذری، ص: ۱۲۴؛ دروس التاریخ، ج: ۲، ص: ۹۰۔

یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخڑا ایسا پیش آئیں اور دین تو حید کے مقابلہ میں اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے سور کے پیش کیے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران و روم کی سلطنتیں فرمازوائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور ججاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہیں دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دام بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لیے اس ملک میں اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہ آ سکتا تھا اس لیے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دارو گیر کرنی چاہی کسری ایران نے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کے اس نئے مدعا کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تجوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعہ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہبری تھا۔ اور پہم امالی قالی سے نقل کرائے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینے تک جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔ اندر وہی عرب تمام تر دشت و صحراء اور بالکل ویران ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لیے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امنداز مانہ سے یہ عادت ان میں رائج ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ تھگی، رہری اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء، چور اور رہبرین ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جنچے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بخارے جو ملک میں پھر کر غله کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت ﷺ نے دو مہینے الجندل پر جو سری یہ بھیجا تھا، اسی کے اسدا دکی غرض سے بھیجا تھا دو مہینے الجندل میں منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مہینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماقدم کے لیے خود دہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔ ﴿حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ابن سعد، جز ثانی، قسم اول، ص: ۴۴؛ ازاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۷۰۔

((اما الاسلام فا قبل واما المال فلست منه في شيء))¹
 ”اسلام تو میں نے قول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔“

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باقیوں کا اقرار لیتے تھے، ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ”چوری نہ کریں گے“² اس کی بھی وجہ تھی کہ ان جرام کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرف سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہو گا کہ یہ بیعت لینے کی کیا حیزیر ہے۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرام سے توبہ کرنا ہوتا تھا اس لیے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاک نہیں ڈال سکتے، کسی کام نہیں چھین سکتے تاہم ان کے لیے کیا باتی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گرد تھے وہ شہر کی متمن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لیے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقوں میں داخل ہو جائیں گے تو دفعہ شہر تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ”الجواب الصحيح لمن بدل دین المسيح“ (صفحہ ۱۳۸ جلد ۲) میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے لکھتے ہیں:

قال الشافعی كانت قريش تتتاب الشام انتياباً كثيراً و كان كثيراً من معاشرها منه و تاتي العراق في قال لما دخلت إلى الإسلام ذكرت للنبي ﷺ خوفها من انقطاع معاشرها بالتجارة من الشام وال伊拉克 اذا فارقت الكفر ودخلت في الإسلام وخلاف ملك الشام وال伊拉克 لاهل الإسلام فقال النبي ﷺ ((إذا هلك كسرى فلا كسرى بعده فلم يبق بارض العراق كسرى يثبت له امر بعد)) وقال: ((إذا هلك قيصر فلا قيصر بعده فلم يكن بارض الشام قيصر فاجابهم على ما قالوا))

”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع

¹ صحيح بخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد..... ٢٧٣١۔

² صحيح بخاري، كتاب الحدود، باب توبة السارق: ٦٨٠١.

معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمه ہو گیا۔“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں بھر کوئی قیصر نہ ہوا، جس کی وجہ حکومت ہو۔“ اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے موافق دیا ہے۔“

رفع شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوث مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و نیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لوگوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زادہ زندگی سے بالکل آشناز تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحریر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعدد ازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی جیسا کہ اس قدر بیان کردیا کافی ہے کہ جہاد یا تعداد ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص تھا یا نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد نہ ہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں تھوڑتھوڑے تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے جہاد کے لیے اور بہت سی پابندیاں تھیں، جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے اور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جلوونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں اس وقت تمعنج جائز ہوتا تھا جب ایک ہمیشہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچ پیدا ہو جائے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لیے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک چیز راویات قدمیہ، جہالت، عادات، رسوم اور نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔ ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہے، وہ قدمی عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گئی ہے، لیکن جو بے ہودہ تجسس انگیز رسمیں پہلے قائم

تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعودی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظری نہیں آتی ہیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر سبیل قومی عادتیں تھیں جو ان کی بستی کی عناصر بن گئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا ٹاریخی انتقامِ خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل منادیا۔ خاندانی فخر و مبارات ان کی قومی زندگی کی روح تھی، فنا کر دی گئی۔ ابوسفیان رئیس العرب کو بلاں ﷺ (جو جبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تواریخاً سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھر میں آگئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے، سرد پڑ گئے۔ اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسرا طرف خود اس میں ہوا۔ نفس اور تفسیرِ طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مرزا جوں پر سخت گراں تھی:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَشِعِينَ ﴾ (٤٥ / البقرة)

”اور وہ (نماز) خشیعین کے سوا اور وہ پر یقیناً گراں ہے۔“

روزہ یعنی میں دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا لیکن تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابو بکر ؓ کے زمانہ میں عام بعاوتوں ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب وہ حج جا بیلت کا حج نہیں رہا، طواف عربیاں کی اجازت نہیں رہی تھی۔ بڑی دلچسپی کی چیز بات تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے۔ مقام مثی میں خاندانی و اقطاعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اسی کے ساتھ محروم اور نوادی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلائے خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، تمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ و عود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو! تمام نداہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمه ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفری ب بت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلآ ویزی اور دلفری کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا و اقطاعات کی بنابریور پ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سرو پا ہے کہ اسلام اس لیے پھیلا کر وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔ پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبليغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موائع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستا ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لیے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تکوار ہے لیکن کار لائل ۃ کے بقول نبیت اور یکہ وہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تکوار کس کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تکوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریع کر دینا مناسب ہے۔

فریضہ تبلیغ

”تبليغ“ کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرا لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا دعوت جس کے معنی بلا نے اور پاکانے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیرہ جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور یودھیت۔ باقی زیادہ تر ایسے تھے جو تبلیغی نہیں تھے، جیسے یہودیت، مجوہیت، ہندویت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا اب بعد کے پیروؤں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی و حمال ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں سمجھا ایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا اتحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و مکر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح ﷺ نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی

ہیروزا یا نہد ہیرودورش (محمد ﷺ)

(۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا: ”میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔“ (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا: ”مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا نام ہے) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔“ (۲۶) پھر فرمایا: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔“ (متی ۶) پھر ارشاد فرمایا: ”وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دواور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھیلنگو۔“ (متی ۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے ندھب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک و حرام ملپھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ناخون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبليغ کی اہمیت

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لاکھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لیے اپنی تبلیغ کے لیے قریش، وغير قریش، جمازویں، عرب و جنم، ہندو روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوئش میں صدائے الہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں انجلانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدْبِرُونَ قُمْ فَأَنذِرْ﴾ (۷/المدثر: ۱، ۲) ”اے چادر پوش! انھوں کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر، پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿لَكُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم﴾ (۵/المائدہ: ۶۷) ”جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اور لوں تک پہنچا، ﴿فَادْعُ وَاسْتَغْفِرْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (۴۲ الشوری: ۱۵) ”لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا،“ ﴿فَذَكَرَنَ نَعْتَ الْذِكْرِي﴾ (۸۷/الاعلی: ۹) ”لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فاکدہ مند ہو،“ ﴿وَذَكَرَ فِي أَنَّ الذِكْرَى تَنْقِمُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۱/الذاریات: ۵۵) ”او نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فاکدہ پہنچاتی ہے،“ ﴿فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدَ﴾ (۴۵/ق: ۵۰) ”قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری حکمکی سے ڈرتا ہو،“ اور ان کے علاوہ میسیوں آئیوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اے علیؓ! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔“ *

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیر و پر خیر کی دعوت امر بالمعروف، نبی عن المنکر اور تواصی بالحق

* صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب دعاء النبي ﷺ الى الاسلام: ۲۹۴۲؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل - الصحابة، باب من فضائل على: ۶۲۲۳۔

یعنی باہم ایک دوسرے کو چائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے نظرات سے بے پرواہ کر پیامِ الہی لوگوں تک پہنچائیے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انعام نہ دیا:

(يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ إِلَيْكَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا أَبَلَغْتَ رِسْلَتَهُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَمْكُنَ مِنَ النَّاسِ) (٦٧ / المائدۃ)

”اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترتا ہے اس کو پہنچادے اگر تو نے ایسا نہیں کیا، تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔“

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغامِ الہی، چائی کا ایک بہت اچشمہ ہے، جو آہستہ آہستہ قدر تی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھا نے کا حکم ہوا:

(وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ) (٢٦ / الشوراء)

”اوہ اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔“

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر کے اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

(لَتُنذِرَ أَمَّا الْقُرَى وَمَنْ حَوْلَهَا) (٤٢ / الشوراء)

”تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدواری ہیں ان کو آگاہ و ہشیار کرے۔“

اب تبلیغ کا دائرة اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سبھ بوجہ، احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے:

(إِنْ هُوَ لَا إِذْكُرْ وَقُرْآنٌ مُمِينٌ لَيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيَا) (٣٦ / بیت: ٦٩، ٧٠) (بیت: ٣٦)

”یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے، تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔“

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

(لَا نُنذِرُ كُمْيَه وَمَنْ بَلَغَه) (١٩ / الانعام)

”تاکہ میں تمہیں آگاہ و ہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔“

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے:

﴿هَذَا الْكَلْمَنُ لِلنَّاسِ﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۵۲)

”یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے۔“

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا كَافِةً لِلنَّاسِ يَشِيرًا وَكَذِيرًا﴾ (۲۴ / سبا: ۲۸)

”اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوبخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا۔“

آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمادیں:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (۷ / الاعراف: ۱۵۸)

”اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔“

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرة میں داخل ہے۔ فرمایا:

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَمَّيْنَ نَذِيرًا إِلَيْهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۲۵ / الفرقان: ۱)

”برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی، تاکہ وہ دنیا جہان کے لیے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو وہ خدا جس کی تکلیف میں

آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔“

اس سے بھی زیادہ ہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوبخبری بھی اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی ماہی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذُكْرٌ لِلْعَالَمِينَ وَلَتَعْلَمُنَّ تَبَاهَ بَعْدَ حِينَ﴾ (۳۸ / ص: ۸۷-۸۸)

”یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔“

انہیا اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغ سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغ نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یعنی اور جب شہنشاہ آپ کی آواز پہنچنے لگی اور لوگ تلاش حق کے لیے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعیٰ تبلیغ کی پر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اسلام کو تبلیغ کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتح میں قرار دیا اور ﴿إِنَّا فَخَاتَنَا لَكُمْ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ (الفتح: ۱) نازل ہوا، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونی عرب میں اسلام کے واعظ قاصد اور مبلغ تبلیغ گئے اور دنیا کے امرا اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، چش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضان حق سے یہ راب ہوئے مشرکین عرب، یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی، لیکن نفس تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ بحث کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وہی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغ ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفہ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے بیروں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

﴿أَذْعُرُ إِلَى سَبِيلٍ رَيْتاَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمُوعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَاءَ لَهُمْ بِالْقُوَّةِ هُنَّ أَحْسَنُ ۝﴾

(النحل: ۱۲۵)

”اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دنائی اور عدمہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔“

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے عقل و حکمت، موعظہ حسنة اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متكلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں تینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات ہیں جن میں مؤثر اور لذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرا

صحيح مسلم، کتاب الجهاد والسبیر، باب صلح الحدبیہ: ۶۳۷۔

جدیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین میں مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت اور دوسرے کو موعظت حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تبیر کیا ہے اور استدلال کے بھی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعای ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کو قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتنے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ لنشیں دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو ملخصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نیسب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت اور دوسرے کا نام موعظت حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔ تبلیغ دعوت کے بھی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتمیں کرے کہ تختی اور شدت کا طریقہ دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے کیسی بھی اچھی اور بھی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور منٹے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن کو بھی نرمی ہی سے باتمیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام بر بانیٰ لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِذْهَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قُولًا لَّيْلًا لَعْلَهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَتَّسَعُ ۝﴾

(٤٣، ٤٤ / طہ)

”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے زم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔“

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعی و مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدر جہاز یا وہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قولی بلیغ

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ ﷺ کی نافرمانی کے جرم کے مرتب ہوئے

تھے یہ حکم ہوتا ہے:

﴿فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعَظُّهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي الْقُسْبَهُمْ قَوْلًا بِكِبِيْغَاهُ﴾ (٤ / النساء: ٦٣)

”تو ان سے درگز کراور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہ جوان کے دلوں میں اثر کرے۔“

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں

اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بد سلیقگی، بد تہذیبی اور درشتی سے ان کو درگز اور برداشت کرنا چاہیے دوسرا یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرا یہ کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسرا و تیسرا

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعلیم میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہما کو یہ میں میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ((بَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَسِّرَا وَلَا تُنْفِرَا)) * ”دینِ الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کرنیں، لوگوں کو خوبخبری سنانا غرفت نہ دلانا، یہ وہ تبلیغ اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دینِ الٰہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بناانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہرب و محبت کی دلوں صد اؤں سے دلوں کو پرمیاد اور مسرور بناانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور بہیت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردان پر نہ لالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھرائیم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے پھر دوسرا فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبل ﷺ کو یہیں نصیحت و وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد ﷺ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو

* صحیح بخاری، کتاب المغازی، بعث ابن موسی و معاذ الی یمن قبل حجۃ الوداع: ٤٣٤١، ٤٣٤٢۔

ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں جن چن کر ان کے بہترین مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔*

تألیف قلب

تبیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ کو بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ॥^۱ (والْمُؤْلَفَةُ قُلْوَبُهُمْ) (۹/ توبہ: ۶۰) اس کے لفظی معنی ہیں ”دول کو ملانا“ اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف و محبت اور امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً اشریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے، یہ ممنونیت عنا و اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبول حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقة گوش بنایا تھا، چنانچہ کہ کے بعض ریس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت ﷺ نے حسین کی غیمت کا سارا مال انہیں تقسیم کر دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گرد نیس نہ اٹھ سکیں۔ صفوان جو اسلام کے خلاف مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ”مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا، جتنا دیا اور مجھے ان سے خفت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔“* ایک دفعہ ایک بدوانے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں وہ مجھ کو عنایت تکھیے، آپ ﷺ نے وہ سب اس کو دے دیے یہ فیاضی دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آ کر کہا: ”بھائیو! اسلام قبول کرو کہ محمد انا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلas کا ذرہ نہیں رہتا۔“*

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سر ہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے اس نے مستفرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ ”اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔“*

دعوتِ عقل

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی نہ ہب ہو، کہ بغیر اس کے حکمت و انشتمانی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بہیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر

^۱ صحیح بخاری، باب مذکور: ۴۲۴۷۔ ^۲ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخانہ ملکہ: ۶۰۲۲۔

^۳ ایضاً: ۶۰۲۰۔ ^۴ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبي... الخ: ۱۳۵۶۔

مدابپ عالم کی تاریخ میں نبوت محمد یہ ﷺ یہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکماں قانون (تورات) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبیر کا مطالبہ کیا اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبی مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الہی میں غور و فکر کی بدایت کی۔ فرمایا:

﴿فُلْ هُلْ عِنْدَكُمْ قَنْ عَلِيْمٌ فَخُرْجُوهُ لَكَاطِ إِنْ تَكْسِيْعُونَ إِلَّا الظَّلَقَ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا

تَخْرُصُونَ﴾ **فُلْ فَلِلَّهِ الْجَمِيعُ الْأَلْفَاظُ** ﴿۶﴾ (الانعام: ۱۴۹-۱۴۸)

”کہہ اے یغیر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو انکل ہی کرتے ہو کہ کہ اللہ ہی کی ہے پیچھتی ہوئی دلیل۔“

نیز ارشاد ہوا:

﴿لَيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنِ الْيَقِيْنِ وَيَجْنِيْ مَنْ حَيَّ عَنِ الْيَقِيْنِ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيْعٌ عَلَيْهِمْ﴾

(الانفال: ۴۲)

”تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیئے اور اللہ ہی منے والا جانے والا ہے۔“

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿وَكَانُنَّ قَنْ أَيْقَنُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَسْرُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ﴾

(يوسف: ۱۰۵)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔“

غور و فکر نے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ الْيَلَى وَالْهَارِلَائِتِ لِأُولَى الْأَلْكَابِ الَّذِينَ يَدْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقَعْدًا وَعَلَى جُنُوْبِهِمْ وَيَنْسِكُرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بِأَطْلَاءَ﴾ (آل عمران: ۱۹۱، ۱۹۰)

”بے شہد آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اپنی کردوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہاے ہمارے پروردگار تو نے یہ (عالم) بیکار نہیں بنایا۔“

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہو گی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا اندر وہی

استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

﴿وَقَاتَلُوكُمْ كُلُّ أَفْلَاكٌ بِتُصْرُونَ﴾ (۲۱) (الذاريات: ۵۱)

”اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔“

صحیفہ محمدی ﷺ کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿تَبَصَّرَةً وَذَكْرٍ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ﴾ (۸۰) (ق: ۵۰)

”یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر جو گوئے ہونے والے بندہ کے لیے۔“

﴿هَذَا أَبْصَارٌ مِّنْ رَّيْكُنْدٍ﴾ (۷) (الاعراف: ۲۰۳)

”یہ تھاڑے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔“

﴿هَذَا أَبْصَارٌ لِلْتَّابِسِ﴾ (۴۵) (الجاثیة: ۲۰) ”یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔“

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾ (۴) (النساء: ۸۲) ”کیا یہ قرآن میں مدرس نہیں کرتے۔“

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَفْغَلَهَا﴾ (۴۷) (محمد: ۲۴)

”کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔“

﴿وَالْقُرْآنُ الْحَكِيمُ﴾ (۳۶) (یسوس: ۲) ”حکمت والے قرآن کی قسم۔“

﴿تِلْكَ أَيْتُ الْكِتَابَ الْحَكِيمَ﴾ (۱۰) (یونس: ۱، ۳۱) (لقمان: ۲)

”یہ حکمت والی کتاب کی آسمیں ہیں۔“

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا، سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدائیں جہر درود یو ار سے آتی ہے، لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے مدرس رسول اللہ ﷺ کی زبان، مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبیر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبرا کراہ اور زور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فالفسہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بے زور پیدا نہیں کر سکتے۔

سکت، بلکہ تیز سے تیز تکوار کی نوک بھی کسی لوح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔“ فرمایا:

﴿لَا إِذْرَاةَ فِي الدِّينِ لَمَّا قُدِّمَتِ الرُّشْدُ مِنَ الْعِيْنِ﴾ (۲۵۶: البقرة)

”دین میں کوئی زبردست نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔“

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَقُلِّ الْحُقْقُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلَيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلَيَكُفَّرْ﴾

(۲۹: الکھف)

”اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔“

ایمان اور کفر ان دو میں سے کسی ایک کو اختیار پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے اس لیے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچادیانا ہے زبردستی منوانا نہیں:

﴿إِنَّمَا أَعْلَى رَسُولَنَا الْبَلْعَمُ الْمُبِينُ﴾ (۵: المائدۃ)

”ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچادے۔“

آنحضرت ﷺ کو حقریش کے اعراض و میافت سے حدود جنمگین تھے، تکین وی گئی:

﴿إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلْعَمُ﴾ (۴۲: الشوری)

”اے پیغمبر ﷺ! تیر افڑ سرف پیغام پہنچادیانا ہے۔“

﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكَّرٌ لَمَّا تَعْلَمَهُمْ بِعُصُبِطِرٍ﴾ (۸۸: الغاشیۃ)

”اے پیغمبر ﷺ! تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر دار و نہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔“

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَهَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِيظًا إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلْعَمُ﴾

(۴۲: شوری)

”پھر اگر وہ (اسلام کی دعوت سے) انکار کریں تو اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذم صرف پیغام کا پہنچادیانا ہے۔“

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَمَنْ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ يَحْمِلُونَ أَفَلَمْ تَكُنْ لِلنَّاسَ حَتَّى يَلْتَهُوا﴾

مُؤْمِنِینَ ﴿٩﴾ (۱۰ / یونس)

”اور اگر تیراپ روگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی موسن بنادے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے، تو کیا اے پیغمبر ﷺ تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔“

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی غلکت کے لیے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ تیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو توارکے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہوا اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی توارکے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ إِسْتَعْجَلَهُ فَأَجْرِهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ أَلْيَغْهُ مَأْمَنَةً﴾

ذلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾ (التوبہ: ۶)

”اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو کر یہ بے علم لوگ ہیں۔“

نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلام الہی سنایا جائے، تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہو گا اس کے تہ دیں مذہب کا محرك توارکے ججائے کوئی اور چیز (پیام حق) ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھونے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں:

﴿وَقَاتَلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَلْجُونَ فِتْنَةً وَّيَكُونُونَ الَّذِينُ مُكْلِلُوْهُ﴾ (۳۹ / الانفال: ۸)

”اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ رہے اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔“

”فتنة“ سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہا صاحبہ کی خانہ جنگیوں میں شرکیک نہ تھے۔ ایک شخص نے آ کر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور اور پر کی آیت پیش کی انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں بٹلا کیا جاتا تھا اس کو لوگ مارڈا لتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔

صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ الانفال، باب قوله تعالى ﴿وَقَاتَلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً﴾
الآية: ۴۶۰۔

نادائقوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپ سے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی پائیں، اول یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے با تھا اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کرو اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خوزیری رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپ امن پسندی، سلامت طلبی اور خوزیری سے پہنچنے کی آخری کوشش پر ہے اس کو نادائقوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ سی فوج کو تعین کرتے تو اس کے سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

”جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جاؤ، اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رک جاؤ، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بد مسلمانوں کی ہوگی قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہو گا لیکن غنیمت اور فتح میں اس کا حصہ نہ ہو گا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔“ ﴿

یہ اصول جنگ تھے جس سے خوزیری کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بردشیر مسلمان بنالیتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت مسلمان فارسی رضی اللہ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ ”میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن حکوم ہو کر رہو گے۔“ ﴿ اس سے

﴿ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تأمیر الامام الامراء على البعث ٤٥٢٢ .

﴿ جامع ترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء في الدعوة قبل الفتن: ١٥٤٨ .

معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل نہ ہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔ شمامہ بن اثال رض قبیلہ بنی حنفیہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا۔ شمامہاتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھبے میں باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا: ”شمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟“ جواب دیا: محمد میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہو گا اور اگر زردیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا پھر تیسرا دن۔ تیسرا دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”شمامہ کو چھوڑ دو۔“ لوگوں نے کھول دیا وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر چھائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے ॥ کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا؟ بدھ کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن انہیں نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برداشت رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا: «فَإِذَا مَاتَ أَبَعْدُ وَ إِذَا فَدَأَ عَوْهٗ» (۴۷ / محمد: ۴) ”اڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دیا فدیہ کے کرچھوڑ دو۔“ یہار شادنہ ہوا کہ اسلام یا مکوار۔

غزوہ نبیر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرقضی رض کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ وہ پوچھتے ہیں: یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا: ”آ ہستگی سے روانہ ہو، یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہو گا وہ ان کو بتاؤ خدا کی قسم! اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔“ ॥ چنانچہ نبیر کے یہود نے اسلام کا نہ ہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان پر تھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا۔ اکثر لا ایوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بھرے ہوئے مسلمان کو مجبور اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابی رض نے پوچھا کہ اگر اڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور

صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب وفدبنتی حنفیۃ وحدیۃ شمامہ بن اثال: ۴۳۷۲؛ ابو داود، کتاب الجہاد، باب فی الأسیر یوثق: ۲۶۷۹۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ نبیر: ۴۲۱۰۔

جب میرے حملہ کی باری آئی تو رخت کی آڑ پکڑ کر کے ”میں مسلمان ہوتا ہوں“ تو اے خدا کے رسول! میں کیا کروں اس کو قتل کروں؟ فرمایا: ”نمیں اس کا قتل جائز نہیں۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا: ”پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھا اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرار تو حید سے پہلے تھا۔“ ❶

حضرت اسامہ بن زید رض آپ کے بڑے چھینتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستے کے سپہ سالار بنا کر ایک بڑائی میں بھیج گئے، جب گھسان کارن پڑا تو ایک کافران کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا اله الا الله پکارا تھا، ایک انصاری جو پہلے اس پر چھپتے تھے وہ تو رک گئے مگر اسامہ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محول کر کے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو اسامہ سے سخت آزدہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! اس نے صرف تکوار کے ذرے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتابیخون قفرہ فرمایا: ”اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟“ پھر برادریہ فرماتے رہے: ”اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا اله الا الله کا کیا جواب دو گے؟“ اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی نداامت ہوئی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہا شہادت میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ ❷

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بوجب قتل نہیں کرتے وہ جب مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کا کثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((امریت ان اقتل الناس حتى يقولوا لا الله الا الله)) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ تو حید کا اقرار نہ کریں جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچالیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے۔“ ❸ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ تو حید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روانہ نہیں خواہ وہ حملہ کے ذرے لا اله الا الله پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں خدا کا ہے۔ یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ اسلام کا حکم تھا کہ

❶ صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا اله الا الله: ۲۷۴۔

❷ صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب ایضا: ۲۷۹، ۲۷۸۔

❸ صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لا الله الا الله: ۱۲۴۔

مسلمان دیوانہ و ارتووار لیے پھرتے اور جس کو پاتے اس کوڑ رادھکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھورنے سرقلم کر دیں گے، غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار تو حید کیے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہماری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند رہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿وَإِن جَنَاحُوا إِلَيْهِ فَاجْتَحْمُلُهَا﴾ (۸/ الانفال: ۶۱)

”اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھکتا ہو تو بھی جھک جا۔“

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں اس سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ أُسْتَجْزِأَكَ فَأَجْزِهْ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَمَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَةَ هُنَّا﴾

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۶/ التوبہ: ۶)

”اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی بچھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہاں لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔“

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہوتا تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو گمراہیا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح اٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لئے کو منع کیا ہے:

﴿فَإِنْ أَعْتَزَ زُوكُمْ فَلَمْ يُقْاتِلُوكُمْ وَالْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَامُ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَيِّلاً﴾

(۹۰: النساء: ۴)

”تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو والدنے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔“

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگ جوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا تلوار یا اسلام تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟
صلح تبلیغی جماعتیں

غلطی بھیلا نے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلادی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور با ضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم

کیے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ و دوسرے قبیلہ سے برس پیکار تھا، راستوں پر ہزاروں اور ڈاکوؤں کا بفضلہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچانا ممکن تھا، اس لیے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بد امنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوہ بدر کے بعد جب قریش کا زور نٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لیے ادھر ادھر بھیجا ت وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجع میں ستر (۴۰) داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہوتا، سریا بن ابی العوja میں پچاس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ، ذات اطلاع میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود نقیقی شیعۃ النبیؐ کا تیروں سے چمد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم

آنحضرت ﷺ جب تک کہ معلمہ میں تشریف فرمائے، بغیر نہیں اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آ جاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے۔ مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز کہ معلمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آ جاتے تھے، آپ سالہ سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔ الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ جبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بھی پہنچایا کہ وہ اس مسافت میں جہاں جہاں سے گزرے، اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور جبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہو گئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پروشوں نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقوں گوش اسلام ہوئے، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زیبر رضی اللہ عنہم، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہم کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ تھے جن کے موثر و عظوں کو سن کر

آنحضرت ﷺ کی بھرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے تو حید کے پرستار ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ آ کر اسلام نے اس واطینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نو مسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطراف ملک سے دارالسلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گھوٹوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفة (چجوتہ والے) مشہور ہے، اس میں وقاوف قناس سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے اور خود نو مسلموں کو تعلیم دیتے۔ یہ معونہ میں ستر کے قریب جو دامی اور مبلغ راہ میں بیدارانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ وہ اکابر صحابہ جو وقاوف قناس مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس فرض کے پیشیں (۳۵) صحابیوں کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں: ابوذر غفاری، طیل بن عمر و دوی، جعفر طیار، عمرو بن عنبر سلمی، ضماد بن الحلبی، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن الہید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علاء بن حضری، ابو موسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبد اللہ بن جلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، وبر بن نخیس، عمروہ بن مسعود ثقفی، عاصم بن شهر، متفقد بن حبان، شمامہ بن اثال، حیصہ بن مسعود، احلف، ابو زید الانصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ربعی مخزوی، واٹله بن اسقع، عبد اللہ بن حذاہ سہی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمر و بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی ہیں۔ انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یہن، یہاں، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایان، شام، مصر، جشہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لیے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذهب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر مناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا

تھا، اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لو ہے کی تواریخیں، بلکہ قرآن کی تواریخی جس کی ضرب کی روک ڈھال اور پر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تواریخ سے جہاد کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿فَلَا تُطِعُ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدُهُمْ يٰهٗدٰا لَكٰيْرًا﴾ (۵۲/ الفرقان)

”تو اے پیغمبر! انکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زد و شور سے جہاد کر۔“

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَنْجَفُ وَعَيْدِ﴾ (۴۰/ ق: ۵۰)

”تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعے سے یادوں۔“

قرآن رحمتِ عالم کا پیامِ عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے۔ فرمایا:

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (۲۵/ الفرقان)

”برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بنہ پر اس لیے اتنا ری تاکہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔“

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاث نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قویں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نماۓ عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشواؤ قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور جوں شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔ اس بنا پر الاقرب فالا قرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوت تو حیدری جاتی پھر یہود کو حلقہ گبوشِ اسلام بنایا جاتا اور اس کے بعد نصاریٰ اور جوں کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام کی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لیے ان میں بت پرستی کی نہ ملت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تحویف اور صناید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ نے اسی مکہ سے بھرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پر اور اب قرآن کا طرز خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔ سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قابل عرب کے وفاد کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وحدہ آیا اسی زمانہ میں سورہ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

محوس عرب میں بہت کم تھے۔ بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی انسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو شویت یعنی دو خداوں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتداء میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل کا جو یا تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طاہر قدس اپنے پڑاں دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا وہ وہی تھے جو یہ کتب طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ در تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمانہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مدد یہی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جوں اور خالا ملا تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت روایات اور سرم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ *
اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب بخدر اور جزا میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جرا فوج مدینہ، یمن، عمان، یمانہ اور بحرین فتح کرنے کے لیے نہیں پہنچ گئی۔ انصار مدینہ نے خود آکر اسلام کو بلیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفارانے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوں کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمه پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمان میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمان کا قبیلہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ تختی سے پیش آئے اور اس کو زد کوب کیا، اس نے آ کر آپ مغلیہ تبلیغ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ مغلیہ تبلیغ نے فرمایا: ”اگر اہل عمان

* مستدرک حاکم، کتاب النکاح، ج ۲، ص ۱۹۵

ہوتے تو تم کونہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔”^۱

یمامہ کے رئیس شامہ بن عثیہ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیے گئے تھے اور مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخرون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضادات بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثی کے باشندے فتحِ مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجدِ نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمع اسی گاؤں میں پڑھا گیا^۲ بارگاہِ نبوت میں عرب کے فودا اگرچہ فتحِ مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دتی کی، چنانچہ^۳ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔^۴

اہل میں کاشما اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی بھرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابو موسی اشعریؑ بھی نہیں میں سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف بھرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باہم الف کے جھوکوں نے ان کو جوشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا داراللہجہ تھا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؑ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خبر کے زمانے میں مہاجرین جوشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔^۵

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرك چیز تھا، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

﴿أَلَا عَرَابُ أَشَدُّ كُفَّارًا وَنَفَّاقًا وَأَجْدَرُ الْأَلَّا يَعْلَمُونَ حَدُودٌ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حِكْمَةٌ﴾ (التوبۃ: ۹۷) (۹/)

”دیہاتی بدھی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔“

^۱ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل اهل عمان: ۶۴۹۵۔

^۲ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن: ۸۹۲۔

^۳ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان بالله: ۱۱۶، ۱۱۵۔

^۴ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن ابی طالب: ۶۴۱۰۔

اور بھی اس قسم کی آئیں ہیں، جو لوگ بادی سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام ”بیعت اعرابی“ تھا جو کم درج سمجھی جاتی تھی اس بنابر بادی میں الگ تحمل رہنا صاحب کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو مرتد اور علامت سمجھتے تھے۔ ①

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائز نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو یونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک

ایک صحابی کے قول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے:

① اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب مجرہ قرآن فی تھا، قرآن مجید جس مورث اور دل سکپیا رینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موافع جن کا اور ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بقیوںی، مظاہر قدرت کی بوجھی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرز استدلال کرتا تھا:

﴿كَيْفَ تَكُونُونَ يَا أَيُّهُ وَكَنْهُمْ أَمْوَاتٌ فَأَحْيَاهُمْ ذَيْمَ مُعِينُهُمْ مُؤْمِنُهُمْ عَيْنُكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝﴾

(۲۸:۵ البقرة)

”تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مردہ بنادے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر اس کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔“

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْأَيَّلِ وَالنَّهَلِ وَالْفَلْلُكِ الَّتِي تَخْرُجُ فِي الْبَحْرِ إِذَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَ اللَّهُ مِنَ الشَّمَااءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتَهَا وَبَثَ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآتَةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالشَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَلِمُ لَقَوْمَ يَعْقُلُونَ ۝﴾

(۱۶۴ البقرة)

”آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سومند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی بر سانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواویں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی سے مُخزِر ہیں دشمنوں کے لیے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔“

① صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب تحریر رجوع المهاجر إلى استیطان وطنہ: ۴۸۲۵، سنن نسائی، کتاب البيعة، باب المرتد اعرابیا بعد الهجرة: ۴۱۹۱۔

﴿وَلَكُمْ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَفَرًا وَإِلَيْهِ يُوْجَعُونَ ﴾

(۸۳: آل عمران)

”آسمان و زمین میں جو بھی ہے، برضا یا مجبور اسی کا اطاعت گزار ہے، اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔“

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاحْتِلَافِ الَّذِينَ وَالنَّهَارُ لَكَلِيلٌ لِأُولَئِكَ الْأَلْبَابِ إِلَيْهِمْ كُرُونَ اللَّهَ قِيمًا وَقُعُودًا وَكُلَّيْ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بِاطِّلاً﴾ (۱۹۰، ۱۹۱: آل عمران)

”آسمان و زمین کی خلقت، اور شب و روز کے اٹ پھیر میں، ان ارباب عقل کے لیے بے شبه بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھے، لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں، کہ خدا یا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔“

﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّدُ الْجِنَّاتِ فِي الْبَرِّ وَالْعَرِيطِ حَتَّى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفَلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ يُرِيْجُ طَيْبَةً وَكَرِحُوا بِهَا جَاءُوكُمْ رِيْحٌ عَاصِفٌ وَجَاءُهُمُ الْمُوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَاهِرُهُمْ أَجِطَّا بِهِمْ لَدُعَوُ اللَّهَ مُخْلِصِينَ لِهِ الدِّيْنُ ﴾ (۲۲: یونس)

”وہ وہ ہے جو تم کو خیکھی اور دریا میں سفر کرتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کو خوب لیے جا رہی ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعۃ) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجود آگئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خالص خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔“

﴿وَمِنْ أَيْتَهُمْ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَفْسِنَمٍ أَرْوَاحًا لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَهُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَكَلِيلٌ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ وَمِنْ أَيْتَهُمْ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاحْتِلَافُ الْيَسْنَمَ وَالْوَانِكَمُ طَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَكَلِيلٌ لِغَلِيْمِينَ وَمِنْ أَيْتَهُمْ مَنَامَكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاوَكُمْ مِنْ فَضْلِهِ طَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَكَلِيلٌ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴾ (۲۱-۲۲: الروم)

”اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے کرم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے

لیے نہانیاں ہیں۔“

خدا، یا ایک قوتِ عظیم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاراتی اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے:

﴿أَفِي اللَّهِ شَكْ فَأَطْرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ط﴾ (۱۴/ابراهیم: ۱۰)

”کیا خدا میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔“

﴿كَيْفَ تُكَفِّرُونَ بِاللَّهِ وَلَنْتَمُ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاهُمْ ثُمَّ يُحَيِّكُمْ ثُمَّ تُرْجِعُونَ ۝﴾

(۲۸/البقرة: ۲۸)

”اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

عرب میں ملکم تھے زیادہ تر بلکہ قرباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے، لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظامِ عالم انہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ حس سے رہا راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، بنا تات کی رو سیدگی، سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لیے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا انہیں معبدوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، انہیں سے محبت رکھتے تھے، انہیں پر نذر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معروکوں میں انہیں کے نام کی بے پکارتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصلی وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحریر اور تجویز ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت مؤثر پیرا یوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے:

﴿أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ جَلَلَهَا أَنْهِرًا وَجَعَلَ لَهَا رَأْسًا وَجَعَلَ بَيْنَ الْجَهَنَّمِ حَاجِزًا عَالَهُ مَعَ اللَّهِ طَبَنَ الْكُثُرُ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ أَمَّنْ يُحِبُّ الْمُضْطَرَ إِذَا دَعَاهُ وَيَشْفُفُ السُّوءَ وَيَعْلَمُ الْخَلْفَاءَ الْأَرْضَ طَعَالَهُ مَعَ اللَّهِ طَقْبِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ۝ أَمَّنْ يَهْدِي نَعْمَلَهُ ظُلْمَتِ الْبَرِّ وَالْبَرِّ وَمَنْ يُؤْسِلُ الرَّيْحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ طَعَالَهُ مَعَ اللَّهِ طَنَقَ اللَّهُ عَمَّا يَشْرِكُونَ ۝ أَمَّنْ يَيْدُوا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُهُمْ قِنَّ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ طَعَالَهُ مَعَ اللَّهِ طَقْلَنَ هَأْتُوا بِرَهَائِكُمْ لَنْتَمْ صَدِيقُنَ ۝﴾ (۶۱/النمل: ۲۷)

”کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے نیچے میں نہریں بھائیں اور اس کے لیے

پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوت رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کوہ شادیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشنگی اور ترسی کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواں کو بھیجا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے؟ پھر اس کو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگرچہ ہو تو دلیل لاو۔

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے مکار تھے اور کہتے تھے کہ «مَنْ يُؤْمِنُ بِالْعِظَامِ وَهُوَ رَفِيمٌ»^{۱۰} (۳۶/ یس: ۷۸) یعنی ”ہدیاں گل سڑچکیں تواب کون ان کو جلائے گا۔“ قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

«أَلْحَدَكُ نُطْفَةً مِنْ مَيْتَيْ يَمْنَىٰ فُكَّ كَانَ عَلَقَةً فَعَاقَقَ فَكَسَوَىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الْزَوْجَيْنِ

الذَّكَرُ وَالْأُنْثَىٰ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقِدْرٍ عَلَىٰ أَنْ يُؤْمِنَ الْمُوْمَنُ»^{۱۱} (۷۵/ القيامة: ۴۰-۴۷)

”کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا تو خرا بنا، پھر خدا نے اس کو یہیک کیا اور اس سے دو جو زمردار عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟“

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور سُم و عادات کا بند اس سیالاً بکسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جو دوار اکارنے تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رہسائے قبائل، بڑے بڑے شعر اور خطبا قرآن ہی سن کر ابیان لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں نہیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو کمیں قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نہیں کی دعوت سے بازاً وہم تمہارے لیے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے خسم کی ابتدائی آتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

«فَإِنْ أَعْرَكْ صُوَافِقُلْ أَنْدَرَ كُلْمَ صِعَقَةً مِثْلَ صِعَقَةَ عَادِ وَنَمُودَ»^{۱۲}

(۱/ خم السجدۃ: ۱۳)

”تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و نمود کی کڑک کی طرح ہے۔“

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر باتحور کھدیا اور کہا کہ خدا کے لیے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا محمد ﷺ جو کام پیش کرتے ہیں وہ شعر ہے نہ جادو، نہ کہانت ہے ॥ (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جوشراۓ عرب میں تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیق حال کے لیے بھجا تھا، وہ خدمت القدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سناتا تو جا کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شعراً دونوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انہیں کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ ॥

ولید بن مغیرہ (حضرت خالد بن سعید کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا ائمہ تھا، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں:

«إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاكُمْ ذَيَ الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَا عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعْنَمُ تَذَكَّرُونَ ۝» (النحل: ۹۰)

”خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور قیش سے، بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔“

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ ॥ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی اور ساتیں اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستے میں اپنے پاس بھالیا، پھر فرمایا: ”ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے۔“ یہ کہہ کر آپ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ ॥

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورہ طور پر ہتھے ناجب اس آیت پر پہنچے:

«أَمْ حُكْمُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَلِقُونَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوَقِّنُونَ ۝ أَمْ عِنْدُهُمْ حَرَازٌ إِنْ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصْبِطُونَ ۝» (الطور: ۵۲-۳۵)

”کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ کیا یہی لوگ

- ۱ علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح، ج ۴، ص ۴۴ میں مسند ابو یعلوی وغیرہ سے یہ روایت متدرک حاکم میں بھی ہے۔ سیرۃ سوم، میں مصنف نے اس کے لیے کتاب الغیر این مردو یہ مسند ابو یعلوی وغیرہ اسحاق کا حوالہ دیا ہے اور کھاہے کا غیر قorro صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے۔ بلکہ سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۸۰۔ ۲ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹۔ ۳ الجواب الصحیح، ج ۴، ص ۴۶ بحوالہ عبد الرزاق۔ ۴ مسند احمد، ج ۱، ص ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی: ۸۹۳۔

سر برآہ کاریں۔“

تو خود جبیر علی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میر ادل اڑنے لگا۔ ﴿

طفیل بن عمرو علی اللہ تعالیٰ الدوی مشہور شاعر اور شرفائی عرب میں تھے، بھرت سے پہلے وہ مکہ گئے لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت علیہ السلام کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب حرم میں اتفاقی آنحضرت علیہ السلام کی زبان سے قرآن سننا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ ﴿

بھرت سے پہلے آنحضرت علیہ السلام نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے جواب ڈھیلا اور پھر تھا، تاہم خالد الدعاویٰ نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو ﴿وَالسَّمَاءُ وَالظَّلَّاقُ﴾ (۸۶/ الطارق: ۱) ”قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔“ پڑھتے سناؤ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی ﴿ اور آخراً إِسْلَامَ لَا يَنْهَا ﴾

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس زمانہ میں حضرت موصوف نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز باؤ از بلند پڑھتے تھے آواز سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخوبی اسلام کی طرف کھینچتی، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں ﴿ انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسبیح لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر بازار پر س کی تو حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار روپاً اور کہا کہ خدا کی قسم ایہ کلام اور انہیں ایک ہی چشم سے لکھے ہیں۔ ﴿

جس میں جب آپ علیہ السلام کی بعثت کا چرچا ہوا تو میں شخص جو نہ ہے ایسا میں تھے، تحقیق حال کے لیے مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت علیہ السلام کے پاس سے یہ لوگ اٹھئے تو ابو جہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم مخت حق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا

صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ والطور: ۴۸۵۴۔ ﴿ ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاو) نے تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق، ج ۲، ص ۳۲۰ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ۴، ص ۲۳۷؛ الاصابة، ج ۳، ص ۴۲۲؛ تاریخ دمشق، ج ۲۷، ص ۹۔ ﴿ مسند احمد، ج ۴، ص ۳۳۵۔ ﴿

بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۰۵۔

مسند احمد، ج ۵، ص ۲۹۱۔ منہجی روایت میں یہ الفاظ میں ہے: ان هذا والذى جاء به موسى ليخرج من مشکاة واحدة، لیکن بیرت ابن رشامہ میں وہ الفاظ ہیں: ان ۶ ترمذ مصنف نے کیا ہے۔ ”عن“

نہ بہ بدل لیا۔ انہوں نے کہا: ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لکھم دینٹکم ولنا دینٹنا۔ ۱) قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومنیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرپوری ہوئی صدھا کافر مسلمان تھے۔ ۲) ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کی بنا پر، یعنی چونکہ عرب میں شعرو خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ اور کسی شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصح و بلغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ بے شے قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مجذہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی مجرز ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بناء اعجاز کا کام دیتا تھا۔ دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا محض و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تفہیج، اخلاقی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھا ہے ہیں) ان کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشری ضرورتیں تھیں۔ مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی ﷺ نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور رہ تھے یہ نامکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعہ نہ ہو جاتے یا ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ایک معزز اور کمیں اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البته جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوت اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے

۱) ابن هشام حدیث نقض الصحیفہ، ج ۱، ص: ۲۲۷۔

۲) جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورہ الروم: ۳۱۹۴۔

بار بار دارالنبوة (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجرور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چاروں چار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان ہیں گئے۔

① قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گواہ اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حاجی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان، ریاست و خود سری کو فقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ سما کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلے کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لیے اگر کوئی خود غرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سو داگران نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریحی نظر تھا۔

اب صرف معاشری ضرورت سدراہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کشش سے ترقی کر جاتے ہیں۔

② نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، یعنی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخلیل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بذریج بala تر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گوئی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے مجروانہ اخلاق اور اپنے مافق الفطرت علم و معرفت اور اپنے ربی کوششوں کی بناء پر بشریت سے کوئی بالا تر مغلوق ہے۔ ﴿مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَيْمُونٌ﴾ (۳۱) یوسف: ۱۰ (قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس و معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَقَدْ لَيْسَتْ فِيهِمْ عُمَرًا قِنْ قَبِيلَهُ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (۱۰) یونس: ۱۶

”اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔“

زندگی کا یہی ایجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی ”ایں“ کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، یہوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کارکوئی اور نہیں، نبوت محمدی کا معتقد اوپرین دنیا میں کون تھا، امام المؤمنین خدیجہؓ بنت خویلد، لیکن ان کی اس زاد و اعتمادی کا راز کیا تھا، ۳۰ برس کے مجروانہ

اخلاق اور مانعوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ، وہ خود بیگنیر کو خطاب کر کے نبوت کی تسلیم ان الفاظ میں دیتی ہیں ”محمد ﷺ، خدا کبھی تمہیں رسوائے کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، بختا جوں کی خبر لیتے ہو، مہماںوں کے ساتھ پہ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں بتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔“ *

کن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابو زرفقاری ؓ نے ائمہ اپنے بھائی کو تحقیقی حال کے لیے بھیجا، انہوں نے واپس آ کر جیکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلا کیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ *

نبوت کے بعد قریش نے ذات بنوی ﷺ کے ساتھ گوداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو انہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے۔ اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پیارا پرکھرے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا: ”اگر میں کہوں کہ اس پیارا کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا مجھ مانو گے؟“ سب نے بیک آواز کہا: محمد ﷺ! تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی * ابوسفیان جو بھرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۲۷ میں ہر قل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے، انہوں نے شہادت دی کہ ”محمد ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بدعتی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، تو حید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت صدر حنی کی تاکید کرتے ہیں۔“ ہر قل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ ”نبوت کے یہی آثار دلائل ہیں“ یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ *

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، عفو و درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر جموجی نگاہ ڈالنے سے معذوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک مجرم تھا اور یہ مجرم تسبیح قلوب ہی کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

﴿وَلَوْكُنْتَ فَظًا غَلِيظًا الْقُلُبَ لَا نَفْضُوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) (۳/۲)

”او محمد ﷺ! اگر تم درشت خوا رخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے رہے۔“

* صحیح بخاری، کتاب بدء الوضیع: ۳۔ * صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔ * صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ تبیت: ۴۹۷۱، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اواندر عثیر تک الاقریبین: ۵۰۸۔ * صحیح بخاری، کتاب بدء الوضیع: ۷۔

آپ کی یہی مجرمانہ کشش تھی جو لوگوں کو سمجھنے کھجھن کردا تھا اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہل نہ شکوک و اوهام کو دم کی دم میں منادی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر راثڑا کہ اپنے قبلیہ میں آ کر اس نے کہا: ”لوگوں مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے نگاہ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔“ *

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیرہ رضی اللہ عنہ محبوب اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیے۔ خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دے دیا کہ آپ پہلے میرے زد یک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔ * ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ احمد میں قوتی بازوئے اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جسم نکڑے نکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا، اسی نے ان کا ہجڑہ نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کا ناک کاٹ کر گلے کا ہمارہ بنا تھا، فتح مکہ میں بھیں بدلت کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی، تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی، یا رسول اللہ ﷺ اس طرح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر ان مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر ان محبوب نہیں، آپ نے یہ سن کر فرمایا: ”غدا کی قسم! ہمارا بھی یہی حال تھا۔“ *

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔“ اس نے کہا کہ میں تو لے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے کہا: ”تواب میں تمہارے ساتھ بیٹھنا ہوں۔“ چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھ رہے چاہبے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذی یا اور کسی شخص پر علم کروں۔“ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ”میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ تو راہ میں پیغمبر کے جواہ صاف مذکور ہیں ان کا تحریک کروں۔“ *

ثامہ بن اثال یا ماس کا ایک ریس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن الفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستوں میں باندھ دیا گیا، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ”ثامہ تمہارے

* صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخاہ ﷺ: ٦٠٢١، ٦٠٢٠۔

* صحیح مسلم، باب مذکور: ٦٠٢٢۔ * مسلم، کتاب الأقضیة، باب قضیۃ هند: ٤٤٨٠۔

* رواہ البیهقی فی دلائل البوہ، ج ٦، ص: ٢٨٠؛ مشکوکہ کتاب الفضائل، باب فی اخلاق ﷺ: ٥٨٣٢۔

ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں گے تو یہ احسان شناس کی گردان پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرا دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بندگرہ کھول دیے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور گلہ تو حید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا: ”محمد ﷺ از میں پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محظوظ ہے، مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے تمام نماہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نمائاظر آتا ہے۔“ * ایک بار آپ ﷺ کی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا۔ صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جبوہ میں روائہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دشکنی بھرے ہوئے لیے جا رہی تھی و دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے آپ ﷺ نے برتن مگوائے اور مشکلوں کے منہ کھول دیے، صحابہ ﷺ نے باری باری سے پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی تاشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صدر میں آنحضرت ﷺ نے کھجور، آٹا اور ستون تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر کھوادیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تا خیر کا سبب پوچھا اس نے کہا، راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بد دین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم! وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔ لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان بنت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔ *

بنت کے اتیاز و شاخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرفاں کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا، اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

رونے و آواز پیغمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرفاں دل میں اتر جاتا تھا اور بنت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ بھرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل ہو گیا، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بن

* صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب ربط الاسیر و حبسه: ۴۵۸۹۔

** بخاری، کتاب التیمم، باب الصعید الطیب و ضوء المسلمين يکفیه عن الماء: ۳۴۴۔

سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نگلستان میں بھجو روزہ رہے تھے، آمد آمد کی خبران کے کان میں پہنچ تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ فرمائے ((افشووا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ السلام)) وابیں گئے تو اس قدرتا ثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر ابوایوب انصاری کے مکان میں جوئی پہنچے حضرت عبد اللہ بن سلام ﷺ بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی، اسی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔

ضاد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے، وہ نام میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نحوہ بالله) مجنوں ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس گئے اور کہا "محمد ﷺ ایں جنون کا علاج کرتا ہوں، اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع نیا:

((الحمد لله نحمده رب نستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضل فلا هادي
لهم اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واهشهد ان محمدا عبد الله
ورسوله))

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو بدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا، جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی بدایت نہیں کر سکتا، میں کوئی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ تباہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔"

ان پر ان فقروں کا اثر پڑا کہ وہ مکر رشتنے کے مشتق ہوئے، آپ ﷺ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنائے، لیکن آپ کے اس کلام کی طرح موثر بھی نہیں سن، وہ سند رشک پہنچ جائے گا، ہاتھ لایے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ *

حضرت حییہ جوئیا کے شوہر حارث ؓ نے آپ کے رضائی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سا ہے کہ تمہارا بھائی کہتا ہے کہ لوگ مرکر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا کہ میٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زور دار الجہ میں فرمایا: "ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا مج تھا۔" ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دری پا ہوا کہ کہا کرتے

* مسند احمد، ج ۵، ص ۴۵۔

* بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبي ﷺ واصحاحاته الى المدينة: ۳۹۱۱۔

* سلم، کتاب الجمعة، باب تحفیظ الصلاة والخطبة: ۲۰۰۸۔

تھے کہ اگر میرا بیٹا تھا کپڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ ۱
 انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور مخصوصیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل نہایت پر جلال تھی، چہرہ پر نور تھا، آواز موقر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبر اناجیل کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیتا تھا اسی اثر سے متاثر ہو کر حضرت عبد اللہ بن سلام رض نو مسلم یہودی عالم آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھے تھے:

وجہہ لیس بوجہ کذاب۔ ۲

”جموئے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔“

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار جتنے الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوتا تھا:
 هذا وجہه مبارک ۳ ”یہ مبارک چہرہ ہے۔“

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا ابو رافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے جوں ہی چہرہ اقدس پر نظر پڑی وہ بہرا رجن شیدا تھے، اسلام قبول کیا ۴ اور آپ ﷺ کی غلامی کو فخر سمجھا۔ ۵

۱ اصحابہ، ج ۱، ص: ۲۹۶ تذكرة حارث ابن عبد العزی.

۲ جامع ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حدیث: أفسوا السلام ... ۲۴۸۵۔

۳ ابو داود، کتاب المناسک، باب المواقف: ۱۷۴۲۔

۴ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام يستجن به فی العهدود: ۲۷۵۸۔

۵ اصحابہ: ۶۵، ۶۶، و استیعاب، ج ۲، ص: ۶۶۸۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلَہٖۤ قَلْبَہُ تَعَالٰی کا پیغمبر انس کا م

آنحضرت ﷺ جس عظیم اشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتمم بالاشان کام کو انجام دینے کے لیے دنیا میں بیچھے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قول کرنے پر آمادہ ہو گئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلو د تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پڑا شدید دعوت، اجنبی معمصومیت اور اخلاق کے پروپریتی سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عائق، موافع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمائیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھپتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشش و تباہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحده قومیت، ایک متحده سلطنت، ایک متحده اخلاقی نظام، ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی، اخلاص، ایثار، دین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا وہ گویا یہ حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (ججۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

((الا ان الزمان قد استدار كهيهنته يوم خلق الله السموات والارض)) ﴿

”ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔“

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پر درود الوداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے: ﴿

((قد تو كنکم على مثل البيضاء ليلها ونهارها سواء))

”میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑے جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔“

اور آخر جو الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿الْيَوْمَ أَكْلَمْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَنْمَتُ عَلَيْكُمْ نُعْمَانَ﴾ (۵/ المائدۃ: ۳)

”آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کرو۔“

پروفیسر مارگولیٹھ، جن کی تائیدی شہادت بہت کم مسکنی ہے، لکھتے ہیں:

﴿ بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع: ۴۴۰۶۔ سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب اتباع السنۃ: ۵؛ مستدرک حاکم، ج ۱، ص ۹۶؛ مسند احمد، ج ۴، ص ۱۲۶۔ ﴾

”محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار اسلامت مقرر کیا تھا، بیانِ داول چکے تھے، آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنادیا تھا، آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذهب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتہ سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔“

ایک (دور) یورپ کے بیگانے مستشرق کی نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے متعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے، بیروت کے سمجھی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے، اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داورِ جا عص) نے لکھا:

”دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس ﷺ کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ لکھتی ہیں۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا، تاکہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبق کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دلائی اور عالم گیر زبان بنادیا کر دہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا ریس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوکیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا، ناسموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام خلائق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی لائف آف ہجر مار گولیتھ صفحہ ۲۷۔

۲ مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

نظر سے پوشیدہ شریں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، زراعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکارناہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک موسم کا گم شدہ مال قرار دیا اسی سب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کا رناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

انگلستان کا مشہور انشا پرداز کار لائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیر و رو شپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیر و قرار دے۔ انسیکلو پیڈیا برٹیا کا مضمون تھا "محمد آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے:
 "قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔"

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراض ہے کہ انہی میں یہی بزرگیہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرانک ادا کیے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہو گئی ہو اور یہ اس لیے کہ تمام انہیا ﷺ میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ، ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد یہی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ ﷺ نے فرمادیا کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔"

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمسہ گیری ہے جس پر کوتاه بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ ﷺ کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسی ﷺ سے مذاقا کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کتم کو قضاۓ حاجت کیونکر کرنی چاہیے۔ حضرت سلمان ﷺ نے کہا: ہاں یہ تھی ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبل رخ نہ بنیں اور اپنے وابہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، ان میں کوئی بڑی اور گورنہ ہو۔ نبوت محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمسہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متبدن اقوام ہے لے کر بلند سے بلند اور متبدن سے متبدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے، عرب کے بدؤوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ کی بعثت تھی، اس لیے آپ کی

۱۔ انسیکلو پیڈیا برٹیا طبع یا ز در حم مضمون قرآن، ج ۱۵، صفحہ ۵۹۸۔ ۲۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین: ۳۵۲۵ و جامع ترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء في مثل النبی والأنبياء: ۲۸۶۲۔
 ۳۔ جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب الاستنجاج بالحجارة: ۱۶، سنن ابن ماجہ کتاب الطهارة، باب الاستنجاج بالحجارة والنہی عن الروث: ۳۱۶۔

تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے دھیشوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ نہیں جاتا ہے اور ان کو متدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر جن کا مأخذ انجمیل ہے، عقائد پادریوں کی کوٹسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیساوں کے حکمرانوں سے اور تہذیب تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور مخدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعا کے ساتھ، سب کا مأخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے گیر تعلیمات ہیں۔ انسانوں کے ساتھ، معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا مأخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے گیر تعلیمات ہیں۔ آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جوانانی زندگی کے ہر شعبہ پر حادی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے خلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمابردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قومی اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جامدات سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جواہکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت شخص قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرا اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین تسمیں ہیں: خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت، الفت نیکی اور بھلائی کا برداشت اور گواہی لحاظے سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادات کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرا کا نام اخلاق ہے۔ الخرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دادگی ہدایت لے کر آئے، وہ انہیں چاروں عنوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، انہیں کی اصلاح، تعمیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبران فرائض کے اصلی کارنا نے ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات و حقیقت اس کے چند پختہ غیر مترابل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرة حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندر ولی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم ”دل“ کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معالم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا:

((اَلَا وَانِ فِي الْجَسَدِ مُضْعَةٌ اذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ

فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ إِلَوْهِ الْقُلُوبِ))

”انسان کے بدن میں گوشت کا ایک مکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگزگیا تو تمام بدن بگزگیا بخبار کر کوہ مکڑا دل ہے۔“

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ”**قَلْبٌ سَلِيمٌ**“ (سلامت رو دل) جو ہرگناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ”**قَلْبٌ أَثِيمٌ**“ (فَإِنَّهُ أَنَّهُ قَلْبُهُ) (۲/ البقرة: ۲۸۳) (گناہ کا دل) یہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ”**قَلْبٌ مُّنِيبٌ**“ (رجوع ہونے والا دل) یہ ہے جو اگر کبھی بھکلتا ہے اور سبے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ سنتی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پر زہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((انما الاعمال بالنيات))

”تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔“

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

((انما لکل امریءٰ ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة

ینکحها فهیجرته الی ما هاجر الیه))

صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبر الدین: ۵۲۔

قرآن پاک کی آمدت میں یہ ہے: (فَإِنَّهُ أَنَّهُ قَلْبُهُ) (بقرة: ۲۸۳)

صحیح بخاری، کتاب بدء الوحى، باب کیف کان بدء الوحى الی رسول الله ﷺ: ۱۔ یضا۔

”ہر شخص کے کام کا شرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی بھرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی بھرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے ہے جس نے بھرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔“

آج کل علم نرمیات نے بھی اس مسئلہ کو بدہشہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ اب صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا تم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر مترزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ جس طرح اتفاقیہ کی کوئی شکل چند اصول موضوع اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوع اہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

ظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو اہم نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندر ورنی جذبات کی زنجروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے پاپے زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندر ورنی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ بھی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر بہیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔ عبد اللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جامیت میں بہت سے نیکی کے کام کیے تھے گر بایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! عبد اللہ بن جدعان نے جامیت میں جو نیکی کے کام کیے ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا: ”نہیں اے عائشہ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ ”بِارَاهُهَا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔“

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ ”اے محمد ﷺ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی مال غنیمت کا کچھ ماں باتھا آئے“ فرمایا: ”کیا تم اللہ عز و جل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟“ اس نے جواب دیا، نہیں۔ فرمایا: ”واپس جاؤ کہ میں اپنی شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔“ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان

کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ”کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟“ اس نے پھر لفظی میں جواب دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا: ”میں کسی مشرک سے مدحہ لوں گا۔“ غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیرسی دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا: ”تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟“ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صفائی میں داخل ہوا۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارنا موں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس را کہ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

﴿مَكْلُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمًا إِشْتَدَّتْ يِهِ التِّيُّجُ فِي يَوْمِ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسِبُوا عَلَى شَيْءٍ إِلَّا ذَلِكُ هُوَ الظَّلَلُ الْبَعِيدُ﴾ (۱۴ / ابراهیم)

”جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس را کہ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔“

سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٌ بِقِيعَةٍ يَحْسِبُهُ الظَّهَانُ مَاءً طَحْنَى إِذَا جَاءَهُمْ لَهُمْ مَجْدُدُهُ شَيْئًا﴾ (۲۴ / النور)

”جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو، جس کو پیاس پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو یہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔“

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوچھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود اس سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

﴿أَوْ كَظُلْمَتِ فِي بَحْرٍ لَّيْسَ يَعْشُهُ مَوْجٌ مَّنْ فَوْقَهُ مَوْجٌ مَّنْ فَوْقَهُ سَحَابٌ طُلَمَتْ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكُنْ يُرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ كَنْزًا فَإِلَهُهُ مَنْ ثُغْرٌ﴾

(۲۴ / النور)

صحیح مسلم، کتاب الجهاد والمسیر، باب کراهة الاستعنة في الغزو بكافر، ۴۷۰۔

”یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گھرے سندھ میں سخت انڈھیرا ہو، اس کے اوپر موچ پھر موچ ہے اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو یہ تو انڈھیرا ہے کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوچھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں۔“

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بندہ اور صحیح تخلیق پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لیے ریانماش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کائنات سے اصلی مقصد نام و نہود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقت اور یقین سمجھتی ہے۔ اس بنابر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿إِنَّمَا الَّذِينَ أَمْنَوْا لَا يُطْلُبُوا صَدَقَتُهُمْ بِالْأَمْيَتِ وَالْأَذْدِي﴾
 ﴿كَالَّذِي يَقْعُدُ مَالَهُ يَرَأُهُ الْكَافِرُونَ
 وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَهُمْ لَكُمْ كُمَلٌ صَفَوْانٌ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُمْ وَأَبْلَى فَتَرَكُهُ
 صَلَدًا لَا يَقِيرُونَ عَلَى شَيْءٍ إِنَّمَا كَسْبُهُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّفَّارِينَ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۴)

”اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھو دے کر اس طرح نہ بر باد کرو جس طرح وہ بر باد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چنان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برساتو مٹی دھل گئی اور پھر رہ گیا جس پر جو کچھ بوبیا جائے گا وہاگے گا نہیں۔“

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے نتالان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضا مندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض دعایت ہے، یہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے، اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نماش، جاہ پسندی خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محکمات کے سوا کچھ اور شرہ جائے۔

تورات میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجلی میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راتی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ مجرموں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارقی عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے ۱۰ اس کے برخلاف فلسفہ یونان کے بہت سے پیر و کل اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذاتی جوانی،

مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعریض نہیں کیا۔ عیسائیوں زردشتوں اور برہمتوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت ان کی عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرداہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں ازوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جدول کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پاسکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ، اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برداشیں کیا، چند سید ہے سادے اصول جو تمام ہنی سچائیوں اور واقعی حقائقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا اوسرا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجد نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کو وہ اس دنیا کا تہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پاسکے اور اسی کی رضا جوئی اور اس کی مرضی کی تقلیل ہمارے اعمال کی تہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوٹ کے سوا خلوٹ میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرأ ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاً گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا وہوں کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر ایسا دل سے یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات ہمارے غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔ خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم نہیں کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستہ بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربی اور احکام الہی کی صداقت اور سچائی بھی مخلوقوں و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی اور رحمۃ احت اور مخصوصیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث ہن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی مخلوق ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری راہنمائی کے لیے نہیں ہو گی۔

خدا کے وحشتلوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قادر اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحاںیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانونِ الہی کے مطابق چلاتے ہیں اور

ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لمحہ محفوظ کرتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھایا برا معاوضہ مل سکے۔ خدا کے احکام و بدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور راز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا الفاظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینتوں میں محفوظ رہیں اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہواں کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے، جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بھیمت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے اس لیے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ کمی و حی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ حسنہ یک جاطور پر سورہ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں محل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمَنِ ارْزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَۚ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أَنْوَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَمَا أَنْوَلَ مِنْ قَبْلِكَۚ﴾ (۲/ البقرة: ۳، ۴)

”جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد ﷺ اتنا اور تم سے پہلے تنبیہروں پر اتنا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء ﷺ اور ان کی کتابوں پر)۔“

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُؤْفِقُونَۚ﴾ (۲/ البقرة: ۴)

”اور آخرت (روز) جزا پر یقین رکھتے ہیں۔“

یہ سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے نیچے میں پھر ارشاد ہوا:

﴿وَلَكِنَ الْيَّمَنَ أَمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمَ الْأُخْرَ وَالْمَلَكَةُ وَالْكِتَابُ وَالثَّيْمَنُ﴾

(۲/ البقرة: ۱۷۷)

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔“

سورہ کے آخر میں ہے:

○ أَمَّنِ الرَّسُولُ يَهَا أَنْزَلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ طَكْلٌ أَمَّنِ يَأْتِيهِ وَمَلِكُتِهِ وَكُنْتِهِ
وَرَسِلْهُ (٢٨٥) / القراءة:

”پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اور تمام مومن اس پر ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔“ سورہ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْنًا مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي
أَنْزَلَ مِنْ قَبْلِهِ وَمَنْ يَقْرَئُ بِاللَّهِ وَمَلِكِهِ وَكُتُبِهِ وَرَسُولِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا
بَعْدَ إِعْلَامِهِ﴾ (٤/ النَّسَاءَ: ١٣٦)

”اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہوا ایمان لاو خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔“

اللہ تعالیٰ پر ایمان

﴿أَمَنَ بِاللَّهِ﴾ (۲۸۵) / البقرة

ایک قادر مطلق اور بہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو نہ اہب تھے با وجد اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور معارف و تھائق اور جسمانی اعمال و اخلاق کا سر بنیاد قرار دیا۔ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگز رکر سکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَعْفُرُ أَن يُغْرِكَ يَهُ وَيَعْفُرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ أَنْوَاعِهِ﴾ (۱۱۶) / النساء

”یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔“

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسما و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی فنی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت محمد یہ ﷺ کی غرض و غایت صرف تخلیل پر نظریہ آرائی اور الہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی اور تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونہ عمل بنانا تھا اس لیے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے رموز اور اسرار تو توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلی ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی نجگنی کی جائے۔

اصلاح عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور حشت کی وجہ سے سینکروں غلط عقائد اور توهات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔ شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا

ہے کہ پہلے انسان ان اساب و عمل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اساب سے متاثر ہوتا ہے، اتہام فکر کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشا نی، سمندر کا پرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو بہوت کردیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غوری کے دعویٰ سے اس قدر ایک اور تغیریں کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود ہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب اس اساب نظر سے بالکل او جھل ہو جاتا ہے۔ شرک کی جو گونا گوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تعدد خدا کا ابطال

① دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور جموی علائیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور جسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً: صفت خلق اور احیا و اماتت، برہما، بش، ہمیش کے نام سے موسم ہیں، جو ہمیں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر راشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی کمیں و شمال، نرم و سخت، رات و دن، خیر و شر، حلم و غصب، غرور و خاکساری، فتن و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور متضادات سے خالی نہیں، اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنابر انہوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام بزرگ اور اہم یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدرج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک، روزہ، روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوتا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورہ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور دکیا ہے، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

جو ہمیں کے شرک کی بیانیں اس پر تھی کہ افعال خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شرکو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصویبات آئیں کہ جن کو تم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بد صورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچنے تو اس کے کمال مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرا یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاته خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ

اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور بر الیا جائے تو شر ہے، زہرنا اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استعمال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نکوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے، نہ کوئی شر مخصوص، اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

﴿أَكْثَرُ أَيُّدٍ يَهْنَ فِي الْأَرْضِ أَفَمَا كَادُوا يَهْمِرُونَ رَدَّاً﴾ (۷۲/ الجن: ۱۰)

”آیا الہل زمین کے ساتھ شر کا رادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔“

﴿مَا أَصَابَكُ مِنْ حَسَنَةٍ فَإِنَّ اللّٰهَ وَمَا أَصَابَكُ مِنْ سَيِّئَةٍ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى بِكُلِّ شَيْءٍ عَقِيدَةٌ﴾

(۷۹/ النساء: ۴)

”تجھ کو جو تینکی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت تینکی وہ خود تیری طرف سے ہے۔“

﴿أَوَلَمَّا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ أَصْبَطْهُمْ فَتْنَاهَا لَمْ قُلْمَ أَنِّي هَذَا طَقْلٌ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ عَقِيدَةٌ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۶۵)

”کیا جب تم کو کوئی مصیبت تینکی، جس کے برابر تم ان کو بینچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہربات پر قدرت رکھتا ہے۔“

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے ان میں سے اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ذاکر بہت سی بیماریوں کے لیے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان داؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بُری چیزوں کے لیے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دوہیں:

﴿وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَنْكِيْدُ وَإِلَهَيْنِ اَنْتَنِينِ إِنَّمَا هُوَ الَّهُ وَلَا حَدَّدَ فَإِنَّمَا فَارَهُبُوْنَ وَلَكَهُ مَا فِي

الشَّمَوْتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۶/ التحلیل: ۵۲۰۵)

”اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناو، وہ ایک ہی خدا ہے، تو بھی سے ڈرو، اور اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔“

② بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر، کرشن، کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر

قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحریر کی گئی:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابَ لَا تَغُلوْ فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا حَقٌّ طِإِنَّمَا السَّيِّدُ عَيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ﴾ (۴ / النساء: ۱۷۱)

”اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے،
مسح یعنی عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔“

﴿لَنْ يَسْتَكِفَ الْمُسِّيْحُ ابْنَ يَعْلَوْنَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا الْمَلِكَةُ الْمُقْرَبُونَ طِ وَمَنْ يَسْتَكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكِفُ فَسِيْخُشُهُمُ الَّذِيْنَ هُمْ جَمِيعًا﴾ (۴ / النساء: ۱۷۲)

”مسح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔“
﴿لَقَدْ كَفَرَ الظَّالِمُونَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِّيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ طِ فَلَنْ قَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يَهْلِكَ الْمَسِّيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأَنْتَهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا طِ وَلَلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا يَنْهَا طِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ طِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ يُقْدِرُ يُمْكِنُ﴾ (۵ / المائدۃ: ۱۷)

”وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسح ابن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو بر باد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے خدا ہی کے لیے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔“

﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ إِنَّكَ قُلْتَ لِلنَّاسِ أَتَخُدُونِي وَأَنْتَ إِلَيْنِي مِنْ دُونِنِ اللَّهِ طِ قَالَ سُبْعَنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي طِ يَعْلَمُ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ طِ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ طِ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَامُ الْغُيُوبِ طِ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمْرَتُنِي يِهَ آتِنَ أَعْبُدُ وَاللَّهُ رَبِّي وَرَبِّكُمْ﴾ (۵ / المائدۃ: ۱۱۶، ۱۱۷)

”اور جب خدا کہے کہ کیوں عیسیٰ (علیہ السلام)! تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کو عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہو گا تو، تو جانتا ہو گا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب داں ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔“

آنحضرت ﷺ با وجود اس کے کھاصل کون و مکان تھے لیکن ہمارا قرآن مجید میں تاکید آتی تھی:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مُّشَكِّرٌ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ﴾ (۱۸) / الكهف: (۱۱۰)

”کہہ دے اے پیغمبر کے میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں، لیکن یہ کہ میری طرف وہی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔“

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر حلیل القدر انہیا علیہ السلام گزرے ہیں، ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب خلیل اللہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ تھے لیکن آنحضرت علیہ السلام باوجود وہاں کے کا شرف انہیا تھے آپ نے کیا القب پسند کیا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت علیہ السلام کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا (أشهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ)

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔“

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرت علیہ السلام نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بدکی اس پر یہ آیت اتری:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ وَّاُوْيَنُوبَ عَيْنَهُمْ أَوْ يَعْيَنُهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَلَمُونَ﴾

(۲) /آل عمران: (۱۲۸)

”تم کو کچھا غتیبا نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔“

آنحضرت علیہ السلام بعض کفار کی بدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنَّكَ لَا تَهُدُنِي مَنْ أَحَبَبْتَ﴾ (۲۸) /القصص: (۵۶)

”تم جس کو چاہتے ہو اس کو بدایت نہیں دے سکتے۔“

آنحضرت علیہ السلام نے عبد اللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا:

﴿إِسْتَغْفِرْلَهُمْ أَوْ لَا إِسْتَغْفِرْلَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَقَنْ يَعْفُرَ اللَّهُ﴾

(۹) /التوبۃ: (۸۰)

”تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لیے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔“

آنحضرت علیہ السلام ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لاحاظہ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از

* صحیح بخاری، کتاب المعاڑی، غزوۃ احد، باب لیس لك من الامر شيء: ۴۰۶۹، ۴۰۷۰، ۴۰۷۱ یہ حدیث صحیح بخاری کے قفل ابواب میں مذکور ہے۔

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة القصص: ۴۷۷۲۔

* صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورۃ التوبۃ: ۴۶۷۱، ۴۶۷۰۔

اعتدال مدع نہ کریں جو مجرم ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے:

((لا تطروني كما اطرت النصارى ابن مريم)) *

”میری شان میں اس طرح مبالغہ کرو جس طرح یہود و نصاری نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔“

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعہ آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا: ”ڈرنہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔“ *

بنو عامرا کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ”سید خدا ہے“، لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو تم کو شیطان اپناوکیل نہ بن لے۔“ * اصلی الفاظ یہ ہیں: ((قولوا بقولكم ولا يستجرينكم الشيطان))

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگو پر ہیزگاری اختیار کرو شیطان تمہیں گراندے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کشم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔“ *

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر تو حید کو شرک کے ہر شانہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

③ درمیانی و اسطوں کا مشرک کانہ اعتقاد

شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا در کار ہے اس کا رخ دوسرا طرف بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، انہیں کو حاجت رو جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے نہیں کا نام لیتے ہیں، انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض بر اہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں

* صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الكتاب مربیم: ۳۴۴۵۔

* مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۴۸: علی شرط الشیخین؛ ابن ماجہ، ابواب الاطعمة، باب القديد: ۳۳۱۲۔

* ادب المفرد امام بخاری، باب هل یقول سیدی: ۲۱۱ وابوداود، کتاب الادب، باب فی کراهة التماد، ح: ۴۸۰۶۔ * مستند احمد، ج ۳، ص: ۱۵۳۔

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیا و صلحاء مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس بنا پر قدم ترین امر یہ ہے کہ معبدوں میں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتادیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی پکجھ نہیں چل سکتی، اس کی مرضی میں کوئی دست انداز نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا:

﴿لَا سُتْغِفَنَ لَكَ وَمَا أَمْلَكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (٦٠ / الممتحنة: ٤)

”میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔“

آنحضرت علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کروں۔“ *

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (٢٦ / الشعراً: ٢١٤) تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ”اے قریشیو! اے اولاد عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ امیرے ماں! میں سے جو مانگوں میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لیے پکجھ نہیں کر سکتا۔“ *

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدید کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روائجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

﴿فُلِ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلُؤنَ كُثُفَ الظُّرُفِ عَنْكُمْ وَلَا تَحْمِلُوكُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَسْتَغْوِنُونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةُ أَيْمَهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ حَدُودًا﴾ (١٧ / بنی اسرائیل: ٥٦، ٥٧)

”کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شہرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔“

④ خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

شرک کا ایک ہذا ذریعہ خوارقی عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جس اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن ان میں خدا کی کاشابہ ضرور بہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار

* صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استذان النبی ﷺ فی زیارت قبر امام: ٢٢٥٨، ٢٢٥٩۔

** یہ دو ایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تغیریوں اور حدیث کی کتابوں میں مقول ہے۔

تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنابرآج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انباي علیہم السلام سے مجرمات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خاص نص نبوت میں ہے کہ یہ مسئلہ اسلام کے زمان تک مشتبہ اور محمل رہا۔ قرآن مجید میں خرقی عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیے گئے:

① مجرمات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو مجرمات عطا کرتا ہے:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُرِئُ عَلَيْهَا يَةً قُنْ رَّبِّهِ طَ قُلْ إِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُرِئَ لَهُ وَلِكُنَّ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۶/ الانعام: ۳۷)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی مجرہ خدا کے بیہاں سے کیوں نہیں اترائے کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ مجرہ نازل کرے لیکن لوگ نہیں جانتے۔“

② باوجود اس کے کفار کو مجرہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت مجرہ پر موقوف نہیں:

﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أَنُزُلَ عَلَيْهَا يَةً قُنْ رَّبِّهِ طَ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادِيٰ ط﴾

(رعد: ۱۳)

”اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی مجرہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترائے بلکہ آپ ﷺ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والے ہیں۔“

﴿وَقَالُوا نَّؤُمَنَ لَكَ حَتّٰ تَقْبِيرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ لَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ تَخْيِيلِ وَعَنِّي فَتَقْبِيرَ الْأَنْهَرِ خَلَلَهَا تَقْبِيرٌ أَوْ سُقْطَ الشَّمَاءُ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا إِسْفَاقًا وَتَأْلِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلِكَةَ قَبِيلًا أَوْ لَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقِيَ فِي السَّمَاءِ طَ وَلَكَ نُؤُمَنَ لِرِقْبَكَ حَتّٰ تَنْزِيلٍ عَلَيْنَا كِتَابًا لَقْرَوْهُ طَ قُلْ سُبْحَنَ رَبِّيْ دَهْلُ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا سُولًا ط﴾

(بُنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے پیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو نکڑے نکڑے کر کے ہم پر نہ گردو جیسا کہ تمہارا گماں تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ! میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔“

③ جو مجرزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ نامکن باقی نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں بشر ہوں، دوسرا جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ مجرزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی مجرزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

﴿وَقَالُوا لَهُ أَنْتَ لَأْنْتَ عَلَيْهِ الْأَيْتُ مِنْ رَبِّكَ هُطْ قُلْ إِنَّ الْأَيْتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ وَأَوْ لَمْ يَكُفُّهُمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْنَاكَ الْكِتَابَ يُقْرَأُ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذَلِكُلِّي لَقُومٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (۲۹/ العنكبوت: ۵۰، ۵۱)

”اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے مجرزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ مجرزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صرف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کفار کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شرہ ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔“

اسی لیے مجرمات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

⑤ حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انہیاں علیہم یا پیشوایاں مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ہے اور جس کو مذہبی ایجاد میں جب یہ آیت اتری:

﴿إِنَّهُدُّوا أَجْمَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱)

”ان لوگوں نے اپنے علماء اور رویشوش کو رب بنالیا ہے۔“

تو حضرت عدی ڈھنی نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایاں مذہبی کو اپنارب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں؟“ عرض کی کہ ”ہاں“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہی رب بنانا ہے۔“ عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تائیں، حلال و حرام کی تیسیں، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، بغیر صرف مبلغ اور پیغام رسال اور تعلیم الہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبوی ﷺ کی صفتی رسالت کو پار بارتائید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

﴿وَمَا مَحِّلَّ إِلَّا رُسُولُنَا قَدْ خَلَقْتَ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (۱۴۴/آل عمران: ۳)

جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن من سورة التوبۃ: ۹۵ و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور، ج ۲، ص: ۳۴۸۔

”محمد ﷺ تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔“

﴿إِنَّهَا الْمُسِيْمُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ﴾ (۴/ النَّسَاءَ: ۱۷۱)

”مریم کا بیٹا عیسیٰ، اللہ کا صرف رسول تھا۔“

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت و نبوت کے اوصاف ہیں۔

⑥ غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برستے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک مخبر ہوتا ہے۔ سجدۃ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدیاً یا دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلطین و امراء کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدۃ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل محمد کو دیکھا ہے، وہ اپنے ریسموں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا میری قبر پر گزوں گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟“ عرض کی کہ نہیں، فرمایا: ”تواب بھی نہ کرو اگر میں کسی کو دوسرا کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں یہوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ * اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”یہم نے کیا کیا؟“ عرض کی کہ میں نے شام میں رومنیوں کو دیکھا وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا: ”ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں یہوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ *

⑦ صفات الہی کی توحید

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ شرکت و صرف کی بنا پر، خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیر ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علم غیر ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کافیوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشیں گویاں کیا کرتے تھے۔ عرب میں بھی کافیں کا ہیں

* ابو داود، کتاب النکاح، حق الزوج علی المرأة: ۲۱۴۰۔

* ابن ماجہ، ابواب النکاح، حق الزوج علی المرأة: ۱۸۵۳۔

یہی پیش کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشیں گوئی کرتے تھے۔ کبھی فال سے، کبھی پانے پھینک کر، کبھی یہ نظر کرتے تھے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو منایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں۔ خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

﴿وَعَنْدَهُ كَمَا يَأْتِيهِ الْغَيْبُ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ (٦ / الانعام: ٥٩)

”اور خدا کے پاس غیب کی سمجھیاں ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا: ”مفاتیحِ غیب پاچ ہیں، جن کو خدا کے

سو کوئی نہیں جانتا۔*

① حمل یعنی لڑکا ہو گا لڑکی۔ ② کل کیا ہو گا۔

③ بارش کب ہو گی۔ ④ کس جگہ موت آئے گی۔

⑤ قیامت کب آئے گی۔“

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعا تھے اور ان ہی باقتوں کو لوگ پہلے سے جانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرماتے انصار کی چند لڑکیاں گاری ہی تھیں گاتے گا تے انہوں نے یہ گانا شروع کیا:

﴿وَفِينَا رَسُولٌ يَعْلَمُ مَا فِي عَدٍ﴾

”اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔“

آنحضرت ﷺ نے متع فرمایا: ”یہ کہو ہی کہو جو پہلے گاری تھیں۔“ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو

خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَرَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ (٦ / الانعام: ٥٠)

”کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باقی میں جانتا ہوں۔“

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ﴾ (٢٧ / النمل: ٦٥)

* صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله: عالم الغیب فلا يظهر على غیبه احد: ٧٣٧٩، میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

* صحیح بخاری، کتاب السنکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والوليمة: ١٥١٤٧

ابوداؤد، کتاب الادب: ٤٩٢٢، ترمذی، ابواب النکاح: ١٠٩٠۔

”کہہ دوائے پیغمبر کے خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔“

غیب دالی کے مدعا کا ہن جو عرب کی لگلی گئی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدا لی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پچاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ، ہم جاہلیت میں کا ہوں کے پاس جایا کرتے تھے فرمایا: ”اب نہ جایا کرو۔“ عرض کی: ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے فرمایا: ”یہ تمہارا وہ تمہارا اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے بازنہ رہا کرو۔“ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا: ”کا، ہن کچھ نہیں۔“ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں بھی نکل آتی ہیں، فرمایا: ”شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقفر کر کے اپنے دوست کے کاونوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔“ بھی فرمایا کہ ”فرشوتوں کی زبان سے شیاطین فضاۓ آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کا، ہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔“ جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پڑتے بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عزاف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لیے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔“ علم نجوم جس کے ذرور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعا بننے تھے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا: ”جو کسی کا، ہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ مجرم ہو کچھ اتراتا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔“ *

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دالی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمه کر دیا۔ کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگون بد، نجوم اور غیب دالی کے دوسرے ٹھڑے اعانت طریقے مث گئے، پرندوں اور پانوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و دسوسمہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کسی حکومت قائم نہ رہتی۔

⑧ مخفی قوتوں کا ابطال

کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و عمل یعنی سحر و علم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیث اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قلع کر دیا اور خدا کے سواتnam دوسری مخفی و پوشیدہ قوتوں کا ذرا نہیں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھیک دیا اور دعا و کلمات الہی کے سوا ہر نوع کے جھاز پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے بھی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پایا اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر

* مشکوٰۃ باب الکہانہ میں صحیحین سے یہ حدیث قل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث، ابو داود، کتاب الکہانہ، باب فی الکہان: ۴، ۳۹۰؛ ابن ماجہ، کتاب الطهارة، باب النہی عن ایمان الحانض: ۶۳۹؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۴۲۹، ۴۲۶ سے لی ہیں۔

رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

((إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿٦﴾) (١ / الفاتحة: ٥)

”اے عالم کے پور دگار ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور جھپٹی سے مدد چاہتے ہیں۔“

حرود طسم و جادو اور روئیکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا:

((وَمَا هُمْ بِضَارٍ لِّنَّ يٰهٗ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا يَأْذِنُ اللَّهُ وَيَعْلَمُونَ مَا يَضْرُبُهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ

عَلِمُوا لَعْنَ اشْتِرْكَهُ مَالَكَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقِهِ) (٢ / البقرة: ٤٠)

”یہ جادو اور روئیکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور روئیکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رسائیں ہیں لفظ بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جوان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔“

یہی اعلان کردیا گیا کہ حرود جادو کی حقیقت وہم تخلی سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

((يُخَيِّلُ إِلَيْهِ مِنْ سُحْرِهِمْ أَكْهَانَ شَفَاعَةٍ) (٦٦ / طه: ٢٠)

”مصری جادوگروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔“

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قلع کے لیے ان کے قتل شکن کا حکم دے دیا ۴ تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجز امام قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل وہ بے لس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھوئک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ”تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہیں تو کچھ مضا اتفاق نہیں۔“ ۵ ایک اور صحابی نے ایک بیاریا پاگل کو سورہ فاتحہ کر چند روز پھوئکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقع عرض کیا تو فرمایا ”میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھوئک باطل ہے لیکن تم نے سچے جھاڑ کی روزی کھائی۔“ ۶ ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الرقى والتمائم والتولة شرك)) ۷

”بے شک جھاڑ پھوئک گندے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔“

۱ جامع ترمذی، ابواب الحدود، ماجاء فی حد الساحر: ۱۴۶۰ وابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزية من المjosوس: ۳۰۴۳۔ ۲ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی: ۳۸۸۶۔

۳ ابوداؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقی: ۳۸۹۶۔

۴ ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمام: ۳۸۸۳، ابن ماجہ، ابواب الطب: ۳۵۳۰۔

انہیں صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرنی تھی گھروں لوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ عبد اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنى ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے تھے کہ ”جھاز، پھونک گندے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔“ ان کی بیوی نے کہا: کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا، جب میں جھاز تی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھرا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے آنکھوں میں پانی ڈالیں اور یہ دعا پڑھتیں: ”اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفاذینے والا ہے، تیری شفاذینشی کے سوا کوئی شفاذینیں ایسی شفاء کے پھر کوئی بیماری نہ رہے۔“

⑩ اوہام و خرافات کا ابطال

وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک پرست اہل حرب لرزہ بر انداز مرہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا ظلم توڑ دیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا:

((لا عدوی ولا طیرة ولا صفر ولا هامة))

”نہ چھوٹ بے نہ بد قابلی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔“

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((العيافة والطیرة والطرق من الجبت))

”پرندوں کی بوی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور انکری پھینک کر یا خط سمجھنے کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔“

ایک اور صحابی آپ ﷺ کا یا رشد ا نقش کرتے ہیں کہ ”فال نکالنا شرک ہے۔“ پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برائے جستا ہو بلکہ خدا ہر ہم و سو۔ رکھنا چاہیے یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”پھستر“ (نو) کچھ نہیں۔ یعنی یہ کی بہترین اس کو بالذات کوئی خل نہیں۔ اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو راست تھے ان کو آپ ﷺ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا۔ فرمایا:

((الاغول)) ۶ ”غول بیابانی کچھ نہیں۔“

ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمام: ۳۸۸۳۔ ابوداؤد، کتاب الطب، باب ماجه، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمام: ۳۵۳۰۔

ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الطیرة: ۳۹۱۱۔ ابین ماجه، کتاب الطب، باب من کان بعجه الفال و بکره الطیرة: ۳۵۲۹۔

ابوداؤد، کتاب الكهانة والتقطیر، باب فی الخط و زجر الطیر: ۳۹۰۷۔ ابین ماجه، کتاب الطب، باب من کان بعجه الفال و بکره الطیرة: ۳۵۳۸۔

ابوداؤد، کتاب الكهانة والتقطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۲۔

ابوداؤد، کتاب الكهانة والتقطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۳۔

اسی طرح بکیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورہ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بصریت تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلَا سَآبِيَةٍ وَّلَا وَصِيلَةً وَّلَا حَامِ﴾ (۵ / المائدۃ: ۱۰۳)

”خدا نے بکیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔“

بکیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر ہوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو جنتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر پچھر ہو تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوئی تو ہم رکھیں گے پھر اگر زادہ ملے ہوتے تو مادہ کے ساتھ زبھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس نیچے بوجھا اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسراے اواہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا:

یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منحصر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً: یہاری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہو گا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر تو نہ کوئی کوافع مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً:

① عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند یا سورج میں گر ہن گلتا ہے، آپ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب انتقال کیا تو سورج میں گر ہن لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ انہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے جب سننا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ ”چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گر ہن نہیں گلتا۔“ *

② یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مار جائے تو اس کا جوز آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

③ ایک دفعہ آپ سجد میں تشریف رکھتے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”جالیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے۔“ لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ”کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔“ *

❶ صحیح بخاری، کتاب الكسوف، باب صلوٰۃ الكسوف جماعة: ۱۰۵۲۔

❷ مسنند احمد بن حنبل، ج ۱، ص: ۲۱۸۔

④ شیر خوار بچوں کے سرہانے استراکھ دیا کرتے تھے کہ جن ان کو نہ ستانے آئیں ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو انھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باقتوں کو ناپسند کرتے تھے۔

⑤ نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں فلاڈہ لفکاتے تھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں فلاڈہ نہ رہنے پائے۔

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کے لیے منادیا۔ اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حدیثیات سے کرو، جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں، چڑیوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجه میں بدلنا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

۱۰ کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے، جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لیے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخلیق تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہرو جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اس نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

«هُوَ الَّذِي أَعْلَمُ بِأَعْمَالِ النَّاسِ» (۱۰/ یونس: ۱۸)

”یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بہت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

«مَا نَعْبُدُ هُمْ إِلَّا لِيُقْرَبُونَا إِلَى اللَّهِ مُرْفَقًا» (۳۹/ الزمر: ۳۹)

”بہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقریب میں نزدیک کر دیں۔“

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھر رانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں بھی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے

● ادب المفرد، باب الطیرة من الجن: ۹۱۲۔ ● مؤطرا امام مالک، کتاب صفة السبی مطبوعہ، باب ما جاء، فی نزع المعالق والجرس من العنق: ۷۴۲، بخاری: ۳۰۰۵، مسلم: ۲۱۱۵۔

بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿لَخْنُ أَبْلُو اللَّهُ وَأَجِبَّ أَطْ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۸)

”ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔“

قرآن نے کہا:

﴿لَكُلُّ أَنْتَمْ يَشْرُكُونَ حَلَقَ طَيْعَفُرُ لِمَنْ يَكْأَبُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَكْأَبُ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۸)

” بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یا اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشنے اور جس کو چاہے سزا دے۔“

اور اسی بنابر ان کا دعویٰ تھا:

﴿لَكُنْ تَمْسَخَنَا النَّارُ إِلَّا آتَيْنَا مَعْدُودِتَنَّ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۴)

”ہم کو دوزخ صرف چند گنٹی کے دن چھوکر چھوڑ دے گی۔“

قرآن نے کہا:

﴿وَكَذَرُهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۴)

”اور یہ جھوٹ اپنے دل سے بنا کر جو عقیدہ گھر پکھے ہیں، وہ ان کے مذهب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔“

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروٹی و طبعی طور سے گناہ گاریں اپنے اکلوتے بیئے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ جو وہ زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لیے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغمبر محمد ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

﴿إِنَّهُدُوا أَهْجَارُهُمْ وَرَهْبَانُهُمْ أَرْبَابُ أَقْنُونَ دُونُنَ اللَّهِ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱)

”انہوں نے اپنے عالموں اور رہبوں کو، خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔“

اور اصولی طور سے اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿وَمَنْ يَعْفُرُ الْذُّنُوبَ إِلَّا لَهُمْ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳۵)

”خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔“

ان کا عقیدہ تھا کہ بینا قیامت کے دن باپ کے داشنے بازو پر، برابر بیٹھ کر خلق کا عدل و انصاف کرے گا

قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں اس کی ترویدی کی ہے۔ قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھ گا:

﴿إِنَّكُمْ قُلْتُ لِلَّاتِي أَنْجَدْتُنِي وَأَنِّي لِلَّهِي مِنْ دُونِهِ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۱۶)

”اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناو۔“

وہ کہیں گے بارہا! میں نے تو ان سے وہی کہا، جو تو نے کہا: میں نے ان کو تعلیم نہیں دی، میں نے ان سے بھی کہا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

﴿إِنْ تُعِذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عَبَادُكَ وَإِنْ تَعْفُرْ كَمْمَ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۱۸)

”اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو، تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں منتقل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشش کا اختیار رکھتے ہیں اور اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا ان کے شفع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ اشاعت کے عقائد بالطلہ کی ہر طرح ترویدی کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کوئی نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں:

﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهَدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (۵)

(الزخرف: ۴۳)

”یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔“

﴿لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا﴾ (۱۹/ مریم)

”یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔“

﴿عَمَّا تَنْجِدُ مِنْ دُونِهِ اللَّهُ أَنْ يُؤْدِنِ الرَّحْمَنُ بِفُرْلَانْغٍ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا لَا يُقْدِرُونَ﴾ (۶)

(یس: ۳۶)

”کیا خداۓ برحق کو چھوڑ کر جھوٹے مبودوں کو خدا بناوں، اگر جن ممحنے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔“
کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوچھتے تھے، حکم ہوا:

﴿وَكُمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئاً إِلَّا مِنْ بَعْدِ آنٍ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ

يَشَاءُ وَيَرْضَى﴾ (٥٣/النجم)

”اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچائی، لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہیے اور پسند کرے۔“

﴿أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ شَفَاعَةً قُلْ أَوْلُو الْأَيْمَانُ شَيْئاً وَلَا يَعْقِلُونَ﴾

(٤٣/الزمر)

”کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کوشش بنا لیا ہے، کہ بدے کہ اگرچہ یہ کچھ اختیار اور کچھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفع بنے کے قابل ہیں)“

خدا قیامت میں ان سے کہا گا:

﴿وَمَا نَرَى مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُلُّ الَّذِينَ رَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِي كُمْ شَرٌّ كَوَاطٌ﴾

(٩٤/الانعام)

”اور ہم دیکھتے نہیں کہ تمہارے ساتھ ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔“

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبَلِّسُ الْجُنُّمُونَ وَلَمْ يَأْنُ لَهُمْ مِنْ شُرٍّ كَيْفُمْ شُفَعُوا﴾

(١٢-١٣/الروم)

”اور جب قیامت قائم ہوگی، تو مشرکین ناامید ہوں گے، جن کو وہ خدا کا شریک کا رہتا تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔“

خاص یہود کو مغلط کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

﴿يَأَيُّهُنَّ أَسْرَاعِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَآتَيْتُ فَضْلَلُكُمْ عَلَى الْعَلَمِيْنَ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجِدُنَّ نَفْسَ عَنْ نَفْسٍ شَيْئاً وَلَا يَقْبِلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ﴾ (٤٧، ٤٨/القرآن)

”اے فرزند اسرائیل.....! اور ڈرواس دن سے، جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدله میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مد پہنچائی جائے گی۔“

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے:

﴿يَأَيُّهُنَّ أَسْرَاعِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَآتَيْتُ فَضْلَلُكُمْ عَلَى الْعَلَمِيْنَ وَاتَّقُوا

يَوْمًا لَا تَجِدُ نَفْسًّا عَنْ تَقْرِيرِ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عُدُولٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ۝

(البقرة: ۱۲۲-۱۲۳)

”اے فرزند ان اسرائیل.....! اور ڈرواس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدل قبول ہو گا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔“
اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں:
『يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْتَوْا أَنْفُقُوا مِنْهَا رَزْقَنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَرَى فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۝』 (۲/ البقرة: ۲۵۴)

”اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دو تو ہے، نہ شفاعت ہے۔“
غرض آپ ﷺ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

『أَمْ أَتَخَدُّلُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شَفَاعَةً ۖ قُلْ أَوْلَوْ كَانُوا أَيْمَلُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْلَمُونَ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا طَلَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ نَمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝』

(آل زمر: ۴۳، ۴۴)

”کیا انہوں نے خدا کے سوا اور وہ کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کاراج آسمانوں اور زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔“

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسرا آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرا بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

『وَلَا يَسْلِكُ الَّذِينَ يَذْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهَدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝』

(الزخرف: ۸۶)

”اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ داش رکھتے ہیں۔“

دوسرا جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

『لَا يَمْلُكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ أَتَحْجَزَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۝』 (۱۹/ مریم: ۸۷)

”یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے پکا ہے۔“

لیکن اس شہادت حق اور عبده اللہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

﴿مَنْ شَفَعَ إِلَيْهِ مَنْ بَعْدَ إِذْنِهِ﴾ (۱۰/ یونس: ۳)

”(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفعت نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔“

﴿مَنْ ذَاذِي يَشْفُعُ عِنْدَهُ إِلَّا يَأْذِنُهُ﴾ (۲/ البقرة: ۲۵۵)

”وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اسکی اجازت سے۔“

﴿وَكُمْ مِنْ مَلِكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تَعْلَمُ شَفَاعَتَهُمْ شَيْئًا إِلَّا مَنْ يَعْلَمُ أَنَّ يَأْذِنَ اللَّهُ لَمَنْ يَشَاءُ وَبِرَضَى﴾ (۵۳/ النجم: ۲۶)

”اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہاں کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔“

﴿لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ (۳۷/ النبا: ۸۷)

”یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ حرم والا اجازت دے اور رٹھیک کہے۔“

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیا اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا:

﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ﴾ (۲۴/ سباء: ۲۲)

”اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی، لیکن اس کے لیے جس کے حق میں اللہ تعالیٰ اجازت دے“

﴿إِنَّمَا يُذِلُّ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا﴾ (۲۰/ طہ: ۱۰۹)

”اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اس کے لیے بات کرنا پسند کرے۔“

بلکہ خود انبیا نبیلِ مسلم بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی خود خدا چاہے گا، فرمایا:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَرَضَى وَهُمْ مِنْ خَشِيتِهِ مُشْفِقُونَ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۲۸)

”اور وہ شفاعت نہیں کریں گے، لیکن اس کی جس کے لیے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور ان

کے خوف سے ترساں ہونگے۔“

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے:

﴿فَكَا تَنْعَمُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّفِيعِينَ﴾ (٧٤ / المدثر: ٤٨)

”تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔“

﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ﴾ (٤٠ / المؤمن: ١٨)

”اور ظالموں (مشرکوں کا) نہ کوئی دوست اس دن ہو گا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔“

اور وہ بد نصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَعْفُرُ أَنْ يُشْرِكَ إِلَيْهِ وَيَعْفُرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لَعَنْ يَشَاءُ﴾

(٤ / النساء: ١١٦)

”اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔“

لیکن اب ایسی حالت میں جب کوئی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہیں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہو گا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہو گا، صوفیان اصلاح میں یوں کہو کہ جلال اللہ کی بارگاہ میں اس کی صفت کریمی اور حسینی خود شفیع بن کرہری ہو گی، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿وَأَنِزَرْبِهِ الَّذِينَ يَخَاوُونَ أَنْ يُخْسِرُوا إِلَى رَيْءُومَ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌ وَلَا شَفِيعٌ لَعَلَّهُمْ يَتَقَوَّنُونَ﴾ (٦ / الانعام: ٥١)

”اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو ہشیار کر دے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے ان کے رب کے رب کے سوا کوئی حمایت اور شفیع نہیں شاید وہ بخت رہیں۔“

﴿مَا لِكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٌ وَلَا شَفِيعٌ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾ (٣٢ / السجدة: ٤)

”خدا کے ساتھ مار کوئی حمایت اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔“

* ﴿إِنَّ الشَّرِكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (٢١ / لقمان: ١٣) ”بے شک شرک یہ ظلم ہے۔“ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانیاء:

خدا کی اس صفت کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیاء نے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضل عیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوں کار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو دنیا میں رحمتِ للّٰہی میں اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

۱۱) اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سحدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿لَا تَسْجُدُ وَالشَّمْسٌ وَلَا لِلْقَمَر﴾ (٤١) / فصلت: (٣٧)

”سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔“

اسی طرح وہ زمانہ کو دنپاکے کاروبار میں حقیقی موتور چاہتے تھے اور یہ کہتے تھے:

﴿وَمَا يَهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (٤٥ / الجاثية: ٢٤) ”ہم کو توز مانے مارتا ہے۔“

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ”فلک کج رفتار“ اور ”دہننا نہ جگار“ کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف موقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے ॥ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ”زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے۔“ ॥ اور فرمایا ”خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا یہاں مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں وہ تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔“ ॥ یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ اس زمانہ کو برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی سے اس لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اس خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پختہ کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پختہ کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی اور صبح کو نماز

^١ فتح الباري شرح بخاري، ج ٨، ص: ٤٤١ وكتاب الأسماء والصفات يهقى، ص: ١١٥ -

² صحيح سليم، كتب الالفاظ من الادب، باب النهي عن سب الدهر: ٥٨٦٦.

^٣ صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة الجاثية: ٤٨٢٦ وكتاب التوحيد: ٧٤٩١.

کے بعد حضور صحابہ کی طرف مطابع ہوئے اور فرمایا: "تم جانتے ہو تو تمہارے رب نے کیا کہا۔" صحابہ نے عرض کی، خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔ ارشاد ہوا: "اس نے فرمایا: آج صحیح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل درحمت سے ہم پر پانی برساوہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پختہ سے پانی ہم پر برساوہ تو خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔"

سورج گر ہن اور چاند گر ہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے۔ کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غصب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے ۹۶ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گر ہن لگا اور اسی دن آپ کے صاحبزادے ابراہیم نے وفات پائی۔ صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گر ہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سناتو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا: "کسوف و خسوف اور گر ہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔"

۱۲) غیر خدا کی قسم سے روکنا

شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر قہاقریش اپنے دیوتا لات اور عزیزی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ۱۰ لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کی زبان سے لات اور عزیزی کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً اللہ الا اللہ کہہ دے یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے۔" قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سناتو آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو خود اور نہ کسی کی بات دھرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی ۱۱ میں کوئی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ اسی

۱) صحيح بخاری، کتاب الاستسقاء: ۱۰۳۸ و کتاب الادان: ۸۴۶؛ و صحيح مسلم، کتاب الایمان: ۲۳۱۔

۲) صحيح بخاری، کتاب الكسوف: ۱۰۴۶۔ ۳) سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف باللات

والعزی: ۳۸۰۷۔ ۴) یہ تمام واقعات صحيح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لا تحلفوا بآياتکم: ۶۶۴۷؛

صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من حلف باللات والعزی: ۴۲۵۴، ۴۲۶۰؛ سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالآباء: ۳۸۰۶، ۳۷۹۷ میں مذکور ہیں۔

طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا: ”کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔“ ۴۱ ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سناتوں کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے تھے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا۔ شرک کیا ۴۲ دوسری روایت میں ہے کہ ”ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔“ ۴۳

⑤ خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

اکثر لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت میں خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے بٹلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقيق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشینیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اور وہوں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا تو حید کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی تخت سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشینیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں۔ عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یقین فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شایبہ نکل بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اور وہوں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ ”تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد ﷺ چاہیں۔“ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ ”وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں۔“ ۴۴ یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی اُن سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور محمد ﷺ چاہیں ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آ کر اپنای خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔“ ۴۵ ابو داؤد میں یہی تعلیم اس

۴۱ نسائی، کتاب الایمان والندور، الحلف بالکعبۃ: ۴۔ ۴۲ جامع ترمذی، ابواب النذور والایمان: ۱۵۳۵۔ ۴۳ مستدرک حاکم، ج ۱، ص ۱۸۔ کتاب الایمان۔ ۴۴ مستدرک حاکم بحوالہ مذکور۔ ۴۵ نسائی، کتاب الایمان والندور، باب الحلف بالکعبۃ: ۴۔ ۴۶ ابن ماجہ، کتاب الكفارات، باب النہی ان یقال ماشاء الله وشئت: ۲۱۱۸۔

واقع کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ”یہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے۔“ ۲ لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور یہیقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کسی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلہ کلام میں کہا کہ ”جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں“ ارشاد ہوا کہ ”تم نے خدا کا ہمسرا اور مقابلِ نہبہ ریا جو خدا تھا چاہیے“ ۳ ((ما شاء اللہ وحدة))

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمامِ مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیپھی کر ایک فعل لایا جائے، تا کہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنامیں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی..... یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا: ”اٹھ جاؤ تم بہے خطیب ہو۔“ ۴ آپ ﷺ نے آزردگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ ”ان دونوں“ کو ساتھ کہنے سے سامنیں پر یا اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شاہراہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ..... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ما ثورہ خطبوں میں مقول ہے۔

۱۴ مشبهاتِ شرک کی ممانعت

جن بالتوں میں شرک کا ذرا بھی شاہراہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب مانہتا ب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً: عبد الشمس، عبد مناف ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا: ”بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔“ ۵ اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا اختلال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔“ ۶ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کوششناہ کہا خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔“ ۷

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا: ”کوئی شخص

۱ ابو داود، کتاب الادب، ۴۹۸۰۔ ۲ ادب المفرد امام بخاری، باب قول الرجل: ما شاء الله وشئت: ۷۸۳ و کتاب الاسماء والصفات امام یہیقی، ص: ۱۱۰ مطبوعہ اللہ آباد۔

۳ ابو داود، کتاب الادب، باب لا يقال خبثت نفسی: ۴۹۸۱۔

۴ ابو داود، کتاب الادب، باب فی تغیر الاسماء: ۴۹۴۹۔ ۵ ابو داود، کتاب الادب، ۴۹۶۰۔

۶ مستدرک حاکم، کتاب الادب، باب النہی عن التسمیۃ بملک الاملاک، ج ۴، ص: ۲۷۵۔

غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا "پچھے یا پیچی" اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب، اللہ ہے۔" ❶ ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابو الحکم تھی وہ جب خدمتِ اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابو الحکم کیوں کہتے ہیں۔" عرض کی کہ میرے قبلہ میں جب کوئی زیارت ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے پھول کے کیا نام ہیں۔" بولے: شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپ نے پوچھا: "سب میں بڑا کون ہے؟" عرض کی: شریح۔ فرمایا: "تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے۔" ❷

آخر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت ہیتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی۔ ایک رفع ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا، شیطان کا برا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر کھی کے برا ہو جائے گا۔" ❸

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اس کی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومان کی تھوڑک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا۔ اس بنابر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

❹ قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بناتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، ملتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ ﷺ نے فرمایا: "تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بناتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد بنانا۔" ❻ میں وفات کے وقت چہرہ سے چادرِ المث دی اور فرمایا: "خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔" ❼

❶ ابو داود، کتاب الادب، باب لا يقول المملوك ربي ورتبي: ۴۹۷۵۔

❷ ابو داود، کتاب الادب، باب فی تغیر الاسم القبیع: ۴۹۵۵۔

❸ ابو داود، کتاب الادب، باب لا يقول خبث نفسی: ۴۹۸۲۔

❹ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد على القبور: ۱۱۸۸۔

❺ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد على القبور: ۱۱۸۴۔

⑯ ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے
یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفیاتی محرك ہوتا ہے۔ کوئی طلب شہرت کے لیے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے۔ ان تمام کاموں کا محرك درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿أَرَعَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اللَّهَ هُوَلَهُ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۴۳)

”تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خودا پنی نفسانی خواہش کو بنالیا۔“

اسی لیے برا بست وہی ہے جس کو انسان نے خدا پنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے اس بت کو توڑنا تو توحید کی اصلی تکمیل ہے۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دار و مدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے: ((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِاللِّيَّاتِ)) *

اسی لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرك صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قبلی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بتا پر وحی محمدی ﷺ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و نیت مرضاة اللہ اللہ کی خوشنودی («مُخْلِصُوْنَ لَهُ الدِّيْنُ») مخلص اور («وَجْهُهُ رِتْهُ الْأَعْلَى») ذاتِ خدا قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بتا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک موقت خدا لگ بنا لیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی نہیں، لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً جرم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے رد کیا، خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی اور خدا ہی کے لیے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔“ **

متعدد صحابیوں *** سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ریا چھپا ہوا شرک ہے۔“ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام و درسے

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوضیع: ۱۔

❷ ترمذی، ابواب صفة القيامة: ۲۵۲۱، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق و تقدیمیں درج ہیں، ایک میں تکمیل کھاہے اور دوسرے میں صحن اور اس کے ایک راوی انج کی نسبتوں لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے میں مطابق ہے۔ ❸ حضرت ابو سعید خدری، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن الجید، ابو سعید بن ابی فضال جی اللہ تعالیٰ ان صحابیوں کی روایتیں، مندرجہ امین ملجم مدرسک وغیرہ میں ہیں۔

کی موجودگی کے سبب سے کرے۔” * حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔“ * یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے جمع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادے تھے ”مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوچھیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں اور چچپی نفسانی خواہش میں نہ بنتلا ہوں۔“ * حضرت محمود بن لبید انصاری رضی اللہ علیہ وسلم آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ ”مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔“ صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ”ریا،“ قیامت کے دن جب لوگوں کے اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہو گا خدار یا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔“ * حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ ”ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا: ”کیا دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟“ ہم سب نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا: ”وہ شرک خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نمازوں کو شخص اس لیے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔“ * ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری رضی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”قیامت میں جب خدا کوں اور پچھلوں کو سمجھا کرے گا، تو ایک منادی آ کر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنا لیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے، کہ خدا ساتھ سے بے نیاز ہے۔“ * ابو ہریرہ رضی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا ”خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔“ *

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔ شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر گناہ کرتے تھے۔ * ایک دفعہ حضرت عمر

* مستدرک حاکم، کتاب الرفاقت، ج ۴، ص: ۳۲۹ (صحیح) * مستدرک، ج ۴، ص: ۳۲۰ (صحیح) * مستند احمد مسند شداد بن اوس، ج ۴، ص: ۱۲۶۔ * سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الربیاء والسمعة: ۵۰۰۴۔

* مستند احمد حدیث محمود بن لبید انصاری، ج ۵، ص: ۴۲۷۔ * سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الربیاء والسمعة: ۴۰۳ و مستند باب الربیاء والسمعة: ۴۰۴۔ * سنن ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الربیاء والسمعة: ۴۰۲ و مستند احمد، ج ۴، ص: ۲۱۵۔ * ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب الربیاء والسمعة: ۴۰۰۲۔

* مستدرک حاکم، کتاب الرفاقت، ج ۴، ص: ۳۲۹ (صحیح)

فاروق رضی اللہ عنہ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی آنحضرت علیہ السلام کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رورہے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفن ہستی نے کہا تھا کہ ”ریا کا ادنیٰ شانہ بھی شرک ہے۔“ ۲۱ اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی ہبہ اللہ نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی اپنی جائے نماز پر بیٹھے زار و قادر رورہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ علیہ السلام کے چہرہ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی، میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں! اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ”میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا: ”شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔“ میں نے دوبارہ گزارش کی، یا رسول اللہ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں بٹتا ہوگی؟ فرمایا: ”اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔“ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟ فرمایا: ”ہاں۔“ ۲۲

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تمجیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

۲۱ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۳۲۸ (صحیح) ۲۲ مندرجہ حاکم، ج ۲، ص: ۳۳۰، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاستاذ لکھا ہے مگر ذہبی نے نظر تک کہے کہ ”اس کا ایک راوی عبد الواحد بن زید حزوک ہے“ تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسنند احمد، ج ۴، ص: ۱۲۶ اور سنت ابن ماجہ، (باب الربیاء: ۴۰۵) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے، جن میں یہ عبد الواحد حذیث پر تا، اس لیے ہم نے اس حدیث کو پہاڑ درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجادی اصول و ارکان

یہ تو توحید کے سلسلی اجزاء تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید، لیکن نسبت محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعریف، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزاء کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بُت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی حرف صورتیں بھی موجود تھیں گہرا ایک صحیح مذہب کا تخلیق ان کے سامنے مطلق رہتا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے خرافات اور اواہام کو، جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا بت پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً منادیں اور ان کی جگہ مرتب تعریف، سنجیدہ عقائد اور سچائیوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علم الہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مرحلہ طے کرنا چاہیے گی اور قدرت کے سر، بہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیاء سے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا، بلکہ دین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صرف کو مخاطب کر رہے ہیں اور ان کے معیار اور سلطے کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، بلودوں، مشکلوں، دہریوں،

ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تکمیل و تشفی کا سامان بھی پہنچایا۔ ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے، ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانے نے اپنی جو دنیت ذہن، نکتہ ری اور دیقینہ ہنی کا، بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گوتبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مفہوم صرف ایک ہے اس بنا پر وحی محمدی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی ایک مفہوم کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادای میں اس کو بار بار دہلیا ہے اور انسانوں کو منتہ کیا ہے۔

وہی محمدی ﷺ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور جسمی سے جسمی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردوں اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جن میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کی محسوس ہوتی ہے مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی ان میں نظر نہیں آتی ان کی عمارتوں کے منہدم ہٹکنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گھوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخلیل سے بہرہ در ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمان کا کوئی عہد اس تخلیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجود ای جذبات میں داخل ہے، اسی لیے وہی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلّٰدِينِ حَيْنِيًّا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾

ذلِكَ الَّذِي أَنْتَمُ وَلِكَنَ الْكُثُرُ النَّاسُ لَا يَعْلَمُونَ ﴾۳۰﴾ (الروم: ۳۰)

”اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیل نہیں، یہی سیدھا اور صحیح دین ہے، لیکن کثر لوگ جانتے نہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفُطُرَةِ)) ﴿ ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔“

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق میں ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رنگ و پہ میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نہیں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھنچی ہے:

◆ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين: ۱۳۸۵۔

﴿وَإِذَا خَدَرَ رَبُّكَ مِنْ بَيْنِ أَدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ دُرْتَهُمْ وَأَشَهَدَهُمْ عَلَىٰ آنفِيهِمْ إِلَّا سُتْ بُرْكَةً مُطْقَالُوا بَلِي شَهِدَنَا﴾ (۷/ الاعراف: ۱۷۲)

”اور جبکہ تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ہاں ہم گواہ ہیں۔“

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی خاکستر آگ کو ہوادی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتا ہے:

﴿أَفِي اللّٰهِ شَكٌ فَأَطْرِ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضَ ط﴾ (۱۴/ ابراهیم: ۱۰)

”کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟“

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

﴿أَمْ خَلَقُوا هُنْ غَيْرُ شَكِينٍ عَمْرٌ هُمُ الْخَلَقُونَ ط أَمْ خَلَقُوا السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضَ ط بَلْ لَآئُوقُونَ ط﴾

(۳۶، ۳۵/ الطور: ۵۲)

”کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا انہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں۔“

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو انی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بناے وہ آپ بن گئی یا خود اس نے اپنے آپ کو بنایا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بے قوف یہ کہے کہ نہ مادہ مل کر اپنا پچھ پیدا کرتے ہیں تو سلسلہ تولد و تناہیں کا آغاز کیوں کرو اور اولین نہ مادہ کا اور مادہ تخلیق دروح کا خالق کون ہے؟

یہ گونا گون عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بولموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ ملل و اساباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندر و فی قومی اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار خواص و قوی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجرو درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھپت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب دروز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْخَلْقَ الْأَنْيَلِ وَالْهَمَارِ لَآيٌتٌ لَّأُولَٰئِكَ بِهِمْ

(۱۹۰/آل عمران)

”آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عکمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“
 یہ شب و روز کا نور و ظلمت اور سورج اور چاند کی روشنی اس کی مقررہ رفتار باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے:
﴿وَمِنْ أَيْمَانِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالثَّمَنْ وَالْقَمَرُ﴾ (۴۱/فصلت: ۳۷)

”اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔“
 آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرا بھی ڈال تو فوراً اڈوب جائے گا مگر لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قائدہ کے بموجب یہ عمل نظہر میں آ رہا ہے، وہ جس کے حکم سے بنائے ہے، اس کا لکنا احسان ہے پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں جا کر برستے ہیں جہاں پیدا اور اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہو اور پھر وہ بادل ہواوں کے تحنت پر بیٹھ کر کیسے ادھراً دھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں:

**﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاحْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْعَرِيَّةِ
 يَقْعُدُ النَّاسُ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا
 مِنْ كُلِّ دَائِبٍ وَّتَصْرِيفُ الرِّيحِ وَالشَّعَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَلِيقُهُ
 يَعْقُلُونَ﴾** (۲/ البقرة: ۱۶۴)

”بے شے آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جوانانوں کے لیے فائدہ رسان سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی بر سانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مردے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں پھیلانے میں اور ہواوں کے کبھی ادھر ادھر بدلنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں، ان سب میں سمجھو بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔“

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:
**﴿إِنَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا يَلِيقُهُ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْثُثُ مِنْ دَائِبَاتِ
 لِقَوْمٍ يُؤْقَنُونَ﴾** (۴۵/الجاثیة: ۳، ۴)

”بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والے کے لیے دلیں ہیں۔“

سورہ انعام میں نباتات اور اس کی نیزگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے ۰ کہ ایک ہی زمین ہے، جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک پانی ہے جس سے وہ سیچ جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کارنگ، ہر ایک کامڑہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قدو قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَنَا بِهِ نَبَاتٌ كُلُّ شَنْبُرٍ فَأَخْرَجَنَا مِنْهُ خَضِرًا مُخْرِجٌ مِنْهُ كَثِيرًا مُتَّرَاكِيًّا وَمِنَ التَّغْلِيلِ مِنْ طَلْعَهَا قِتْوَانٌ دَانِيَّةٌ وَجَنْتِيٌّ مِنْ أَعْنَابٍ وَالرَّبِيعُونَ وَالرِّمَانَ مُشْتَهِيًّا وَغَيْرُ مُتَشَاهِيٍّ أُنْظَرُوا إِلَى تُرَيَّةٍ إِذَا آتُمُوهُ يَنْعِهُ طَائِلٌ فِي ذَلِكُمْ لَآيَتِ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾ ۶/ الانعام: ۹۹﴾

”اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے بزرخو شے نکالے، جن سے ہم ہڑے ہوئے دانے نکلتے ہیں اور سکھو کے گا بھے میں سے نکلتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی شکل کے، جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیں ہیں۔“

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو، اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائب کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھ کر ایک ایک سے الگ ہے پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پنور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے:

﴿وَمِنْ أَيْتَهُ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا تَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَمَا مَوَدَّةً وَرَحْمَةً طَائِلٌ فِي ذَلِكَ لَآيَتِ لِقَوْمٍ يَنْعَذُونَ وَمِنْ أَيْتَهُ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخَلَافَ الْأَسْنَتِكُمْ وَالْأَوْانِكُمْ طَائِلٌ فِي ذَلِكَ لَآيَتِ لِلْعَلَمِينَ وَمِنْ أَيْتَهُ مَنَامَكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَأَيْقَاظَكُمْ مِنْ فَضْلِهِ طَائِلٌ فِي ذَلِكَ لَآيَتِ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ وَمِنْ أَيْتَهُ بُرِيَّكُمُ الْبَرْقُ حَوْفًا وَطَمَعاً وَيَنْزَلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُ بِهِ الْأَرْضُ بَعْدَ مَوْتِهَا طَائِلٌ فِي ذَلِكَ لَآيَتِ لِقَوْمٍ

يَعْقِلُونَ وَمِنْ أَيْمَانِهِ أَنْ تَقُومُ السَّمَاوَاتُ الْأَرْضُ يَأْمُرُهُ طَهْ)

(الروم: ٢١-٢٥)

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کوٹھی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر جلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان بیار اور مہر رکھا، اس میں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بولکل مونی ہے، اس میں جانے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدر توں میں سے تمہاری رات اور دن میں نیند ہے اور تمہاری اس کی مہربانیوں کی تلاش ہے، اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم کبھی ڈرتے ہو اور کبھی رحمت کی بارش کی امید پاندھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچے زندہ کرتا ہے، اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔“

اس اخیراً یت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں۔ لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر نہ آنے والے کے سہارے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جاندار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی رہنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

﴿حَكَّتِ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَأَنْقَلَ فِي الْأَرْضِ رَوَابِيَ أَنْ تَمَيَّزَ يَكْمُدُ وَيَبْتَقِي فِيهَا مِنْ

﴿كُلُّ دَآبَّةٍ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَا مَأْمَأَ فَأَثْبَتَنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زُوْجٍ كَيْنُو﴾)

(لقمان: ١٠)

”اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے، جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونئے ڈال دیے کہ وہ تم کو لے کر مل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کیے۔“

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قدرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ تو الد و تناصل، پھر اس کے سدھوں جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہ کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

﴿الَّذِي أَخْسَنَ كُلَّنِي إِلَيْهِ خَلْقَهُ وَبَدَا حَكْيَ الْإِنْسَانِ مِنْ طَلْبِهِ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَةً مِنْ سَلَلَةِ مِنْ مَاءٍ مَّهِيْنَ ثُمَّ سُوِّلَهُ وَنَفَّرَ فِيهِ مِنْ رُوْجِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْيَدَةَ قَلِيلًا مَا تَشَكُّرُونَ ﴾ (۹۲ / السجدة: ۹-۷)

”وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ذیل سے نجڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سدھوں کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھوک دیا، اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے تم ان انسانوں کا بہت کم شکردا کرتے ہو۔“
مردہ زمین کے اندر کیا کیا تو تیس و دیس ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھرنیں دیکھتا، انسان کی زندگی اس کے اندر وہی جذبات، حواس، ذہنی قوی اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے:

﴿وَفِي الْأَرْضِ أَيْتَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَفِي آنفِسِكُمْ أَفَلَا تُبَصِّرُونَ ﴾

(۵۱ / الذاريات: ۲۰-۲۱)

”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم نظر نہیں کرتے۔“

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے۔ پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گور کر کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گور کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص، سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا لکھنا کتنا عجیب ہے!

﴿وَإِنَّ لَهُ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُقِيمُكُمْ وَهَا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثَ وَدَهْ لَبَنًا خَالِصًا سَآءِغًا لِلشَّرِيكِينَ ﴾ (۶۶ / النحل: ۶۶)

”اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے پیٹ سے خالص اور پیمنے والوں کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔“

ایک ہی قسم کے پھل ہیں اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسرے طرح کھاؤ تو وہ ان کو ضائع کر دیں۔

﴿وَمِنْ كُفَّارِ التَّحْجِيلِ وَالآعْنَابِ تَتَخَذُونَ مِنْهُ سَدَّرًا وَيَزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيْةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (١٦ / النحل: ٦٧)

”اور چھوہاروں اور انگروں کے چھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نہ اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھو والوں کے لیے دلیل ہے۔“

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قدیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسم اور زمانے کو نمایاں کرتا ہے:

﴿تَبَرَّكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاوَاتِ رُوْجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾

(٢٥ / الفرقان: ٦١)

”بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چکانے والا چاند بنایا۔“

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات مدد و نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی حکمرانی اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

﴿صُنْعَنَ اللَّهُ الَّذِي أَنْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (٨٨ / النمل: ٢٧)

”اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔“

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مشتمل نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے:

﴿مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفْوِيتٍ فَأَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ أَرْجِعِ

الْبَصَرَ تَرَكَتِينِ يَسْقِلِيْبُ إِلَيْكَ الْبَصَرَ خَاسِيْسًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ (٤٧ / الملك: ٤٣)

”تجھے مہروا لے خدا کی بناؤت میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا، کوئی فتوڑ کھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر، دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھے تک پلت آئے گی، (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)۔“

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:

① قدرت کے عجائبات اور نیر نگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

② عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

③ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انہا مصالحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم عمل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان

کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متكلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بدابہت دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیے علل و اسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر تناہی علل گزر جائیں اور غیر تناہی علل کا خاتم نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی۔ تسلسل عقلائی بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخلیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علیٰ کل پر تمام علمیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ چیزیدہ اور اصلاحات سے لبریز اور بہت سے مخدوف مقدمات پر منی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتلوں کے لیے تسلیم کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا مأخذ مذکور ہے۔ سورہ ہود کے آخر میں ہے:

﴿وَإِلَهُ الْغَيْبِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَإِلَيْهِ يُوْجَمُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾

(۱۲۳: هود)

”اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اس کی طرف ہربات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوجو اور اس پر بھروسہ رکھو۔“

﴿وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ﴾ (۴۲: النجم)

”اور یہ کہ تمیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔“

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آ کر عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسو سے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا: ”کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟“، گزارش کی، ہاں یا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ تو خالص ایمان ہے۔“ * مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کا تناہی تر جانا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھی یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور بھراں خدا کو کس نے پیدا کیا؟ آسان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟“ فرمایا: ”یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کی کو پیش آئے تو کہہ دے ((امْنُتْ بِاللَّهِ)) میں اللہ پر ایمان لا یا۔“ *

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لیے

۱ یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان: ۳۴۰ میں متعدد و ایتوں سے مذکور ہیں۔

2 صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضاً: ۳۴۳۔

یہ دو سلائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔
تو حیدر عقلی لیلیں

اگر کوئی عالم کا غائب و صاف ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقول بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداوں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداوں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے عمل و اسباب کا باہم تواافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین میں تک کی تمام کارکنوں کو قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل پیدا نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو۔ زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسیٰ اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشی اس کے مطابق ہم نہ پہنچ پھر اس کے اگنے کے موافق اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿كُوَّكَانَ فِيهِمَا لِهُ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَ كَا فَسَبَعَنَ اللَّوْرَتِ الْعَرْشِ عَنَّا يَصْفُونَ﴾

(۲۱/الانیاء: ۲۲)

”اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برپا ہو جاتے تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔“

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہے۔ فلسفیۃ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہو گا کہ عالم کائنات معلول ہے۔ اس کی کوئی علت تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علل تامہ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو اب عالم کے علل تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار ہے گا یا نہیں، اگر ہے گا تو پہلی شے علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ ہے گا، تو دوسرے شے علت تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

تو حیدر کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاراوں سے لے کر انسان حیوان، ہوا، پانی، درخت گھاس پات تک دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سرموفر نہیں ہوتا۔ ہر شے اپنے ایک اصول کی پابند اور ایک

عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٌ أَذَّ الْذَّهَبَ كُلُّ إِلَهٍ يَمْأُلُ حَلْقَ وَلَعْلًا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ ط﴾

(۹۱) / المؤمنون: ۲۳)

”اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔“

﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ اللَّهُ كَمَا يَقُولُونَ إِذَا لَا يَنْتَفِعُوا إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَيِّلًا سُبْحَانَهُ وَتَعَلَّى عَنْهَا يَقُولُونَ عَلَوْ أَكْبَرًا سُبْحَنَهُ أَكْبَرًا السَّمَوَاتُ السَّبِيمُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط وَلَنْ قُنْ شَكُّ عَلَى اللَّهِ أَنْ يَعْلَمَ مَا فِي الْأَرْضِ وَمَا فِي السَّمَاوَاتِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلَى عِلْمٍ ط﴾

(۱۷) / بنی اسراء بیل: ۴۲-۴۴)

”کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، تو ابھی حالت میں وہ تخت و ایلے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے (خدا) اس بات سے، جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جوان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔“

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

﴿مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ كُلُّ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ط ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كُلُّ تَرَى يَقْتَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرَ حَاسِيًّا وَهُوَ حَسِيرٌ ط﴾

(۲۷) / الملک: ۳-۴)

”تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فتور تھہ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر تھک کرو اپس آجائے گی۔“

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری دلیل نہیں ہو سکتی اسی لیے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدتِ نظامِ ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمازوں والے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قد رمحرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کی مشترک اور او لین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی بنیادی اصول پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پھرلوں پر قائم کیا، یہ پھر کیا ہیں یہ پھر خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعریف ہے۔

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تہبا ما لک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تحک کر بیٹھ گیا۔ وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا۔ اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مستحکم اسی مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دمکتوں میں ہی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، بھیش اور بُش تینوں نے نسل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یقیناً اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا، جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تہبا ما لک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا سا جھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحراء، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان و اے اور بے زبان سب اس کے آگے گر بیجو دو اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جامل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیوب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور ماحمدہ جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناتے سے پاک ہے:

﴿ذلِّکَ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ طَلَّالَهُ إِلَّاهُو﴾ (۳۹/ الزمر: ۶)

”وہ ہے اللہ تھا را رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔“

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۴۴/ الزمر: ۳۹)

”آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔“

﴿فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۴/ الانعام: ۶)

”آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔“

﴿عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۶/ الانعام: ۷۳) ”چھپی اور کھلی کا جانے والا۔“

﴿كُلُّ شَيْءٍ عِلْمَ لَكَ إِلَّا وَجْهَهُ مَلِكُهُ الْحَكْمُ﴾ (۲۸/ القصص: ۸۸)

”اس کی ذات کے سوا، ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فصلہ کی طاقت ہے۔“

﴿لَيْسَ كَيْثِلِه شَنِ عَ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (٤٢ / الشوریٰ: ١١)

”اسکے اندر کوئی چیز نہیں اور وہ سنتے والا اور دیکھنے والا ہے۔“

﴿هُوَ الَّتِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (٤٠ / المؤمن: ٦٥)

”وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔“

﴿وَعِنْدَهُ مَفَالِحُ الْعَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ

إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا يَجِدُهُ فِي ظُلُمَتِ الْأَرْضِ﴾ (٥٩ / الانعام: ٦)

”غیب کی سنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، ذکری اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔“

﴿اللَّهُمَّ مِلِكَ الْمُلْكِ مُؤْتَنِي الْمُلْكَ مَنْ شَاءَ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مَنْ شَاءَ وَتُعِزُّ مَنْ شَاءَ

وَتُذِلُّ مَنْ شَاءَ طَبِيْدَكَ الْحَمْدُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ عَقِيدَرُ﴾ (٢٦ / آل عمران: ٣)

”اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلانی ہے تو ہربات پر قادر ہے۔“

﴿وَإِنْ يَتَسَلَّكَ اللَّهُ بِضَرِّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدُكَ بِخَيْرٍ فَلَآذَ لِفَضْلِهِ بِيُصِيبُ

يَهُ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (١٠ / یونس: ٧)

”او اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلانی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور حرم کرنے والا ہے۔“

﴿أَللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ أَنَّى الْقِيَومَةُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا تُوْمَدُهُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَقْعِدُهُ عِنْدَهُ إِلَّا يَأْذِنُهُ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا يَكُوْدُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ (٢ / البقرة: ٥٥)

”اس اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھا آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو خلق کے درود ہے اور جوان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے

اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احتاط نہیں کر سکتے، مگر وہ جو چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔“

﴿يَعْلَمُ مَا يَكُونُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَعْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزَلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعْلُومٌ أَبْيَانٌ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ يَصِيرُ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ رُتْبَةُ الْأُمُورِ﴾ (۵۷/ الحدید: ۴)

”جوز میں میں گھتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں پڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو، اللہ اس کو دیکھتا ہے، آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرچع وہی ہے۔“

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱/ الفاتحہ: ۲)

”سب تعریف اسی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔“

﴿وَلَهُ أَسْكَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳/ آل عمران: ۸۳)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔“

﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ذُو الْعَرْشِ الْعَجِيدُ فَقَالَ لِيَأْيُدُونَ﴾

(۱۶-۱۴/ البروج: ۸۵)

”وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔“

﴿يُسَيِّمُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱/ الجمعة: ۶۲)

”آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔“

﴿وَإِنْ قِنْ شَيْءٌ عَلَى إِلَيْهِ مُسْتَحِمٌ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۴۴)

”اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔“

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ طور پیش کیا جس کے سامنے معبدوں ان باطل کی عزت خاک میں مل گی، بتوں کی بڑائی کا طسمٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ بیش کے لیے بھج گیا، جن و انس، شجر و جمر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر بخوبی نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے (آتا اللہُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ) (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صد ابلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحید محمدی کا دوسرا نبیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو مجبودہ

کرتے ہیں، پتھروں کو پوچھتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا جانتے ہیں، جنات اور ارواح خبیث کے نام کی دہائی پکارتے ہیں۔ انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا جھکتے ہیں۔ وہ حقیقت میں انسان کے مرتبہ سے ناقص ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کم تر جانتے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جامل عربوں کو یہ نکتہ سوچایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرضِ انعام دینے آیا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورہ میں آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عین اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دبیا چہے ہے۔ اس کو فرشتوں کا محدود بنانا گویا تمام کائنات کا محدود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماع کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ **﴿إِنَّمَا جَاعِلُ فِي الْأَرْضِ خَلِيلَهُ﴾** کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سرخلافتِ الہی کے تاج سے متاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔ یہ منصبِ اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو، نہ زمین کو، نہ پہاڑ کو، صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردان اس بوجھ کے قابل نظر

آئی۔ فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا إِلَيْكُمْ أَنَّمَاءَهُ عَلَى السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالجَبَالِ فَأَيَّنَّا أَنْ يَحْمِلُنَّهَا وَأَنْ شَفَقَنَ مِنْهَا وَحَمَلُهَا الْإِنْسَانُ﴾ (۷۲/الاحزاب)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو انھالیا۔“

وحی محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بنایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنا یا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرِمَنَا بَنَى آدَمَ وَحَمَلَنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْحَرَقِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيَّبَاتِ وَقَضَلَنَاهُمْ عَلَى كَيْفِيْرَقْنَاهُنَّ خَلَقْنَا لَهُنَّا كَيْضِيلَةً﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل)

”ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔“

انسان ہی وہستی ہے جو سب سے معتدل قومی اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا إِلَيْسَانَ فِي أَخْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (۹۵/التین)

”البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔“

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ ۱ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سرا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو ۲ کو وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جگ میں اگر تکواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر پروارہ کرنا چاہیے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ ۳ غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اوارتیرے جیسے چہرہ کو بلگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا۔ ۴ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے کہ ﴿لَيْسَ كَيْشِلْهُ شَكْنٌ﴾ ۵ (۴۲ / الشوری: ۱۱) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھنڈ لی سی جھلک موجود ہے۔ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، حرم، حخا وغیرہ تمام صفاتِ رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے دیعت کر لگھی ہیں اور جو نکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اسی کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیضِ رحمانی کا موردناظہ بر کیا۔ ۶ اب غور کرو وہ چہرہ جس کو خدا سے نسبت ہواں لائق ہے کو وہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ لٹکے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ الْأَرْضِ﴾ (۱۶۵ / الانعام: ۶)

”اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔“

تواب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا اسکے کو بجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر ہیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنائے:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ كُلُّمَاً﴾ (۲۹ / الفرقہ: ۲)

”جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لیے بنایا۔“

﴿أَنَّ اللَّهَ أَكْبَرُ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۲ / الحج: ۶۵).

۱ صحیح بخاری، کتاب الاستنداں، باب بدء السلام: ۶۲۲۷؛ مسند احمد، ۲ / ۷۵۱؛ ادب المفرد بخاری لانقل، فتح اللہ وجہہ: ۱۷۲ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۶۰۵ نیز تورات میں بھی یہ تروان الفاظ میں ہے: ”خُسْنَ وَخَدَنَ آدَمَ كَوْبِيدَأَ كَيْخَادَأَ كَيْ صُورَتَ پَرَسَتَ بَنَيَا.“ (پیدائش: ۲۵)

۲ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا شرب العبد فليجتنب الوجه: ۲۵۵۹ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهي عن ضرب الوجه: ۶۶۵۶ تا ۶۶۵۱۔ ۳ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ۶۶۵۰ آخری کو اصرف مسلم میں ہے۔ ۴ ادب المفرد امام بخاری، باب لانقل فتح اللہ وجہہ: ۱۷۲۰۔

۵ اس حدیث کی شرح میں فتح البازی شرح بخاری، ج ۵، ص: ۱۳۲ میں قول لفظ لیا گیا ہے۔

”زمیں میں جو کچھ ہے، خدا نے اس کو تمہارے لئے میں دے دیا ہے۔“

توب و روزے زمیں کی کسستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کے لیے بنے ہیں۔ جو چاند اور سورج کو پوچھتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لیے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ولی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنتی ہے اور انسان خدا کے لیے، اس لیے کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں الگا نہ چاہیے۔

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک در کارند

تاتو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو پنا معمود بنا یا تو حمدی علیہ السلام نے انسانوں سے کہا:

﴿وَسَخَّرَ لَهُمُ الْأَيْلَلَ وَالثَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْجِبُوْمَ وَمُسَخَّرٌ بِأَمْرِهِ﴾ (النحل: ۱۶)

(۱۶/النحل)

”اور خدا نے رات و دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔“

انسانوں نے جانوروں کو پوچھا تو پیغمبر محمدی علیہ السلام نے ان انسانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم ان کے نہیں ہو:

﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دُفْعَةٌ وَّمَنَافِعُ﴾ (۱۶/النحل: ۵)

”اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا، تمہارے لیے اس میں اون کی گرمی اور دوسرا فائدہ ہے ہیں۔“

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیوبی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی انہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَرْكَاتِ لَكُمُوا مِنْهُ أَحَمَّ طَرِيقًا وَسَخَّرَ جُوْمًا مِنْهُ حَلَيَّةً تَلْبِسُوهَا وَتَرَى

الْفُلْكَ مَوَاحِرَفِيهِ وَلَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۱۶/النحل: ۱۴)

”اوہ ہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا، تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ، تا کہ تم اس میں سے آرائش کے موٹی پینے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاڑ سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، تا کہ تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو۔“

آگ بھی انسانوں کی مبود بندی حالانکہ وہ خود انہی کی محبت میں جل رہی ہے:

﴿إِلَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا آتَتُمُوهُنَّهُ تُوقَدُونَ﴾ (۸۰/ینس: ۳۶)

(۳۶/ینس)

”جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔“

الغرض زمین سے لے کر آسان تک جو بھی مخلوق ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور سب اسی کے لیے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور محبود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھت پر اپنا سر جھکا سکے؟

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس تو حید کی تلقین کی۔ وہ انہیں دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لیے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سرنہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمایہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماوراء عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھت سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجاہیں اور ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر ثناہ ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔ وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخيّل ہو؟ تعلیم محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخيّل

قرآن پاک کی آیات، جامیلت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمه کے کتابات سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخيّل ضرور موجود تھا۔ جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر مروہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا ہاتھ منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے اور اس سے کیا مانگنا چاہیے اور کیونکر ما انگنا چاہیے، اس کے حضور میں دعائیں کیونکر کی جائیں؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم تو کل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صفت سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک

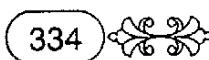
ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آ سماں سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے، کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں، کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی معموث کرتا ہے کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دے بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مowaخذہ کرے گا؟ یہہ با تین ہیں، جن سے عرب جالمیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخلی نہ تھا۔ جالمیت کا ایک ایک شہر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرو، اس سے زیادہ پکھنہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتو را علی ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاوں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربیٰ تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا اسکی مشیت و ارادہ اور قدرت و سعیت سے آ گاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود جس کی مشیت کائنات کے ہرزہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے رو برو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دے اور ذمہ دار، اس کے مowaخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محظوظ ازیل ہے اور اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیزگیاں اوپر سے یچھے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر، اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخیموں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آ سماں وزمین کو فتا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل ہے، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصد اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

﴿أَلَا يَذِكُرُ اللَّهُ تَعَظِيمُ الْفَلَوْبُ ﴾ (۲۸) / الرعد:

”ہاں خدا کی یاد سے دلوں کوطمینان کی دولت ملتی ہے۔“

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جا گئے ہر



حال میں اس کی یاد میں سر مرست و سرشار ہو گئے:

﴿يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيمًا وَقُوَّادًا وَعَلَى جُنُونِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۱) (۳/۳)

”وَهُدَاكُوا ثُلَثَةٍ، بِيَتْهَةٍ اور لَيْلَةٍ یاد کرتے ہیں۔“

اس مرستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی سرنہیں کی، دوستمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے بزدا نہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا نہ ہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دلدار ایازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿رِجَالٌ لَا تُلِيهُمْ بِيَجَارَةٍ وَلَا يَنْهَى عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (النور: ۲۴) (۳۷/۲۴)

”وَلَوْلَكَ جَنْ كَوْتِجَارَتْ اور خَرِيدْ وَفِرْوَختْ، خَدَا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔“

ان کی محبت الہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا۔ خدا نے ان کی توصیف کی کہ

﴿وَالَّذِينَ أَمْنَوْا أَشَدُ حُجَّةً لِلَّهِ﴾ (آل البقرة: ۱۶۵) (۲/۱۶۵)

”ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔“

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی و صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبے ایمان کا پرتوحی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (الطلاق: ۳) (۶۵/۳)

”جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے، تو خدا اس کو لوس کرتا ہے۔“

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافِ عَبْدَهُ﴾ (آل الزمر: ۳۶) (۳۶/۳۶)

”کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔“

﴿وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ يَخْشَى﴾ (آل احزاب: ۳۷) (۳۳/۳۷)

”اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔“

ان میں یہ تمام روحاںی و احلاطی جو ہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسمااء و صفات

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مگر غور کیجیے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے ہیں ہماری حقیقت رہی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنابر پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے

اشیاء کی تعریف کے مدی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزر نے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد مطلق) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفانی شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ علم ہے تو وراء الورا، سنتی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تخلیک یوکر کر سکتی، جملی گاہ طور اسی رمزکی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتیں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اس نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام کی ایک اعلیٰ سنتی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخلیل سے بڑی حد تک نا آشنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعی بیکار تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتنا را گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ ”الرحمٰن“ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کے معنی حرم کرنے والے کے ہیں۔ اصحاب افیل کے رہیں عیسائی ابرہہ کے نام سے سد عرم (یہیں) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرم فاضل گاہزرنے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ ”رحمٰن“ کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعر کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑھو گئی تھی، اسی لیے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صالح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاهدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحيم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ”قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے؟“ مُحَمَّدُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمٰن کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ ہم بھی رحمٰن کے آگے سرگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا إِلَى رَحْمَنِ فَأَلْوَأُوا مَا لِرَحْمَنِ فَإِنَّسَجُدُ لَهَا أُمُرْنَا وَإِذَا دُهُمْ لَغُورًا﴾

(۶۰) الفرقان

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے، کیا تم جس کو کہواں کوہم سجدہ کریں، رحمٰن کا نام ان کی نفرت اور بڑھادیتا ہے۔“
مشرکین کو یہ بر الگتا تھا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی ندمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمٰن کی مدح و ستائش کرتے ہیں:

صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد و المصالحة مع اهل الحرب و کتابة الشروط
 ٢٧٣٢، ٢٧٣١

﴿أَهُدَا الَّذِي يَدْعُونَ إِلَيْهِنَّمْ وَهُمْ يَدْعُ كُرِّ الرَّحْمَنِ هُمْ كُفُورُنَ﴾ (٢١ / الانبیاء: ٣٦)

”مشرک آپ کو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برآ کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔“

تعالیٰ محمدی نے عرب کے نا آشنا یا حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حدیثیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے:

﴿قُلْ اَدْعُوا اللَّهَ أَوْ اَدْعُوا الرَّحْمَنَ طَائِيْرًا مَا تَدْعُ فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾

(۱۷ / بنی اسراء: ۱۱۰)

”کہہ دو (اے پیغمبر کے) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔“

الله تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل نا آشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے بیہود بھی ان کے متعلق غلطیوں میں بتلا تھے۔ یہودیوں کے اسنفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ”یہوا“ تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام ”ایم“ ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان کے علاوہ اس کے بیسوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والے خداوند یعنی رب الافواج کا لفظ ہے جو اس کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ”باب“ کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تسلیٹ کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پر وہ میں چھپایا اور یہ تاویل کی گئی کہ تسلیٹ کے اقانیم شیش باب (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باب، حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریع سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کی خداوں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیزگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرورہ گیا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے

تمام مذاہب اسی تجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، بھیش، وشنو، تین صفات خالق، محیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثیث پیدا کر دی، شنکر آجاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تعلیم کیے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جن مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضاے تناول کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۲ کروڑ عجیب الخلق تدویتوں کی عظیم الشان بھیز بھی صفات و اسامیٰ الہی کی تجسم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نتیٰ صورتیں نمایاں کیں، مجوہیوں میں یہ دن اور اہم من کی مشویت اور دوئی بھی، خدا کی دو صفتیں، ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں تقسیم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں لگنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخلیقات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربیٰ ہدایت کے نور سے سراحِ نیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کامل لگنی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باقتوں کی کوئی انتہائی نہیں، آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی: ”اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے دیلے سے، جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔“ حضرت عائشہؓؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی: ”خداوند! میں تیرے سب ایسے ناموں کے دیلے سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔“ ﴿ قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا: ﴿فَلَمْ يُكَانَ الْحَرُّ مَدَّا إِلَكْلِمَتْ رَيْنَ لَنْفِيدَ الْبَغْرِقِيلَانَ أَنْ تَنْفَدَ كِلِمَتْ رَيْنَ وَكَوْجِنْكَا بِيُفْلِهِ مَدَّا﴾ (۱۰۹/الکھف)

”کہہ دے (اے چیغرا!) کہ اگر سمندر میرے پور دگار کی باقتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پور دگار کی باقی ختم نہ ہوں گی اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔“

دوسری جگہ کہا گیا:

﴿وَكَوْأَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَفْلَامٌ وَالْبَرْيَدَةُ مِنْ بَعْدِهِ سَبَعَةُ أَبْخُرٌ مَا نَيَّدَتْ كِلِمَتُ اللَّهِ﴾ (۳۱/لقمان: ۲۷)

”اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم ہو جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باقی ختم نہ ہوں گی۔“

﴿یَتَبَوَّعُونَ رَعًا مِنْ اِمَامٍ بِيَهْقَى نَے کتابِ الاسماء والصفات، بابِ البيان ان لله جل ثناءه اسماء اخر، ص: ۴-۵ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۹۱ میں بھی (بند عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) ہے۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

﴿أَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْإِسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾ (۲۰ / طہ: ۸)

”نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ، اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔“

برائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر صفات اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلخلہ نہیں:

﴿قُلْ ادْعُوا اللّٰهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيّاً مَا تَذَكّرُ عَوْفَلَهُ الْإِسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾

(۱۷ / بنی اسراء، یل: ۱۱۰)

”کہہ دے (اے پیغمبر!) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا حسن کہہ کر، جو چاہے کہہ کر پکارو کہ سب اچھے نام اسی کے ہیں۔“

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو، جو اس کے کمال اور برائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اسکو یاد نہ کرو:

﴿وَلِلّٰهِ الْإِسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا مَوْدِرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِمْ﴾

(۱۸۰ / الاعراف: ۷)

”اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجھی کرتے ہیں۔“

تعلیمِ محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنی سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ اس کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا کوئی ہو گا جس کا خاتمه خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر بیرون کے دل میں ہونا چاہیے:

﴿أَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورٍ يُكَشَّلُو فِيهَا مِصَابُحٌ أَلِيْضَابُحُ فِي رُجَاحَةٍ أَلْرِجَاجَةٍ كَانَهَا كَوْكَبٌ دُرْيٌ يُبَوَّدُ مِنْ سَعْيَةٍ مُبَرِّكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٌ وَلَا غَرْبِيَّةٌ لَا يَكُادُ زَيْتُهَا يُعْظَىٰ وَلَا كُلُّ تَمَسْسَةٍ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهُدِي اللّٰهُ لِنُورٍ مَنْ يَشَاءُ طَ وَيَضِيرُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلْمُتَّاَسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (۲۴ / النور: ۳۵)

”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلا یا گیا ہو، وہ پورب ہے نہ وہ پچھم ہے، اس کا تیل

اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جانے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچادے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

﴿اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ أَكْبَرُ الْقَيْوُمُ لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نُوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْلَمُ عِنْدَهُ لَا يَأْذِنُهُ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَمْكُرُونَ يَعْلَمُ عِنْدَهُ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَيَعْلَمُ كُلُّ بَيْتٍ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا يَمْكُرُهُ حَفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ (۲۵۵/ البقرة)

”اللہ نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبدود، وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنجھا لے ہے، اس کو انگلہ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں اور زمین میں کو سامنے ہوئے ہے، اس آسمان اور زمین کی تکہانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔“

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُنُوْسُ السَّلَمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَمِّنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْلَمَ اللّٰهُ عَمَّا يَتَرَكَّبُونَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِيُّ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى طَبِيْسِمُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (۵۹/ الحشر: ۲۲-۲۴)

”وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، چھپے اور سکھلے کا علم رکھنے والا، وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی اسن والا، ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، بنانے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لیے سب اچھا نام ہیں، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔“

﴿سَبَّهَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعْلَمُ وَيُبَيِّنُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ عَقِدِيْرٌ هُوَ الْأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِيَّةٍ أَيْتَمَرْثِرَتُوْيَ عَلَىِ الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَكْبُرُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْبُلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ

مَعْلَمٌ أَئِنَّ مَا كُنْتُمْ طَالِهُ يَهَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَهُ اللَّهِ تُرْجُمُ الْأُمُورُ يُولِجُ الْيَلَى فِي التَّهَارِ وَيُولِجُ التَّهَارِ فِي الْيَلِ وَهُوَ عَلَيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥٧﴾

(٦-١/ الحدید)

”آسانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی غالب اور دانا ہے، آسانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہربات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے، وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہربات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسان کو اور زمین کو چھڈنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جوز میں میں گھستا ہے، اور جوز میں میں سے لکھتا ہے اور جو آسان سے اترتا ہے اور جو آسان میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے اسی کی آسانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، وہ سینوں کے سب بھیوں سے واقف ہے۔“

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخلیق اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو مناکران کے سامنے جو بلند تخلیق پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے جب تو حید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آل واولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں رحمی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ أَللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ وَلَمْ يُوَلِّ دُولَةً وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُواً أَحَدٌ﴾

(٤-١/ الاخلاص)

”کہہ دے (ای پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جانپناہ ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اسکے کوئی ماں باپ ہیں، (جنہوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (جو اس کی بیوی ہو)۔“

یہ روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مردی ہے۔ حضرت ابی ذئبؑ صاحبہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ”صمد“ وہ ہے جو نہ جتنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا

* مستدرک حاکم، تفسیر سورۃ اخلاص (صحیح) ج ۲، ص: ۵۴۰ و جامع ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۳۶۴
و کتاب الاسماء بیهقی ابواب ذکر الاسماء الی تبع نفی التشییہ، ص: ۲۲ (الہ آباد)

ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اسکا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے، ”غور کرو کہ محدث رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخلیق تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخلیق کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا، جس کا اندازہ حضرت ابی یعنی تفسیر کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب تراجمہ قبیلہ کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ ”خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی اس کا جھلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے“ * حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یعنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد جو تعلیم

محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے ہمہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ و تقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔ اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ”حمد“ کا ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ ”حمد“ کے معنی لغت میں اوچی پتھر میں زین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلا ب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہوا اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اس لیے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آں اولاً نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کوڑا ای میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ”صَمَدَة“ اس اُنفی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہو وہ شریف جس کی شرافت کمال ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بربار جس کی برباری بد رجہ اتم ہو، وہ بے پرواو بے نیاز جس کی بے پرواوی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جرودت کی انتہائے ہو، وہ علم والا جس کا علم بد رجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی کامل کے درجہ تک ہو یعنی وہ جو بڑا ای اور بزرگی کی ہر صرف میں کامل ہو۔ *

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ اخلاص: ۴۹۷۵۔

** کتاب الاسماء والصفات، امام یہقی ص: ۴۳۔

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ: وہ جی و قوم جس کو زوال نہ ہو اور جوابتی ہو۔

ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ: جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ علیہ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہ رضی اللہ علیہ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمه شعی: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمه رضی اللہ علیہ: جس میں سے کوئی دوسرا چیز نہ لٹکے۔

قادرہ رضی اللہ علیہ: باقی، غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معنی * اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، تاہم اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چنان کے ہیں جو لای اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحقوں میں جائے پناہ کے لیے چنان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۰-۳۲) میں ہے۔

”اگر ان کی چنان ان کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوندان کو اسیرنہ کرواتا کیونکہ ان کی چنان ایسی نہیں جیسی ہماری چنان۔“

”یہ چنان“ اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے۔ سوال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدلتا ہے ”خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چنان ہمارے خدا کے مانند نہیں۔“ (۲۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو (۲) لفظ ہیں احمد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو ممتاز اکملی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا و تہبا، اکیلا ہے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنى اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دشییر، سب کی جائے پناہ، سب کاحتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرچ، سب کا مادی، سب کا بجا یعنی سب کی چنان، مصیبتوں میں سہارا، بلااؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿فَقِرْبُوا إِلَى اللَّهِ﴾ (۵۱/ الداریات: ۵۰)

”ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔“

* ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی، ص: ۴۳؛ مفردات القرآن راغب اصفہانی، ص: ۲۸۸؛ ابن حجر طبری، جز ۳۰، ۱۹۷، ص: ۱۹۶؛ ابن کثیر، ج ۴، ص: ۵۷۰ اور تفسیر سورۃ اخلاص لابن تیمیہ، ص: ۳۔

یہ سورہ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر درکعت میں قراءت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بشارت ہو کر خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ **❶** ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسرا سورہ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا، مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روشن چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا: ”یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔“ **❷** قدارہ بن نعمان رضی اللہ عنہ صحابی تھے، جورات بھرا سی ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوڑ ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا: ”یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔“ **❸** اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عد کو پسند کرتا ہے۔“ **❹** آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے۔ پورے سو کوئی نہ مقرر کیے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا مرآٹ کارانہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی ابواب الدعوات میں اور بعض کم درج حدیثوں میں ان ناموں کو گنتایا جھی ہے۔ لیکن محمد بنیان نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ ”یہ راویین ضعیف اور کمزور ہیں۔“ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا اول بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اسی لیے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء في دعاء النبي ﷺ امته الى التوحيد: ۷۳۷۵۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجمع بين السورتين في ركعة: ۷۷۴۔

❸ مسند احمد، ج ۳، ص ۱۵، ۲۲۔

❹ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب مقلب القلوب: ۷۳۹۲ و صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب اسماء الله تعالى وفصل من احصاها: ۶۸۰۹ و مسند احمد، ج ۲، ص ۲۵۸ و جامع ترمذی: ۳۵۰۶، نسائی: ۱۶۷۶۔

راویوں نے خود اپنی تلاش و تفصیل سے کیا ہے، اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسماے الہی ان ننانوے میں محدود ہے۔ بلکہ بڑے بڑے اسماء اور محدثین مثلاً: عبد العزیز بن سعیْد، ابو بکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی رض وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسماے الہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے رض اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعود رض اور حضرت عائشہ رض کی روایتوں سے جاؤ آغاز مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تبع سے علمانے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یادہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت ﷺ نے دعاوں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تجھیں اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علمانے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبوں سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عنود و رگز ریعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے، ہم ان کو صفات جمالی کہتے ہیں۔ تیسرا وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہ، بلندی، کمالات کی جامیعت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور حامد عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاء و جلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تنزیہ و مکال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفات جمالی: یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے:

اللّٰهُ بِيَ خَدَا كَانَمْ ہے جو قرآن پاک میں بطور خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں ”خَدَاعَ بِرَحْمَةِ“ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اخلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس جستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگردان ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنابری اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

الرَّحْمٌ: اللہ کے بعد یہ دوسر الفاظ ہے۔ جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم و اے کے ہیں۔

* تمہید ابی شکور سالمی الباب الخامس القول الثالث فی عدد الاسماء، ص: ۶۱ یہ ماتریدی کی مشہور متذکرات ہے۔

یہ گزر چکا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سیکھروں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ صفات کی معمولی ترکیب ہے۔ مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس مرکزی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمٰن دو اجنبی صفتیں اور دو بیگانہ ستیاں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دونام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مراد سمجھتی ہیں اور کہا گیا:

﴿قُلْ أَدْعُوا اللَّهَ أَوْ أَدْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيَّاً مَا تَدْعُ إِلَّا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾

(۱۱۰/ بنی اسرائیل)

”اللہ کہو یا رحمٰن کہو، جو چاہے کہو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔“

الرَّحِيمُ: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے۔ جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مریبانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ صفتیں ہیں۔ جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہو گا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی نہیں و صفتیں کا ظہور ہے۔ اس عالم اور اس عالم دونوں میں اس کی انہیں دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہو گا۔

الرَّبُّ: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطے سے لے کر آخوند میں تک ہر لمحہ اور ہر لمحہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمدار۔

اللَّطِيفُ: لطف والامہریان۔

الْعَفُوُ: معاف کرنے والا، در گزر کرنے والا۔

الْوَدُودُ: محبوب، محبت کرنے والا، بیار کرنے والا۔

السَّلَامُ: امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

الْمُحِبُّ: محبت والا، بیار والا، پاہنے والا۔

الْمُؤْمِنُ: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الشَّكُورُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

الْغُفُورُ وَالْغَفَارُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، در گزر کرنے والا۔

الْحَفِيظُ وَالْحَافِظُ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، نگہبانی کرنے والا، بچانے والا۔

الْوَهَابُ: دینے والا، عطا کرنے والا، بخششے والا۔

الرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ: روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بھی پہنچانے والا۔

الْوَلِیُّ: دوست، حمایتی، طرفدار۔

الرَّءُوفُ: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

الْمُقْسِطُ: انصاف والا، عادل۔

الْهَادِیُّ: راہ دکھلنے والا، رہنمایا۔

الْكَافِیُّ: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

الْمُجِیْبُ: قبول کرنے والا، دعاوں کا سننے والا۔

الْحَلِیْمُ: بربار، بندوں کی براکیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

الْتَّوَابُ وَقَابِلُ التَّوْبَ: توبہ قبول کرنے والا، گناہگار کے گناہوں سے درگز کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الْحَنَّانُ: مال کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

الْمَنَّانُ: احسان کرنے والا۔

الْنَّصِیرُ: مدد کرنے والا۔

ذُو الْطَّوْلِ: کرم والا۔

ذُو الْفَضْلِ: فضل والا۔

الْكَفِیْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الْوَرِکِیْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

الْمُقْیْتُ: روزی پہنچانے والا۔

الْمُغِیْتُ: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

الْمُجِیْرُ: پناہ دینے والا۔

الْمُغَنِّیُّ: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفاتِ جلالی:

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے:

الْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ: بادشاہ، فرمانروای۔

الْعَزِیْزُ: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

الْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

الْمُنْتَقِمُ :	سزادینے والا، برائیوں کی جزادینے والا۔
الْجَهَارُ :	جروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سرتاہی نہ کر سکے۔
الْمُهَمِّمُ :	سب پرشاہد اور گواہ اور دلیل۔
الْمُتَكَبِّرُ :	اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزادینے والا۔
شَدِيدُ الدِّعْقَابِ :	سخت سزا والا۔
شَدِيدُ الْبَطْشِ :	بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔ لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتیں کا ذکر آتا ہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتیں کا یہ مفہوم ہے کہ وہ نفعوں بالشادیک لا ایابی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے۔ بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جوش بہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے:

﴿أَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَّالِمٌ لِّلْعَبِيدِ﴾ (آل عمران: ۱۸۲)

”بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والانہیں۔“

اس لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِيزٌ (غالب) کے ساتھ حَكِيمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دو ذخیر کے بیان کے ساتھ جنت کا سامنہ بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿وَمَا مِنْ إِلٰهٖ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ ساتھ ہی کہا گیا ﴿رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ﴾ (۶۶-۶۵ / ۳۸) قوموں کی تباہی و بر بادی کا ذکر کیا گیا تو فرمادیا گیا:

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَبَادِ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۳۱)

”اوَّلَ اللّٰهُ بَنِدوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔“

اس کی صفت ﴿ذُو عَقَابٍ أَلِيمٍ﴾ دروناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے معا پہلے ﴿الْذُّو الْمَغْفِرَةَ﴾ (۴ / ختم السجدة: ۴۳) یعنی مخفیش والا بھی فرمادیا گیا۔ غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر کھلی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچے اس کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہوتا کہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نہیاں ہوں۔

صفاتِ کمالی: وہ اسماء و صفات جن سے اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر صرف میں اس کا کامل ہونا ظاہر

ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔ دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسراے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ اور پاکی سے۔

☆ صفاتِ وحدانیت: یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتاںی اور بے مشائی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

الْوَاحِدُ: ایک۔

الْأَحَدُ: ایک۔

الْوَتْرُ: طاق جس کا کوئی جزو نہیں۔

☆ صفاتِ وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازیلت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

الْمُوْجُودُ: وجود والا، ہست۔

الْحَيُّ: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو، جو ہمیشہ سے ہے۔

الْقَدِيمُ: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الْقَيُومُ: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الْبَاقِيُّ: ہمیشہ رہنے والا۔

الْدَّائِمُ: الْأَوَّلُ:

وہ پہلا جس سے پہلے کوئی نہیں۔

الْآخِرُ: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

الْمُقْدِمُ: جو سب کے آگے سے ہے۔

الْمُؤَخِّرُ: جو سب پیچھے رہ جائے۔

الظَّاهِرُ: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

الْبَاطِنُ: جو چھپا اور مخفی ہے۔ (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

☆ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں:

الْخَبِيرُ: خبر کرنے والا۔

الْعَلِيمُ: جاننے والا۔

عَلَامُ الْغَيُوبِ: جو باقیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

الْسَّمِيعُ: سننے والا۔

الْبَصِيرُ:	دیکھنے والا۔
الْمُتَكَلِّمُ:	بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کا ظاہر کرنے والا۔
الْوَاجِدُ:	پانے والا، جس کے علم کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔
الْشَّهِيدُ:	حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔
الْحَسِيبُ:	حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جانے والا۔
الْمُحْصِيُ:	گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی اعداد کا بھی جانے والا۔
الْمُدَبِّرُ:	تدیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔
الْحَكِيمُ:	حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔
الْمُرِيدُ:	ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔
الْفَرِيقُ:	نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔
☆ قدرت:	یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔
الْفَاتِحُ وَالْفَتَاحُ:	ہر مشکل کو خوشنے والا۔
الْقَدِيرُ وَالْقَادِرُ:	قادر، قدرت والا۔
الْمُقْتَدِرُ:	اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چوں و چڑائیں کر سکتا۔
الْقَوْىُ:	زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔
الْمُتَّقِينُ:	مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔
الْجَامِعُ:	جمع کرنے والا، متفرق اور پراگنہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔
الْبَاعِثُ:	اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یاد نیامیں ہر واقعہ اور ہر حد شکا حرک اول۔
مَالِكُ الْمُمْلِكُ:	سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔
الْبَدِيعُ:	خی نی چیزیں ایجاد کرنے والا۔
الْوَاسِعُ:	سامنے والا جو ہر چیز کو سامنے ہوئے ہے۔
الْمُحِيطُ:	جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی اس کے احاطے سے باہر نہیں۔
الْمُحْيٰ وَالْمُمِيتُ:	جلانے والا اور مارنے والا۔
الْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ:	سمٹنے والا اور پھیلانے والا۔
الْمُعَزُّ وَالْمُذَلُّ:	عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

الْخَافِضُ وَالرَّافِعُ : پہنچانے والا اور انپا کرنے والا۔
الْمُعْطِيُّ وَالْمَانِعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔
النَّافِعُ وَالضَّارُ : نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع و ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔
الْمُبْدِيُّ وَالْمُعِيدُ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہواں کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہوں کو پھر دو بارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتی ہے۔ جیسے **الضَّارُ** (نقصان پہنچانے والا) **الْمُذَلُّ** (ذلت دینے والا) **الْخَافِضُ** (پست کرنے والا) **الْمَانِعُ** (روکنے والا) وغیرہ ان کا تہما استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف **الضَّارُ**، **الْخَافِضُ**، **الْمَانِعُ** اور **الْمُذَلُّ** کہنا درست نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرا پیدا کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی **الضَّارُ** کے ساتھ **النَّافِعُ**، **الْخَافِضُ** کے ساتھ **الرَّافِعُ**، **الْمَانِعُ** کے ساتھ **الْمُعْطِيُّ** اور **الْمُذَلُّ** کے ساتھ **الْمُعِيدُ** یا کہا گیا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ تہما نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہو گا کہ اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے کہ اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذمیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبورہ مضطرب ہونا لازم آتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہیں ہوتا بلکہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچانا اور ذلت دے سکنے کے باوصاف عزت دینا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تشرییحہ: وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عجیب اور نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

الْفَغْنَىُ :	بے نیاز
الْعَلِىُّ :	مرتبہ والا
الْعَظِيمُ :	عظمت والا
الْكَبِيرُ :	بڑا
الْرَّفِيعُ :	بلند
الْجَلِيلُ :	بزرگ
الْحَقُّ :	سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سواب باطل ہیں۔
الْجَمِيلُ :	اچھا

الْعَدْلُ: عادل
الْكَرِيمُ: شریف سُوْحٌ
الْأَصَمَدُ: جو بزرگی کی ہر صفت میں کامل ہے۔ **الْرَّشِيدُ:** سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا
 ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دین محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامدا و اوصاف، اخلاقی انسانی کامیابی ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں کہ وہ بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیر اوصاف و مجامد انسان کے لیے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے مجامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے مجامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء و صفات کو مجامد و مجامن اور خوبیوں کا اختیاری معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ مجامد الہی گویا استاد اعلیٰ کی ولی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے، اس لیے انسان کو بھی اپنے اور ہر حرف کے لکھنے (محامد الہی کی نقل اتنا نے) میں ایک نظر اس استاد اذل کی ولی پر بھی ڈال لینی چاہیے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی و صلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم:

﴿إِنَّ جَائِلَ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (۲۰/ البقرة)

”آدم کا بیٹا میں میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔“

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و مجامد کا پرتو چنان زیادہ نہیاں ہوگا۔ اختیاری وہ اپنے اندر اس منصب کا اتحاقان زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نہیاں ہوگا۔ جب وہ سرتا پا خدا کی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا:

﴿صِفَةُ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنَ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (۲/ البقرة)

”خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے؟“

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ”خدائی رنگ“ سے مقصود خدا کا ”دین فطرت“ ہے۔

یہ حدیث اور گزر چکی ہے کہ ((إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ ادَمَ عَلَى صُورَتِهِ)) * ”خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ اور ساتھ ہی اس کی تشریع بھی گزری کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کا ملد کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی

* صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام: ۶۲۷۔

صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں انسانی حد تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق و صفات میں ملائے اعلیٰ سے تقبہ اور ہم شکل کا جو ہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ کا کہ ”تخلقو باخلاق اللہ۔“ ”خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔“

مطلوب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

((الْخَلْقُ خَلْقُ اللّٰهِ الْأَعْظَمِ)) ((الْخَلْقُ خَلْقُ اللّٰهِ الْأَعْظَمِ))

اللّٰہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اور بیان ہوئی ہیں۔ جملی، تنزیلی، کمالی اور جملی، صفات جملی جن میں کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، خالق تعالیٰ کے سوا جملوں کے ساتھ نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ ان کا انکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فرتوںی اور خاکساری، اسی لیے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیے آدمی جس نے فرتوںی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا، وہی لعنت کا مستحق ہے:

((أَلَّٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكُفَّارِ)) (٢٤/ البقرة)

”اس نے (آدم کے حجہ سے) ان کار کیا اور غرور کیا، اور کافروں میں سے ہو گیا۔“

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

((وَلَهُ الْكَنْيَاٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ)) (٤٥/ الجاثیة)

”اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔“

صحیح مسلم [✿] میں ابوسعید خدری اور ابو ہریرہ ^{رض} اور صحابوں سے روایت ہے کہ آپ ^{صلی اللہ علیہ وسلم} نے فرمایا کہ ”عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے، تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔“ درستی جگہ ہے کہ آپ ^{صلی اللہ علیہ وسلم} نے فرمایا کہ ”خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہ ہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔“ [✿]

((الْعَزِيزُ الْجَلَّـا وَالْمُتَكَبِّرُ)) (٥٩/ الحشر: ٢٣) اسی کی شان ہے، البتہ اللّٰہ تعالیٰ اپنی عزت جلال اور قوت و جروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوت حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر

[✿] کنز العمال، ج ۲، ص: ۴ بروایت عمار بن یاسر۔

[✿] کتاب البر والصلة، باب تحریم الكبر: ۶۶۸۰۔ [✿] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب بعض الاسماء الی اللہ تبارک و تعالیٰ: ۶۲۰۵ و مسلم، کتاب الادب، باب تحریم التسمی بملك الاملاک: ۵۶۱۰، ۵۶۱۱۔

نیاز اٹھا رہ بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں لمحہ نظر کی گئی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلَيْسُوْلُهُ وَلَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (المنافقون: ٨)

”اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔“

حاکم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اور دھناتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہو معزز بننا چاہتا ہے تو وہی شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا ”اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا ہے۔“ (٢٢/ الدخان: ٣٩) ”اور جوانانوں پر حرم کرتا ہے خدا اس پر حرم کرتا ہے۔“ کہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کو اتنا رنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔*

خدا کے صفات کمالی میں سے وحدانیت اور بقاء ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام خلوقات اور مکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفات تنزیہی، مثلاً: قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی خلوقات تمام تحریم ہیں ان کی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گناہ کاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔ صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر غنو و درگز رہے۔ عیسائیوں کی عام دعائیں ایک فقرہ ہے کہ ”خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضاووں کو معاف کرتے ہیں۔“ اسلام نے اس اللّٰہ تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان! تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔“* قرآن کہتا ہے کہ ”تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔“

﴿إِنْ تَبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفْوًا قَرِيرًا﴾

(النساء: ١٤٩)

”اگر تم کوئی سمجھی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔“

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ مگر اس منظر کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کا، رنگ متغیر تھا اداشنا سوں نے سب دریافت کیا۔ فرمایا: ”امام تک معاملہ پہنچنے سے

* کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۰۹؛ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، سورہ دخان، ج ۲، ص: ۴۵۱۔

** صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریر الظلم: ٦٥٧٨۔

پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور غفو در گزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور در گزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشش والا اور رحم کرنے والا ہے۔“

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرمایا ہے تھے کہ ”جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہو گا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔“ ایک صحابی نے عرض کی، یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا:

((اللہ عز و جل جمیل یحب الجمال))

”اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھا ای اور جمال کو پسند کرتا ہے۔“

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دہانا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ”خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔“ یہ روایت بھی ہے: ”خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، وہ تنی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستر ہے صفائی اور سترے پن کو پسند کرتا ہے۔“ ۹ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ”وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بد اخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔“ ۱۰ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓؑ کو نصیحت فرماتے ہیں: ”اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہربات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔“ ۱۱ ایک مرتبی آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ”لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔“ ۱۲ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔“ ۱۳

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والاتم پر رحم کرے گا۔“ ۱۴ رشتہ داری اور تراابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا

- ۱۰ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۳۸۲، کتاب الحدود۔ ۱۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریر الکبر و بیانہ: ۲۶۵؛ ترمذی، ابراب البر والصلة، باب ما جاء فی الکبر: ۱۹۹۔
- ۱۱ کنز العمال کتاب الزينة، ج ۳، ص: ۳۲۶، بحوالہ شعب الایمان یہیقی۔ ۱۲ کنز العمال کتاب الزينة، ج ۳، ص: ۳۲۶، بحوالہ کامل لابن عدعی۔ ۱۳ ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔
- ۱۲ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام: ۵۶۵۶؛ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الرفق: ۴۸۰۸؛ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب الرفق: ۳۶۸۹۔ ۱۳ صحیح مسلم، کتاب الزکوة، باب قبول الصدقۃ من الكسب الطیب: ۲۲۴۶؛ ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ: ۲۹۸۹۔
- ۱۴ ابو داود، کتاب الوقاۃ: ۱۴۱۶۔ ۱۵ ابو داود، کتاب الادب، باب فی المرحمة: ۴۹۴۱۔

گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرائیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”رحم کی جڑ حُن سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تھوڑے قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ جو تھوڑے کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاوں گا۔“ ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے: ”میں خدا ہوں، میں رحم ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحم) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاوں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔“ پھر فرمایا: ”جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔“ بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں: ”جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا نے رحم کے سو حصے کیے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے لیے اس خوف سے پاؤں اٹھائیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچ۔“

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنی تھیلی کے منہ بند کرو درستہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔“ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ”جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔“ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ”جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔“ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداء سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں۔ اسی لیے اس نے فرش باتوں کو حرام کیا ہے۔“

اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا ”کہ خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت بھی ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفاهو۔“ اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

﴿وَأَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ بِظُلْمٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (۱۸۲/آل عمران)

”اوْرَخَ الْبَنِيْوْنَ عَلَيْنِيْسَ كَرَتَا۔“

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله اللہ: ۵۹۸۹، ۵۹۸۸۔

۲ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في قطعية الرحم: ۱۹۰۷۔ ۳ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الولد: ۱۹۱۱۔ ۴ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷۔

۵ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب جعل الله الرحمة في مائة حزء: ۶۰۰۰۔ ۶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في السخاء: ۱۹۶۰۔ ۷ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ۶۵۷۸۔

۸ ابو داود، کتاب الادب باب في المعمونة للمسلم: ۴۹۴۶۔

۹ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الغيرة: ۵۲۲۰۔

۱۰ جامع ترمذی، ابواب الرضاع باب ما جاء في الغيرة: ۱۱۶۸۔

((یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلتہ بینکم محرما فلا
تظاموا))

”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔“
پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک و صاف رہنا چاہیے۔
آپ ﷺ نے فرمایا:

((انَّ اللَّهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ وَنَظِيفٌ يُحِبُّ النَّظِيفَةَ فَتَنْظِفُوا وَلَا تُشَبِّهُوا
الْيَهُودَ))

”خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک و صاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے،
تم پاک و صاف رہا کرو اور یہود یوں کی طرح گند نہ بنو۔“
یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تلااب تک ہر چیز آتا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلس ثوٹ گیا اور وہ باہل (مصر) ہندو ایران کے خدا اور ”ربکم الاعلیٰ“ ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، رائی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل و نصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اوپنے نیچے، بلند پست، شریف و ذلیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پر میشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ، اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی، جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبرا اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس اونچائی، نیچائی، بلندی و پستی اور شیب و فراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی

1: صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۲، مستند احمد، ج ۵، ص: ۱۶۰ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلمات: ۴۹۰۔

2: جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی النظافة: ۲۷۹۹۔

بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے تنازع تاریخ کے صفحوں میں ثابت ہیں اور بالآخر اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا۔ جو حقیقی توحید سے نا آشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساوات انسانی کے حقیقی جو ہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انہیا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تقاضات درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا۔ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے انتیازات خدا کے سامنے سرگوں ہو کر بھی وہ نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی انتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرا فگنہ ہیں، دولت و فقر، رنگ روپ اور نسل و قومیت کا کوئی انتیاز ان کو نہیں نہیں کرتا۔ اگر کوئی انتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَنْعَمُهُمْ﴾ (۴۹) الحجرات: (۱۳)

”تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔“

خدا کا ڈار اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قبار، جبار اور ہمیشہ شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیئت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کا نپتے رہنا چاہیے۔ اس کے گوشہ چشم میں لطف و عتایت کا گزر نہیں۔ محبت اور پیار کا نذر انہاں کے دربار میں قبول نہیں۔ شوہد اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور وہ اپنے بندوں سے اپنے لیے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اماماء اور صفات اور پرگزرنچے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ اس کے چندہ جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عالم کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم، رحمت اور ہمدرکی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے بحثیت میں دو دو جو ہات کے سبب مغالطہ ہوا:

- ① آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔
- ② دوسرا نہ ہبھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک ترا رہ دیا۔

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرك دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت، یہ دونوں

جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے چیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز و تخترا اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتناد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبے سے ہو سکتا ہے اس لیے خالق مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تھا خوف سے ہو سکتا ہے اور نہ تھا محبت سے انجام پاسکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امترانج اور اعتدال سے اور یہی نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلے میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام ترہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سرتاپا خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار ﷺ اور باب کا بدله پشت ہاپشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ ﷺ حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ ﷺ اس کے بر عکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی تو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہیں۔ بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔ ﷺ مگر ان دونوں مذہبوں کے چیزوں نے ان دو مقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطہ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو حضن جبار، تھار، رب الافواح اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسرائیل کا خداما تھا، نہ اس کو بجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد ﷺ کا باپ بھجتا ہے اور نہ تھا رحم و کرم اور محبت و شفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی۔ وہ نعمت اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ذرنا چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے:

﴿أَدْعُوكُمْ تَصْرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ وَلَا تُقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِنْلَاجَهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَبَعًا إِنَّ رَحْمَةَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾

(۵۵، ۵۶/ الاعراف)

”(لوگو)!! اپنے پروردگار کو گزر کر چکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل و کرم کی لوگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت ایچھے کام

۱ یہر میاہ ۱۴، ۳۲ وغیرہ۔ ۲ خروج ۲۰، ۵، ص: ۱۱۹ و ۳۴، ۷، ۳۴ واستثناء ۴، ۷، ۱۴۴۔

۳ استثناء ۴، ۶، ۲۸۵ ص: ۳۲، ۱۵، ۲۹۰ وغیرہ۔ ۴ خروج ۲۰، ۷، ۷، ۱۱۹ و ۳۴، وزبور

۵ ص: ۱۰۱، ۱۰۳، ۸، ۸، ۱۰۳ و ۱۵۰، وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔

۶ لوقا کی انجیل ۱۱، ۵، ص: ۷۷ اول پدرس ۷، اس: ۷۷ دوم تریثون ۷۔ ۷ افسیون ۵، ۵، ص: ۱۳۱، ۷۷ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔“
چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَرِّعُونَ فِي الْخَيْرِ وَيَذْهَبُونَ إِلَيْهَا رَغْبًا وَرَهْبَةً﴾ (۹۰/الانیاء: ۲۱)

”وہ نیک کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔“

اس سے زیادہ لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور حیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿وَخَيْرٌ الرَّاحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۶/بنت: ۱۱)

”اور حرم کرنے والے سے بن دیکھئے ڈرا۔“

﴿مَنْ خَيْرٌ الرَّاحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰/ق: ۳۳)

”اور جو حرم کرنے والے سے بن دیکھئے ڈرا۔“

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں:

﴿وَخَشَعَتِ الْأُصُواتُ لِلرَّاحْمَنِ﴾ (۲۰/ظہ: ۱۰۸)

”اور حرم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔“

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کہریائی کا جلوہ تھا۔ اس لیے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً: حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دوسرے وہ جو محبت الہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانہ عشق کی طرف بلا تے تھے۔ مثلاً: حضرت یحییٰ اور حضرت علیٰ علیہما السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی بھی آئی۔ جوان دونوں صفتوں کی بزرخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب و لحاظ دونوں کی جامع تھی۔ یعنی محمد رسول اللہ علیہ السلام۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الہی سے اشک بارہتی تھیں دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور حرم و کرم کے سرورد سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں مظراً آپ علیہ السلام کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لیے گھرے ہوتے۔ قرآن مجید کی بھی بھی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور حرم و بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ *

الغرض اسلام کا نصب اعین یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے

گرنے کا خطرہ ہے۔ خوف و خشیت اور حم و محبت کے شیعے کے شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ((الایمان بین الخوف والرجاء))؟ ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔“ کہ تھا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے نامیداً و محض رحم و کرم پر بھروسہ لوگوں کو خود سراور گستاخ بنادیتا ہے۔ جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور نہیں جیشیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جاسکتا ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متفاضل کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا:

﴿وَرَحْمَةً وَسِعَةً مُلْكٍ شَيْءٍ﴾ (۱۵۶/ الاعراف)

”اور میری رحمت ہر چیز کو سائے ہوئے ہے۔“

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن ﷺ نے ان الفاظ میں کی:

((رحمتی سبقت غضبی)) ﴿۱﴾

”میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔“

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزندِ الہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب تھے ریا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیز علیہ السلام کو فرزندِ الہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

﴿تَحْنُنُ أَبْنَاءَ اللَّهِ وَأَجْيَاؤَهُ﴾ (۱۸/ المائدۃ)

”هم خدا کے بیٹے اور چھپتے ہیں۔“

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿فَلَمَّا يَعْذِبُهُمْ يَذْنُوكُمْ بَلْ أَنْتُمْ يَكُشُّونِي كُلَّهُ مِنْ خَلْقِهِ﴾ (۱۸/ المائدۃ)

”اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلے تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، (اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔“

دوسری جگہ قرآن نے تھا یہودیوں کے جواب میں کہا:

﴿إِنَّمَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمُوا أَنَّمَا أَنْوَعَ اللَّهُ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَبَوَّأُوا الْمَوْتَ إِنْ

﴿كُلُّمَا صُدِّقُيْنَ﴾ (۶۲/ الجمعة)

* بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله: بل هو قرآن مجید: ۷۵۴۔

”اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں پچھے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چیزیت ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔“

اسلام رحمتِ الہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر براذری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد بنوی میں آ کر دعا کی کہ ”خدا یا مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا: ”خدا کی وسیع رحمت کو تم نے نگ کر دیا۔“ * ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدا یا مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بخشیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ”یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔“ *

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیمِ محمدی ﷺ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے ذرچکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا گیا کہ اسلام کا خدارحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معراہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتہوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و خلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان بآپ اور بینے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا برا بر جہ سمجھا۔ اس لیے اس تعلق کو ماں اور بینے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی ماتا کیں نہیں۔ جیسا کہ ہندوؤں کا عام نہیں تخلی ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شوکی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظریہ دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پراثر منظر اور ناقابل شکست پیان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و خلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شوکی اصطلاح سے ادا کیا گیا، ”سد اسہاگ“، ”فقر اس تخلی کی مضمونہ انگریز تصوری ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتہوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظی

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۱۱۰؛ ابو داود، کتاب الصلة، باب الدعاء

فی الصلة: ۸۸۲؛ مسند امام احمد، ج ۲، ص: ۱۷۰، ۱۷۱۔

* ابو داود، کتاب الادب، باب من لم يلت له غيبة: ۴۸۸۵؛ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۲۴۸۔

اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بینا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوچشا روئے کردی۔ سداہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور سائزیاں پہن لیں اور خدا نے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لیے اسلام نے جتو حید خالص کا مبلغ تھا۔ ان جسمانی اصطلاحات کی خنت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشائوں کو اس مجاز کے پرده میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے نافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے:

﴿فَإِذَا كُرِّبُوا اللَّهُ كَذَّ كُرِّبُهُمْ أَبَاءُهُمْ وَأَشَدَّ ذُكْرًا﴾ (۲/ البقرة: ۲۰۰)

”تم خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے بائیوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔“
دیکھو کہ باپ کی طرح محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیے نافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ ان کے تمام خیالات و تصویرات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ ملتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر مزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شابہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھنڈا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ”ان دیکھی ہستی“ کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخلی ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ تخلی بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گروپیں کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلندتر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخلی کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلا یشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخلی اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخلی کے معتقد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اس لیے نبوت محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتہوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک

قرار دیا، تاہم پوئنکہ روحانی حلقہ کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے۔ اس لیے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لے لیا اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کے استعمالات کی لفظی غلطی سے جو مگر ایسا پہلے پیش آچکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔ ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تجھیں اور نصب اعین کی بنابر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گوان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور عَلَم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں ابلیغ نفت کا یقیناً اختلاف ہے۔ مگر ایک گروہ کثیر کاریہ خیال ہے کہ یہ وَلَهُ سے نکلا ہے اور وَلَهُ کے اصل معنی عربی میں اس ”غمِ محبت“ اور ”تعلق خاطر“ کے ہیں جو مال کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق ”عشق و محبت“ کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگردان متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ (من موہن) یعنی ”لوں کا محبوب“ کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کو لئے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتیں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ”رحم والا“، ”مہربان“ لطف و کرم والا“ بسم اللہ الرحمن الرحیم“ (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربیٰ کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تجھیں کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسراعلم یہی لفظ رحمٰن ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہربان کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے:

﴿فُلِّ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ طَائِيْرًا مَا تَدْعُوْا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾

(۱۱۰/ بنی اسرائیل)

”اس کو“ محبوب“ (اللہ) کہو یا ”مہربان“ (رحمٰن) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اپنے نام اسی

کے ہیں۔“

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمن الرحيم کی صد بابوں کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقوں پر خدا کو اس رحمن کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسماء اللہ کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزرا چکا ہے۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصاً کرو تو معلوم ہو گا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورہ ذات البرونج میں) آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔ اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ "الروف" ہے "روف" کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے "رافت" کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام جنان "جن" سے مشتق ہے "جن" اور "خین" اس سوزدی اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خلق و خلائق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتقوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتقوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت اور جسمانیات کا تخلیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے۔ یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا، وہ سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے اس اور سلامتی ہے، پھر وہ مؤمن (امن دینے والا) ہے۔ وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ العفو (معاف کرنے والا) ہے۔ الوهاب (عطای کرنے والا) الحليم (بردبار) الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) التواب (بندوں کے حائل پر جو عن کرنے والا) البر (یاک اور جسم خیر) اور المقتط (منصف اور عادل ہے) اس میں ہر لفظ پر پھر کردار نہ کرو کہ اسلام کا تخلیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار، انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پر محبت اور سرتاپا مہر و کرم اساماء و صفات کی کی شرکت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ حق ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہندوکی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطف احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقہ اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو پہنانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو

اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپار و حانی معنوں کو مادی اور جسمی یقین کر لیتے ہیں اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو با تھہ سے چھوڑ دیتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متكلّم از ل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی الغریشوں سے پاک و مبرہ اہو، رو حانی حلقائی تحریر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائیٰ تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنابر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بروی احتیاط بر تی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، رو حانی عشق و محبت کے ان دلائل و نیز اور ولول انگیز حکایات سے معمور ہیں، با اس ہمسہ اسلام انسان کو یہا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے انہمار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تبیر نہیں، وہ خدا کو اب باپ کی بجائے ”رب“ کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

”آبُ اور زَرَبُ“ ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہو گا کہ عیسایوں اور یہودیوں کا تخلیل اسلام کے مطیع نظر سے کس درجہ پست ہے، آب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدلت کر، پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ پھیلنے کے ایک محدود عرصے تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود، اور فانی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریات زندگی، سماں حیات، نشوونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ مستقل، اور بے نیاز زندگی پر کرتا ہے، مگر زراغور کرو، کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی، بے نیاز اور مستغفی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محمد و داود خصوص الادوات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے اب تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فناؐ محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو، یا بصورت غذا، قطرہ آب ہو، یا قطرہ خون، مضخہ گوشت ہو یا مشت اشخوان، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر بچہ ہو یا جوان، او ہیز عمر ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغفی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوه ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخلیل پیدا ہوتا ہے،

اس سے لفظ ”رب“، یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو پہلا کر رکھا ہے۔

ان آئتوں اور حدیثوں کو دیکھو جوں سے یہ وشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازی وابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خجانہ آلسنت کی سرشاری کی یاد بیکے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلارہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت ”حُبُّ الْهٗ“ ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملًا فیض ہو جکی تھی، زبانِ الہی نے شہادت دی:

﴿وَالَّذِينَ أَمْنَوْا أَشَدُ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ (۱۶۵/ البقرة)

”جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔“

اس نے محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان و مال، خاندان سب قربان اور شمار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ كَانَ أَبَاكُمْ وَأَبْنَاكُمْ وَأَخْوَانَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَعَشِيرَتَكُمْ وَأَمْوَالُ إِقْرَارٍ قَوْمُهَا وَسِيَارَةُ
عَنْهُنَّ كَسَادَهَا وَمَسِكُنُ تَرْضُونَهَا أَحَبَّ إِلَيْنَاهُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجَهَادٍ فِي سَيِّلِهِ
فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ (۲۴/ التوبہ)

”اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مند اپڑ جانے کا تم کو اندر یہ شہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا پناہیصلہ لے آئے۔“

ایمان کے بعد بھی اگر نہ شہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادہ حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنادیا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَوْا مَنْ يَرِتَكَ مُسْكُنٌ عَنْ دِينِهِ فَسُوقُ يَأْتِيَ اللَّهُ بِقُوَّةٍ يُجْهِمُ وَيُحْبِّلُهُ﴾

(۵/ المائدۃ)

”مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پرانیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔“

حضرت ﷺ نے کہا: ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔“ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے۔ مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی ترب پ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمہ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں بھروسہ جدائی کے آنسو ہیں، تو

کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوے دار تو بہترے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں، اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

﴿إِنَّكُنُمْ تُجِيئُونَ اللَّهَ فَأَتَيْتُمْ يُحِبِّيْكُمُ اللَّهُ﴾ (۳۱/آل عمران)

”اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔“

محبت کیونکر حاصل ہو، وہی محمدی نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾ (۶۷)

(مریم: ۹۶)

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے رحمت والا خدا، ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔“

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دوستائے گئے ہیں ایمان اور عمل صالح، یعنی نیک کام۔

چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۱۲/المائدہ)

”خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ﴾ (۲۲/البقرة)

”خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (۳/آل عمران)

”خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۵/المائدہ: ۴۲-۴۹) (الحجرات: ۹)

”خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (۹/التوبہ: ۴)

”خدا پر ہیز گاروں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ﴾ (۶۱/الصف: ۴)

”خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (۳/آل عمران: ۱۴۶)

”اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿وَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُطَّهِرِينَ﴾ (٩/١٠٨) التوبۃ:

”او رخدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔“

مند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ تمین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تمین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے، جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان کو جو اپنے پڑوئی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تمین ہیں۔ اترانے والا مغرب، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی فتیمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔“

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کائناتا سا چھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دھشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کائے ہیں جو عاجز و درمانہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چھتے رہے ہیں، لیکن جو محظوظ حقیقی کے طلب گار اور اس کے وال و شید ایس ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا جہن: ار ان کا نتوں سے پاک و صاف ہو گا:

﴿الَّاَنَّ اُولَيَاَ اللَّهِ لَاَخُوفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْذَفُونَ﴾ (٦٢/ یونس)

”ہاں خدا کے دستوں کو نہ کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمکھیں ہوں گے۔“

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگز اور عنفو بخشش پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا نام ”رحم“ اور ”رحمت“ ہے اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمٰن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لیے اس کی رحمت سے نا امیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ جرم سے مجرم اور گناہگار سے گناہگار کو وہ نواز نے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے۔ گناہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجا ہے:

﴿فُلِّيَعَاوِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْطُطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَعْفُوُ

الَّذِنُوْبَ حَيْيَاً اِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّّحِيمُ﴾ (٣٩/ الزمر)

”اے پیغمبر امیرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے کہ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔“

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

۱ مسند احمد، ج ۵، ص ۱۷۶؛ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنۃ:- ۲۵۶۸

﴿فَلَا تُكُنْ قِنْ أَقْتَطِيْلِيْنَ﴾ (١٥ / الحجر: ٥٥) ”نامیدوں میں سے نہ ہو۔“

خلیل اللہ اس رمز سے نا آشناز تھے کہ مرتبہ خلت، محبت سے مافق ہے، جواب دیا:

﴿وَمَنْ يَقْتَطِعْ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الصَّالِحُوْنَ﴾ (١٥ / الحجر: ٥٦)

”اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔“

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اتفاق سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، میں جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو مراد سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر غذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیکاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ نعمت ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے۔ رحمان و رحیم بھی ہے، رواف و عفو ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود، خود عائد کر لی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

﴿كَتَبَ رَبُّكُلُّ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (٦ / الانعام: ٥٤)

”اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔“

قصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ کار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو

کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے:

﴿وَإِذَا جَاءُكَ الَّذِيْنَ يُوْمِنُوْنَ بِأَيْمَنَا فَقْلُ سَلَمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُلُّ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾

﴿أَنَّهُمْ مِنْ أَهْلِ الْمُؤْمِنَوْمُ إِيجَاهَ الَّهِ ثُمَّ تَابُ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَآتَهُمْ غُفُورَ رَحِيمٌ﴾ (٦ / الانعام: ٥٤)

”اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آئیوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ، کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہو نالازم کر لیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنئے، تو بے شک وہ بخشنے والا اور حرم کرنے والا ہے۔“

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایہ رحمت سے محروم نہیں:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلُّ شَيْءٍ﴾ (٧ / الاعرف: ١٥٦)

”اوہ میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔“

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دستِ خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔“^۱ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ

^۱ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی قوله: (وهو الذي يبدء الخلق: ٣١٩٤)، صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعة رحمة الله: ٦٩٧١؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٣۔

نے فرمایا: ”کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔“ ❶ یہ اسلام کے تخلیل کی صحیح تعبیر ہے بارگاہ احادیث کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گناہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشار ہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروانیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھے سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروانیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں، ❷ کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کی اور قاصد کی زبان سے بھی ہی ہے؟

حضرت ابوالیوب الانصاری رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشن۔“ ❸ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گناہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکو کاروں کو تو سب ذہونڈتے ہیں، مگر گناہگاروں کو صرف وہی ذہونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور محروم و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قربات داروں اور اولادوں میں میں ملاپ اور سرم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شان دار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاید حقیقی کے سرما یہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔“ ❹ اس لطف و کرم اور محروم و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سائی ہیں اور کس نے گناہ گار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے نگک آ کر کہا، یا اللہ! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ رحمۃ للعلامین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا: ”اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔“ ❺ تم نے دیکھا کہ اسلام نے گناہگاروں کے لیے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

❶ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمة الله: ۶۹۷۹؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۲؛ دیگر کتب احادیث (صحیح) ❷ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۰۱۔ ❸ مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۱۴۔

❹ بخاری، کتاب الادب، باب جعل الله الرحمة في مائة جزء: ۶۰۰۰۔

❺ بخاری، کتاب الحدود، باب ما يكره من لعن شارب الخمر: ۶۷۸۰۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی نا آشنا تھے۔ کس طرح آشناے حقیقت کر دیا، اور اس ذات الہی کے ساتھ اپنی واہستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بالآخر کو دیکھوٹھیک دو پھر کو عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھران کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدا نے واحد سے اخraf کے لیے ان کو جبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اخبار ہے ہیں مگر زبان پر صرف احاددوہی ایک وہی ایک کا ترانہ ہے۔ ﴿ مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابو زعفرانی ﷺ یہی جان کر بھی صحیح مکہ میں جوش وحدت سے سرشار ہو کر کلمہ تو حید کا با آواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ آ کر چھڑادیتے ہیں، دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر وہی سرشاری ہوتی ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ ﴾ ۲

ایک صحابی جورات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پھرہ دینے پر متعین تھے۔ وہ اپنی نیند تالئے کے لیے خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تمیں وفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستورِ حنماز ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ ”ج سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیے بغیر چھوڑ دوں۔“ ﴾ ۳

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صفاتی و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میتستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لیے خدا نے بھارت وی کان کا محبوب خدا اور وہ خود خدا کے محبوب تھے۔ یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اسکا جنازہ اٹھا تو فرمایا: ”اس کے ساتھ زمری کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ زمری کی ہے، کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔“ قبر کھودی جانے لگی۔ فرمایا: ”اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے اس کے ساتھ کشادگی فرمائی۔“ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا: ”ہاں اس کو خدا اور رسول سے پیار تھا۔“ ﴾ ۴

ایک دفعہ آپ نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنایا کہ بھیجا وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل حوال اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس ﷺ میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا: ”ان سے پوچھو کوہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم و اے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔ فرمایا: ”ان کو حاکم، ۱/۱۵۶۔“ ﴾ ۵ این ماجہ، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی حفر القبر: ۱۵۵۹۔

﴿ سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین، ج ۱، ص: ۱۹۵: اسد الغابة، ج ۱، ص: ۲۰۶، مصر۔

﴿ طبقات ابن سعد جزء رابع، ص: ۱۶۵: تذکرہ ابی ذر غفاری و صحیح بخاری، قصہ اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔

﴿ سنن ابی داؤد، کتاب الطهارة، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸؛ احمد: ۳۴۴/۳؛ صحیح ابن خزیم: ۳۶؛ حاکم، ۱/۱۵۶۔﴾ ۶ این ماجہ، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی حفر القبر: ۱۵۵۹۔

بشارت دو کہ وہ حرم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔“ ۲ یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نبھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ تعالیٰ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ”تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟“ نادم ہو کر شکستہ ولی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ تعالیٰ میرے پاس نہ تو نمازوں کا نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا بڑا ذخیرہ ہے جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور اس فرمایا: ”تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ در ہے گا۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بشارت کو ان کراس دن بڑی خوشی سنائی۔ ۳

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل علیہ السلام بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر لاعزیزی اور حسن قبول بخشاتا ہے۔“ ۴

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعت کو سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کام بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، وہ اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“ ۵ یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدی ﷺ کے سوا کہیں اور نہیں بُشَارَةُ

امام بزار نے منند میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں۔ لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بندی پر انہیا اور شہدا بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے اور اچھی باتیں بتاتے اور بری باقتوں سے روکتے ہیں۔“ ۶ یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کا پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپ میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک

مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین باب فضل قراءۃ قل هو الله الحمد: ۱۸۹۰ یہ واقع بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الجمع بین السورتين فی رکعة: ۷۷۴ میں دوسری طرح مردی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اُنگی دوسرے ہیں۔

مسلم، کتاب البر والصلة، باب المرء مع من احب: ۶۷۱۶؛ بخاری، کتاب الادب، باب ماجاء في قول الرجل ويلك: ۶۱۶۷۔

مسلم، کتاب البر والصلة، باب اذا احب الله عبدا: ۶۷۰۵ یہ واقع بخاری، کتاب الرفق بباب التواضع: ۶۵۰۲ اس کے ہم مذکور دشیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، وکیوں مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الحب فی الله، فصل ثانی: ۵۰۱۲؛ شرح السنۃ: ۳۴۶۴۔

دوسرے کے لیے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔”¹

یہ محبتِ الہی کی نیرگنجیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو۔”² یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں شفیع بر اسلام کا لقب حسیب خدا ہے، دیکھو کہ حسیب و محبوب میں خلت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاوں میں اور خلوت و تہائی کی روحاںی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈھتے اور کیا مانگتے تھے۔ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے بحث میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاوں میں محبتِ الہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں یقین تھیں۔ دعا فرماتے تھے: ”خداوند!

((اسئل حبک و حب من یحبک و حب عمل یقرب الى حبک))³

”میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کا ممکنہ جو تیری محبت سے قریب کر دے۔“

((اللَّهُمَّ اجْعِلْ حَبَكَ احْبَابَ الْيَٰٓ منْ نَفْسِي وَاهْلِي وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ))⁴

”الہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بناؤ۔“

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دلوتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی۔ وہ صرف محبتِ الہی کا زلال خالص تھا جو اس خنکی کو تکسیں دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الہی (معجم غایلہ)⁵ کا قول ہے کہ ”انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا، پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا حضور ﷺ دعا فرماتے ہیں:

((اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي حَبَكَ وَ حَبَ منْ يَنْفَعُنِي فِي حَبَكِ))⁶

”خداوند! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔“

¹ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۱۶۸، ۱۶۹۔

² ترمذی، ابواب المناقب، باب فی مناقب اہل بیت النبی ﷺ: ۳۷۸۹۔

³ ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۴۹۰؛ مستدرک حاکم، ۱/۵۲۷۔ ⁴ ایضاً۔

⁵ ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۴۹۱۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرتا ہے۔ مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے؟ صحیح میں میں ہے:

((من کان اللہ و رسوله احب الیہ مما سواہما)) ﴿۱﴾

”یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام مساوی کی محبتیں بیچ ہو جائیں۔“

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح وہ اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقہ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے اس لیے ان مذاہب کے بہت سے پیرویکریت ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبت اللہ کے مقدس جذبات سے محروم ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گز رچکا ہے کہ یہ دعویٰ سرتاپے بنیاد ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوی معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پہلے پیش کی جا چکی ہے:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرُكُمْ أَبَأْكُمْ أَوْ أَشَدُ ذِكْرًا﴾ (۲۰۰: البقرة)

”تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے بیوپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔“

لیکن احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے۔ جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنے بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگائیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ”کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دکتی آگ میں ڈال دے۔“ لوگوں نے عرض کی، ہرگز نہیں۔ فرمایا:

”تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔“ ﴿۲﴾

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لارہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا: ”ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔“ بولی، تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سراٹھا کر فرمایا: ”خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دوکھتا ہے۔“ ﴿۳﴾

﴿۱﴾ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من اتصف بہن و جد حلاوة الایمان: ۱۶۵، ۱۶۶؛ بخاری،

کتاب الایمان، باب حلاوة الایمان: ۱۶۔ ﴿۲﴾ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۹۔

﴿۳﴾ ابن ماجہ، ابواب الزهد، باب ما یرجی من رحمة الله: ۴۲۹۷۔

آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرمائیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے پاندھ کرتا تھا ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں، کہ ”یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے اٹھا کر کپڑے میں پلیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آکر میرے ہاتھ پر بچوں پر گرد پڑی“ ارشاد ہوا: ”کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے، اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ معبوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بد رجہ زیادہ ہے۔“ *

ایک صاحب ایک چھوٹے بچے کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا: ”کیا تم کو اس بچے سے محبت ہے؟“ انہوں نے کہا، ہاں، فرمایا: ”تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچے سے ہے، وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا حرج کرنے والے ہے۔“ *

جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، اور مستورِ ازال کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، انھوں کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جان ثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃِ لب مبارک ہلتے ہیں تو یہ آواز آتی ہے۔ ”لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنا لیا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنا لیا تھا۔“ * یہ توقفات سے پہلے کا اعلان تھا، میں حالتِ نزع میں زبان مبارک پر یہ لکھتھا: ”خداؤند! باہترین رفیق۔“ *

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحمتی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دشیری اور اپنے گناہگار بندوں کے ساتھ اس کی شان بخشش کا ترانہ خود مدرسون اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف یہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی لوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیامِ رباني ہم کو سنایا:

”میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوک تھا، لیکن

ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الامار من المکفرة للذنب: ۳۰۸۹۔ * ادب المفرد امام بخاری، باب رحمة العيال: ۳۷۷۔

صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهى عن بناء المساجد على القبور: ۱۱۸۸۔

* صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب آخر ما تكلم به النبي ﷺ: ۴۴۶۳۔

جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاوں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاس تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاوں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک نگاہ تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو، میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں اور نہ مجھے لفظ پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیز گار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرا اضافہ نہ ہو گا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گناہگاروں کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرا کمی نہ ہو گی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہو گی، لیکن اتنی جتنا ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکالی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا، تو جس کو بھلانی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ اپنے ہی کو ملامت کرے۔“

محبت کا یہ پُر کیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سن، یہ تسلی و تشغیل کا پیام انہیں کے مبارک لبou سے ادا ہوا، یہ عفو و کرم کے بحر نیکرائیں کا ساحل امید انہیں کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گناہگاروں کو ”میرے بندو“ کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میر آئی۔ (تفہیم)

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢؛ ترمذی ابواب الزهد: ٤٩٥؛ مسند احمد بن حنبل، ج ٥، ص ١٦٠ و ١٧٧؛ ادب المفرد امام بخاری، باب الظلم: ٤٩٠؛ میں نے صحیح مسلم کی روایت مانے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھادیے ہیں، اس کے بعض بعض بکثرے ائمیں میں کہی ملتے ہیں، (دیکھو متى: ٣٥٦٢٥؛ ٢٨، ٣٧) مگر دونوں کے ملائے سے ناقص و کامل کا فرق نہیاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہوتا جائے۔

فرشتوں پر ایمان

﴿وَمَلِكِ الْجَنِّ﴾

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رسیں کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور ”پیام رسان“ کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و عمل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انہیں اور اس کے کل پرزاں کو حرکت دینے والی تو تیس ہیں۔ جو خدا کے مقرہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار حکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرموجا وزہبیں کرتے گویا، ان کی ملقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے، وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انہیا پر اپنے جواہکام اتنا رتا ہے، یا ان سے اہم کلام ہوتا ہے، وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابی مذهب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں۔ یونانی، مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام ”عقلی عشرہ“ (دوس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوں تسلیم کیے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردة کا پہنچ لگاتا ہے، جن میں سے سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے، جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ”امشا پنڈ“ ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی ان کو ”بیتم“ کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل دروح القدس وغیرہ سے ان میں سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، جامل عرب ان کو خدا کی ہستیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہر حال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ہیں اور جس سے مراد وہ روحانی و سماوی ہیں جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس

کے حکم سے عمل پیرا اور کار فرما ہیں۔

نہ اہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی، وہ کبھی مخلوق بھی کبھی جاتی تھیں اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ پر بھی بلند کردی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی بھی صورت تھی، پارسیوں میں امشاپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خدا امشاپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ مقابل پر پشت کبھی جاتی تھیں، ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاپند (۲) تھے اور ان کے تحت میں ۳۲ قائل تھے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو مقابل خداوں کے قائل تھے، اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور بے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے برادر است نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور بدیوں کو دنیا میں خلق کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء کے حاکم سمجھے جاتے تھے اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور شکروں کے پروں کو لے کر باہم نبرد آزمارہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاپند یا نفرشتمہ کے ساتھ ایک یہ زیارتی مادہ فرشتمہ بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی ہوتی تھی، ہندوؤں میں نزدیکیوں اور ماہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نزد مادہ ہستیوں میں کسی نزکوکی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوڑہ ہو سکتا تھا، یہ دیویوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیم اور شاواصفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتمہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہ کر خطاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتمہ، (تکوین ۱۶، ۲۲، ۲۴، ۱۸) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے، (تکوین ۲-۲)، عیسیٰ یوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر مشیث کا رکن ہے۔

صایوں میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پر پشت ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقلی اول اور عقول علی عشرہ تمام عالم کے خالق و کار فرماد مریع کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے، ان کی پر پشت و عبادات قطعاً ناجائز کی گئی، نزد مادہ کی مادی جنسیت سے پاک یہے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تنخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خداۓ تعالیٰ کے سامنے ایک سر پا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا شب و روز کام صرف آقا کا حکم بجا

لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ تنکی و بدی کی دو تسمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و تنظیم قرار دیے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں، جن کا کام خدا کی حمد و شنا، اطاعت و فرمانبرداری ہے اور خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے اس کارخانے کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لیے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح، ”خداوند“ نہیں مقرر کیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو ”قابل پرستش“ کے لقب سے ملقب کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیوار دیوتا اور دیوی کہا، بلکہ صرف ”ملک، اور ”رسول“ کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، فاصلد، پیغام رسان اور اپنی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لاٹنیں کہ آدم ان کو بجھہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا مسجد بنے اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق تھبہ ریا گیا، خدا کی جس تسبیح و تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جو ہر طبیعت انہوں نے پیچانا تو یہ تسلیم کرتا پڑا:

﴿سُبْعَنْكَ لَأَعْلَمُ لَنَا إِلَّا مَا عَلِمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

(۲) البقرة: ۳۲

”تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جانے والا اور حکمت والا ہے۔“

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرا مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیتا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق و بندہ اور عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الہی میں اس کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و عمل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کار فرمان نظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب و عمل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً: آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے بجھہ میں گر پڑتے ہیں، مادہ پرست گواپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اسی آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے،

یہ لوگ اس آگ کے فرمانروائے سامنے جھک جاتے ہیں، اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض و سماء کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے، جوان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الہی کو دنیا سے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب و عمل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں اور جن کو بت پرست، دیوتاؤں کا کر شہ سمجھتے ہیں، ان کو فرشتے احکام الہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں اور مرضی الہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلیٰ حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تنزیب، عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی روکرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلیٰ نکتہ پردازی سے دوسرے عقلیٰ مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی کارگر ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب و عمل کا مسئلہ عقولاً میں ہیشائختیات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمّد آج بھی اسی طرح لا خیل ہے، جس طرح پہلے دن تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجزیوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکماءٰ ملديں کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے، تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جاسکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی عمل و اسباب کا فرمایا ہیں، اسی طرح ان سے بالآخر روحانی عمل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کا فرمایا ہیں، ان دونوں قسم کے تفاق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی عمل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام ”بخت واتفاق“ رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہٰ عمل و اسباب کو ماننے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں، رہ جاتا۔ یہی روحانی عمل و اسباب ہیں جن کا سرنشیت اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو پردازی کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متكلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و عمل کے ”قوائے طبعی“ سے کرتے ہیں اور ہم ان کے ”قوائے روحانی“ سے۔ اس تقریر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں اور نہ یہ مفہوم ہے کہ خود اشیاء اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص و طبائع اور مادہ کے اجزاء عنصری کے اندر باطیع کوئی اصول و دلیلت نہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور

اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو نہیں اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔ سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار استی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات، اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک گرگ دریشہ پر حکمران اور مسلط ہے، باہیں ہم وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابر و بادتے لے کر دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند تک پر ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیاء سے خدا کے اصول مقررہ کے اندر یکساں افعال و حرکات کا صدور کرتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیاء کے مقررہ خواص و طبائع ہی کے سہارے کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الفرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفس و اسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفس مجردة واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے، کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر زاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالی اختیاری کی ذمہ داری، باز پس اور موآخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصيان کر کے عتاب کا سُختن ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردة یعنی یہ ملائکہ، ذاتی ارادہ اور اختیار سے تم اتر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصيان، تمرد، سرکشی اور حکمِ الہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات و خصائص میں یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

① اب ہم کو تعلیماتِ نبوی ﷺ یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہیے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسائی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہوتا، ان دو آئوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿اللَّهُ يَضْطَقِفُ مِنَ الْمَلَكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَرْجُونَ﴾

(٧٦-٧٥) / الحج (٢٢) ﴿أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلَقُهُمْ طَوَّلَ اللَّهُ تُرْجِعَ الْأُمُورُ﴾

”خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رسال اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سنبھلنا والا اور دیکھنے والا ہے اور ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔“

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور و انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

«الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمُلْكَةِ رُسُلًا أُولَئِكَ أَجْيَاهُ مُقْنَى وَلَكَ وَرِيعَةً طَبَيْرِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ مَا يَعْتَمِدُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُؤْمِنٌ لَهَا وَمَا يَمْسِكُ لَهَا مُرْسِلٌ لَهَا مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ»

(٣٥/فاطمٰ: ۱، ۲)

”حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہریں بازوؤں والے پیام رسال بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھادے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لیے رحمت کھو ل تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چیزوں نے والا نہیں اور وہ غالباً دو اتنے ہے۔“

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ یہ ملائکہ سفارت اور درمیانی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوہیت کا کوئی شانہ بھی ہے، یادہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی مانگنی چاہیے۔

② ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورہ انفال میں یہے:

﴿إِذْ يُوحَىٰ رَسُوكَ إِلَيْكَ أَنِّي مَعَكُمْ فَتَبَثُّوا الَّذِينَ اصْنَوُا طِّهْرًا﴾ (الأنفال: ١٢)

”(یاد کر) جب تیراپ ورد گار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم موننوں کو ثابت قدم رکھو۔“

(٩٧) **﴿وَتَنْزَلُ الْمَلَكَةُ وَالرُّوحُ مِنْ أَذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ﴾** (القدر: ٤)

”اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نجی اترتے ہیں۔“

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

﴿تَعْرِجُ الْمَلَكَةُ وَالرُّوحُ عَلَيْهِ﴾ (٤) / المعارج: ٧٠

”فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔“

موت کے وقت روح کا قبض کرنا، اُپنی سے متعلق ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفَّكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُظِّلَّ إِلَيْكُمْ﴾ (١١/السجدۃ: ۳۲)

”کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جنم پر مقرر ہے، وہ تم پر موت طاری کرے گا۔“

﴿وَلَوْ تَرَى إِذَا الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلِكَةُ بِالسُّطُّوَّا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمْ﴾

(٦/الانعام: ٩٣)

”اور اگر دیکھو تم جب گناہ گار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنے جانوں کو۔“

﴿وَلَوْ تَرَى إِذَا يَتَوَفَّقُ الَّذِينَ لَكُفُّرُوا الْمَلِكَةُ﴾ (٨/الانفال: ٥٠)

”اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔“

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں، ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر انہیں روحاںی علل و اسباب کی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک عمل و سبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موائع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توازن اور موائع کا انسداد تدبیر ہے، جو حکمِ الہی ان ملائکہ کے سپرد ہے، اسی لیے بھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، ﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾ ”وہ کام کی تدبیر کرتا ہے۔“ اور بھی اس کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے:

﴿وَالثَّرْعَةُ عَرَقَةٌ وَالثَّنِيَطُ نَشَّاةٌ وَالسِّيَحَتِ سَبَّاً فَالشِّقَقُ سَبَقاً فَالْمَدَبَّرَاتُ أَمْرَاءٌ﴾ (٧٩/النازعات: ٥-١)

”ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے، (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب علل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی۔“

③ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی غیر ہیں:

﴿أُو يُبَيْسَلْ رَسُولًا فَيُؤْتَى بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ (٤٢/الشوری: ٥١)

”یاخدا آدمی سے اس طرح بتائیں کرتا ہے، کہما پنا ایک سفیر بھیجنتا ہے، تو وہ (اس خدا کی اجازت

*) صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ: ۲۰۸ میں ہے کہ حرم نبوی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو پچھلی نسبت قضاۓ الہی کو تحریر کرتا ہے۔

سے جو) وہ (خدا) چاہتا ہے، وہی کرتا ہے۔“
دوسرا جگہ ہے:

»يَعْلَمُ الْمَلِكَةُ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادَةٍ« (۱۶ / النحل: ۲)
”خداروح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتنا تا ہے۔“
خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

»فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ يَأْذُنُ اللَّهُ« (۲ / البقرة: ۹۷)
”بس اس (جبریل فرشتہ) نے اس قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتا را۔“
یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں: ④

»وَلَقَدْ جَاءَتُ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْمُشْرِكِيْ قَالُوا سَلِّمَا« (۱۱ / هود: ۶۹)
”ہمارے سفیر ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر اترے۔“
اسی طرح حضرت زکریا اور مريم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی:

»إِنَّمَا أَنْتَ رَسُولٌ لِّلَّهِ لَا يَكُونُ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا« (۱۹ / مریم: ۱۹)
”میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔“
حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کی قوم کی بر بادی کے لیے جاتے ہیں۔

»قَالُوا يُلُوتُ إِنَّا رَسُولٌ لِّلَّهِ« (۱۱ / هود: ۸۱)

”انہوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔“

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم بر باد ہو جاتی ہے، یہ کام اگر چہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس فعل کو خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے، کہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے مجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا:

»فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَّهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً فِيْ مِنْ سِجِيلٌ لَّهُ مَنْضُودٌ« (۱۱ / هود: ۸۲)

”جب ہمارا حکم آیا، تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہتہ پتھروں کی بارش کی۔“

⑤ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

»وَإِنَّ عَنِّيْكُمْ لَحْفِظِيْنَ لَكَرَامًا كَاتِبِيْنَ لَيَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ« (۱۰ / الانفطار: ۸۲)

”بے شک تم پر نگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔“

﴿مَا يَلْكُفُهُ مِنْ قُوَّتِ الْأَلْدِيْهِ رَقِيبٌ عَنِيْدٌ﴾ (۱۸: ق/۵۰)

”کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔“

﴿سَوَاء٤٠ قِنْتَمُ مَنْ أَسْرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفِيٌ إِلَيْنَا وَسَارِبٌ بِالشَّهَارِ لَهُ مُعَقِّبٌ قَمْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمَنْ حَلَفَهُ يَحْفَظُونَهُ مِنْ آمِرِ اللَّهِ﴾ (۱۲/ الرعد: ۱۱، ۱۰)

”تم میں سے کوئی بات چھپا کر کے، یا زور سے کے، یادہ رات میں چھپے، یادن کو کرے، خدا کے حکم سے اس کی کتابت کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچے سے، خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔“

﴿وَيُؤْسِلُ عَلَيْنَمْ حَفَاظَةٌ حَلَّى إِذَا جَاءَهُ أَحَدُكُمُ الْمُوْتُ تَوْقِيْتُهُ رُسْلُنَا وَهُمْ لَا يُغَرِّطُونَ﴾ (۶/ الانعام: ۶۱)

”اور وہ خدام تم پر نگران بھیجا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کوموت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کم کی نہیں کرتے۔“

⑥ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطے ہیں:

﴿لَا يَعْلَمُهُمْ الْفَزَعُ الْكَبِيرُ وَتَشَكَّلُهُمُ الْمَلِيْكُهُ هُنَّ يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (۲۱/ الانیاء: ۱۰۳)

”نیکو کاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قيامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے، کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔“

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا رَبِّنَا اللَّهَ ثُمَّ أُسْتَقْامُوا تَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلِيْكُهُ أَلَا تَخَافُوا وَلَا تَحْزُنُوا وَآبِيْرُوا بِالْجِنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ تَحْنُنُ أَوْلِيَأَكُلُمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (۴۱/ فصلت: ۳۰، ۳۱)

”جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نذر اور نغم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم یہی جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔“

﴿هُوَ الَّذِي يُصْلِي عَلَيْكُمْ وَمَلِيْكَتَهُ﴾ (۴۲/ الاحزاب: ۳۳)

”وہی خدام تم پر رحمت بھیجا ہے اور اس کے فرشتے۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلِيْكَتَهُ يَصْلُوْنَ عَلَى الْكَوْيِطِ﴾ (۵۶/ الاحزاب: ۳۲)

”اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت صحیح ہے۔“

﴿وَيَسْعِفُونَ لَهُنَّ فِي الْأَرْضِ طَ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۵)

”اور جو زمین میں ہیں، ان کے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا ملتے ہیں۔“

اسی طرح وہ بدقاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

﴿أُولَئِكَ جَزَاؤهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلِكَةِ وَالثَّالِثَسْ أَجْمَعِينَ ط﴾

(آل عمران: ۸۷)

”ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔“

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَا أُنْوَاهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلِكَةِ وَالثَّالِثَسْ أَجْمَعِينَ ط﴾

(۱۶۱/ البقرة: ۲)

”جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔“

⑦ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

﴿وَسَيِّقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمْ زَمَّاطٍ حَتَّى إِذَا جَاءُوهُمْ فُقِعْتُ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

﴿خَزَّنَتْهَا أَلْمَى يَأْتِمُرُ سُلْقَنُكُمْ﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۱)

”اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک

کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے

چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔“

﴿وَسَيِّقَ الَّذِينَ أَشْعَارَبَهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زَمَّاطٍ حَتَّى إِذَا جَاءُوهُمْ وَفُقِعْتُ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ

﴿خَزَّنَتْهَا سَلَمٌ عَيْنُكُمْ طَبْنُهُ فَادْخُلُوهَا حَلِيلِيْنِ ط﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۲)

”اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے،

یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس

کے سباب کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔“

﴿وَالْمَلِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَمٌ عَلَيْهِمْ بِمَا صَبَرُتُمْ فَعَمَّ عَقْبَى الدَّارِطِ﴾

(۱۳/ الرعد: ۲۳، ۲۴)

”اور جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا

بدل ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔“

﴿عَلَيْهَا مَلِيْكَةٌ غَلَاطٌ شَدَادٌ﴾ (۶۱/ النحر: ۶)

”دوزخ پر سخت دل طاق تو فرشتے مقرر ہیں۔“

﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلِكَةً﴾ (٨٤ / المدثر: ٣١)

”ہم نے دوزخ کا اہل کا فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔“

⑧ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں:

﴿وَتَرَى الْمَلِكَةَ حَافِنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَيِّغُونَ بِحُمْدِ رَبِّهِمْ﴾

(٧٥ / الزمر: ٣٩)

”اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و شان میں مصروف ہوں گے۔“

﴿لَا يَسْتَعْنُونَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ﴾ (٣٧ / الصَّافات: ٨)

”اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔“

﴿مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَائِكَةِ إِذْ يَخْتَصِّمُونَ﴾ (٣٨ / ص: ٦٩)

”مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔“

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے، جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار ہیں گے:

﴿وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَاءِهَا مَوْيِئُ عَرْشِ رَبِّكَ فَوَقَهُمْ يَوْمَئِنْ تَوْبَيَّةً﴾

(٦٩ / الحاقة: ١٧)

”اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اپنے اٹھائے ہوں گے۔“

﴿كَلَّا إِذَا دَكَّتِ الْأَرْضُ دَكَّادَ كَلَّا وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفَّا صَفَّا﴾

(٢٢، ٢١ / الفجر: ٨٩)

”ہر گز نہیں، جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرماؤ گا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمَلَكَةُ صَفَّا صَفَّا﴾ (٧٨ / النبیا: ٣٨)

”جس دن روح اور فرشتے صفات باندھ کھڑے ہوں گے۔“

⑨ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی تبلیل و تقدیم اور حمد و شان میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کاپتے رہتے ہیں اور خدا کے حضور میں اہل

زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں:

﴿وَالْمَلِكُ يُسْتَحْوَنَ بِمُحَمَّدٍ رَّبِّهِمْ وَيُسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (۴۲/ الشوری: ۵)

”اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشاش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشش والا اور حم کرنے والا خدا ہی ہے۔“

لیعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدا ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے:

﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسْتَحْوَنَ بِمُحَمَّدٍ رَّبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ يٰهُ وَيُسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ أَمْنَوْا﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷)

”جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروڈگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشاش کی دعا کرتے ہیں۔“

﴿وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْمِرُونَ يُسْتَحْوَنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَقْتُرُونَ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۱۹)

”آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور ست نہیں پڑتے۔“

﴿بَلْ عِيَادٌ مُّكَرَّمُونَ لَا يَسْتَقْنُونَ بِالْقُولِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ يَعْلَمُ مَا يَبْيَسُ أَيْدِيهِمْ وَمَا كَلَفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَرَكَطَهُ وَهُمْ فِي خَشْيَةِ مُشْفِقُونَ﴾

(۲۱/ الانبیاء: ۲۶-۲۸)

”بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دتی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں..... اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔“

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمْرَهُمْ وَيَعْلَمُونَ مَا يَوْمَرُونَ﴾ (۶/ التحریم: ۶)

”خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے، وہ اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔“

﴿وَيُسَيِّمُ الرَّاعِدَ بِمَهْدَهِ وَالْمَلِكَةَ مِنْ خِيفَتِهِ﴾ (۱۳/ الرعد: ۱۳)

”اور بھلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ذر سے اس کی حمد و تہنیح کرتے ہیں۔“

﴿وَلَلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَائِكَةٍ وَالْمَلِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكِبُونَ
يَخَافُونَ رَبَّهُمْ قُنْ فَوْقِيمُ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمِرُونَ ﴾

(۱۶ / النحل: ۴۹، ۵۰)

”اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں
اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے ماں کے جوان کے اوپر ہے ذر تے رہتے
ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔“

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باشیں ایسی داخل تھیں جو تو حید کامل کے منانی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو مuttle ہبہ اکر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کار فرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم میں فرمایا رہا جانتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداوں کا درجہ دے دیتے تھے، جیسا کہ تورات (صحیفہ تکوین ۱۲، ۱۳، ۱۸، ۲۱، ۲۲، ۲۳) کے تصویں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ ”خدا کے بیٹوں“ کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے، (تکوین ۲، ۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے ”چھوٹے خداوں“ کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہوتی تھی اور ان کی شیلیت کا ایک رکن تھی، عربوں میں وہ خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوچھا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، تعالیٰ محمدؐ نے ان تمام عقائد بالطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدا کی کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو جو کام پر دے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بنہ ممحض ہیں، وہ نہ عبادت کے متعلق ہیں اور نہ خدا کے بلا اذن وہ شفاقت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے ان دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ وہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ وہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کامنے پتے اور ارزتے رہتے ہیں:

﴿وَقَالُوا تَخْذِلُ الرَّحْمَنُ وَلَنْ أَسْبِغَنَّهُ بَلْ عِبَادُ مُكْرَمُونَ ﴾ لَا يَسْقُونَهُ بِالْقُولِ وَهُمْ بِآمِرَةٍ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفُهُمْ وَلَا يَشْعُرُونَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُنَّ اُتَّصَانِي وَهُمْ قُنْ خَشِيتَهُ مُشْفِقُونَ وَمَنْ يَقُولُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ مَنْ دُوْنَهُ فَذَلِكَ تَجْزِيَةُ جَهَنَّمَ كَذَلِكَ تَجْزِيَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٢٦﴾ (الأنبياء: ٢٦-٢٩)

”مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اور وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جوان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے، واقف ہے، وہ شفاقت نہیں کرتے، لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، ان میں سے جو یہ کہہ کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔“

»إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مُرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ الْقَطَّهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرَوْحَمَ مِنْهُ فَأَمْنَوْا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَلَا تَقُولُوا ثُلَّةٌ إِنَّهُمْ خَيْرُ الْكُوُنْدَلِيُّونَ لَهُمْ أَنْ يَكُونُ لَهُمْ وَلَدٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكُفُي بِاللَّهِ وَكِيلًا لَهُمْ أَنْ يَسْتَكْلِفُ السَّيِّئُونَ أَنْ يَكُونُ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا مَلِكًا لِلْمُقْرَبِيُّونَ وَمَنْ يَسْتَكْلِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْلِفْ قَسِيْسَيْنَ حُرُمَهُمْ إِلَيْهِمْ جَمِيعًا ﴿٤﴾ (النساء: ١٧١، ١٧٢)

”خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کافی وکیل ہے، مجھ کو اس سے عار نہ ہو گا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔“

»وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَكْفُرُوا بِالْمُلِكَةِ وَالنَّبِيِّنَ أَرِبَابَ أَيْمَانٍ أَيْمَانٍ كُمْ بِالْكُفْرِ يُعَذَّبُ إِذَا نَمَ مُسْلِمُونَ ﴿٥﴾

(آل عمران: ٨٠)

”خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغبروں کو خدا بناو، کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔“

»وَيَوْمَ يَحْشِرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمُلِكَةِ أَهُؤُلَاءِ أَكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٦﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلَيْسَ أَنْ دُونَهُمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّةَ أَكُمْ يَوْمَ مُؤْمِنُونَ ﴿٧﴾

(سبا: ٤١، ٤٠)

”اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہہ گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوچھتے

تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا اولیٰ ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، اکثر نہیں جنوں پر ایمان لائے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلِكَةُ صَفَا لَا يَنْكَبُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

(النبا: ۷۸)

”جس دن روح اور فرشتے صفات خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ نہ بول سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔“

﴿وَكُمْ قِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مَنْ بَعْدَ أَنْ يَأْذِنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَى﴾ (النجم: ۵۳)

”اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو اجازت دے اور پسند کرے۔“

﴿أَفَأَنْصَفْكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَيْنِ وَأَنْخَذَ مِنَ الْمَلِكَةِ إِنَّا كُلُّنَا إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا وَلَقَدْ صَرَقْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنَ لِيَدْكُرُوا طَ وَمَا يَرِيدُهُمُ إِلَّا نُورًا وَهُنَّ قُلْنَ لَوْكَانَ مَعَةَ الْهَمَّةِ كُلُّمَا يَقُولُونَ إِذَا الْأَبْتَغُوا إِلَى ذِي الْعُرْشِ سَيِّلًا سُبْحَانَهُ وَسَعْلَى عَيَّا يَقُولُونَ عَلَوْا كَبِيرًا وَتُسَمِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبِيعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط﴾ (بنی اسرائیل: ۴۰-۴۴)

”کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لاکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکلتے ہو اور ہم نے قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کی باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہ دوائے پیغمبر اکماگراس ایک خدا کے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے، تو اس تخت وآلے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلدو برتر ہے ساتوں آسان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔“

﴿وَجَعَلُوا الْمَلِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمَنِ إِنَّا كُلُّا أَشْهُدُوا حَقَّهُمْ ط سَيَّلَتْ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْلُونَ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدَ نَهْمَطْ مَا لَهُمْ بِذِلِّكَ مِنْ عِلْمٍ ط إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ط﴾ (الزخرف: ۱۹، ۲۰)

”اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنادیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہیوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے انہیں اس کا تحقیقی علم نہیں، وہ

صرف انکل لگاتے ہیں۔“

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استعضاً مقصود نہیں۔

یہود یوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراة میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا ”اور انہوں نے کھایا“ (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر:

﴿فَلَمَّا رَأَى أَنْدِيَّهُمْ لَا تَصْلُ إِلَيْهِ تَرْهُمْ وَأَوْجَسْ مِنْهُمْ خِفْفَةً قَالُوا لَا تَخْفَ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمٍ لُّؤْطِطٌ﴾ (۱۱ / هود: ۷۰)

”جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ذر نہیں، ہم لوٹ کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لیے) بھیجے گئے ہیں۔“

کفار قریش کا مطالبہ تھا، کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب میں کہا گیا:

﴿وَكُوْجَعْنَهُ مَلَكًا جَعْلَنَهُ رَجُلًا وَلَكَبِسَنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ﴾ (۶ / الانعام: ۹)

”اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر سمجھتے تو (آدمیوں کے لیے) اس کو آدمی ہی بناتے، تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے، (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)“

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریم علیہ السلام وغیرہ کے قصور میں ہے:

﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (۱۹ / مریم: ۱۷)

”وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔“

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

① ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار حکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، بلکہ تو حید کی تجھیں ممکن نہ تھی۔

② دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص و طبائع کی بالذات کا فرمائی کا اہل یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی پھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے اور حقیقت ان مادی خواص و طبائع پر وحاظی اسہاب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موڑنہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو موڑنہیں ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الہی کے افعال کا صدور ان حکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

﴿وَرُسُلِهِ﴾

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور بیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور ریس گی، اسی کی سرز میں دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور ہماری زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، باہل دنیوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کو بجائے خود تہبا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے شرف ہونے کا مستحق جانتے تھے لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا۔ آپ ﷺ نے یہ سکھایا کہ ”دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں نہ عرب کو حجم پر اور نہ جنم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے۔“ * ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا۔“ ** اسی طرح یہ بھی تعلیم وی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز تنگ روپ ملک و مرزا بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے۔ *** اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہو گئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساوات انسانی کا راستہ صاف ہو گیا، بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا۔ وحی محمدی ﷺ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿بَلْ أَنَّمَا يَرْتَقِي مِنْ خَلْقِي﴾ (۵/الملائدة: ۱۸)

”بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔“

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا اور شہر ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دادعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رہیوں اور نہیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اور اراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف، عدل و کرم اور اس کی رحمت عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

﴿ذلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُغْنِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمُ﴾ (۶۲/الجمعة: ۴)

* مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص: ۴۱۱۔ ** جامع ترمذی، ابواب المناقب: ۳۹۵۵۔

*** قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَهُمْ مَنْ يَعْنَدُ اللَّهَ أَنْفَاقَهُمْ﴾ (۴۹/الحجرات: ۱۳)

”یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔“

﴿قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهُ أَنْ يُوحِيَ الْحُكْمَ فَمَا أَوْيَتْهُ إِلَّا جُنُونٌ وَمَا جَوَّهَ عِنْدَ رَبِّكُمْ طَفْلٌ إِنَّ الْفَضْلَ إِبْرَاهِيلُ اللَّهُ يُعْلِمُهُ مَنْ يَشَاءُ طَوَّافُ اللَّهِ وَاسِمُ عَلِيِّمٍ يَخْتَصُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ طَوَّافُ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمُ﴾ (۲/ آل عمران: ۷۳، ۷۴)

”کہہ دو کہ ہدایت، اللہ کی ہے (اسرائیل علمائے پنے ہم نہ ہوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ یہ (نبوت کا فضل) اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔“

﴿مَا يَوْدُ الظَّنِينَ كُفَّرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكُونَ أَنْ يَهْرُلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ قُنْ رَبِّكُمْ طَوَّافُ اللَّهِ يَخْتَصُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ طَوَّافُ اللَّهِ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمُ﴾

(۱۰۵/ البقرة)

”اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھالی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکا نے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر بن کر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔ بعثتِ محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے نا آشنا تھی۔ ہندوستان کے رشیوں اور مینیوں نے آریہ درت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا بھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ درت کی ہدایت اور راہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادوں ایران کے سواب کو یزد ایں کے جلوہ نورانی سے محروم یقین کیا۔ بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب و چجم اور شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ میں آنکھوں نے پورب، پچشم، اتر، دھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ﴾ (۱۰/ یونس: ۴۷)

”اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔“

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا﴾ (۱۶/ النحل: ۳۶)

”اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔“

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ﴾ (۳۰/ الروم: ۴۷)

”اور ہم نے تھے سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔“

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادِيٌّ﴾ (۱۳/ الرعد: ۷)

”اور ہر قوم کے لیے ایک رہنماء آیا۔“

﴿وَكَانَ مِنْ أُمَّةٍ لَا حَلَّ فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (۳۵/ فاطر: ۴)

”کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيَلْكُنَ قَوْمَهُ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (۱۴/ ابراهیم: ۴)

”اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا، تاکہ وہ ان کو بتاسکے۔“

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الہی تشریع و بیان کے لیے مامور ہے۔ ایک یہود کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر مانتا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو پیچھے، شود اور چندال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زرتشتی تمام عالم کو خیر طمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعروز بالتدبیح و نہ کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ علیہ السلام نے یہ نامکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیغمبری کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت علیہ السلام تجدید میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا (وَالْبَيْوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ) ۖ ”سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے۔“ غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی یا عیسیوی اور سلیمانی داؤ دی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی کیسا صداقت، حقانیت، راست بازی اور مخصوصیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی بدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیے ہے، ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا مانا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَرَبِّيْدُونَ أَنْ يُتَّقِّوُا بَيْنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ﴾

بِعَضٍ وَنَفْرٌ بِعَضٍ لَا يُرِيدُونَ أَنْ يَتَجَدَّدُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَئِكَ هُمُ الظَّفَرُونَ حَقًّا ۝ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّافِرِينَ عَذَابًا مُهِمَّاتًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَلَمْ يُنَزِّقُو بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَئِكَ سُوفَ يُؤْتَوْهُمْ أَجُورَهُمْ ۝ وَكَانَ اللَّهُ عَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(٤ / النساء: ١٥٠ - ١٥٢)

”بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے پیچ پیچ میں کوئی راستہ پکڑیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر کھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشش والا اور رحمت والا ہے۔“

﴿وَالْمَلِكَةُ وَالْكِتَبُ وَالثَّيَّبُنَ﴾ (٢ / البقرة: ١٧٧)

”اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔“

﴿وَمَنْ يَقْرِئِ الْكِتَبَ وَمَلِكَتِهِ وَلَكُنْيَةِ وَرَسُولِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ بَعْيَدًا﴾

(٤ / النساء: ١٣٦)

”اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔“

سورہ بقرہ کے خاتمه میں ہے:

﴿كُلُّ أَمَنَ بِاللَّهِ وَمَلِكَتِهِ وَلَكُنْيَةِ وَرَسُولِهِ لَا تُنَزِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ﴾

(٢ / البقرة: ٢٨٥)

”ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔“

﴿لَا تُنَزِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ﴾ (٢ / البقرة: ٢٨٥)

”ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔“

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یہاں خدا کا رسول، صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ بالله جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ میسیح سے زیادہ ہے اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ نگاہ گوارنیٹ کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، مخصوصیت اور قدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، چنانچہ خود آنحضرت علیہ السلام کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، آنحضرت علیہ السلام نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم قبول کی، مگر مسیح علیہ السلام کی چھائی سے محروم قبول نہ فرمائی ۴۷ اور ان سے صاف کہا:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابَ هَلْ تَسْقُمُونَ مِنْ أَنَّا أَنْعَمَنَا بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا إِلَيْنَا وَمَا أَنْزَلْنَا مِنْ قَبْلِ۝ وَأَنَّ أَكْثَرَهُمْ فَيُقْرَنُ﴾ (۵۹/۵۹) (المائدۃ: ۵۹)

”اے یہودا کیا ہیر ہے تم کو ہم سے مگر یہیں کہ ہم خدا پر، اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔“

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چکتے تھے، مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، قدس اور مخصوصیت سے انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا:

﴿وَلَمَّا كَانَ صَرِيبَ الْبْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ وَكَالْوَاءَ الْهَمَّةَ كَخَيْرِ أَمْوَالِهِ مَا ضَرَبَ لَكَ إِلَّا جَدَلَّ طَبْلَ هُمْ قَوْمٌ خَاصِّمُونَ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾

(۵۷-۵۹) (الزخرف: ۴۳)

”اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تب ہی تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اپنے ہیں یادا، یہ نام جو تجھ پر دھرتے ہیں صرف بھگڑنے کو بلکہ وہ بھگڑا لو ہیں، وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔“

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ ابن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسا یوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرست تصور کر کے الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد مدد و نہیں، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوٹیں ہزار انہیا میتوڑ ہوئے، ایک دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مردی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ

۴۷ تفسیر ابن حجریر طبری، ج ۶، ص: ۱۶۷، مصر۔

صرف انہیں انبیا ﷺ کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیا بھی ذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے مگر یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً: حضرت ہود اور حضرت شعیب ﷺ بعض ایسے ہیں جن کو وہ جانتے تھے لیکن ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے، مثلاً: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ﷺ۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کرو دینا مناسب ہے۔ اسلام سے پہلے نبوت و رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص، واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کرنے کے تھے اور نبی پیشین گوکرتہ تھے اور جس کے متعلق یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یاد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم، حضرت اوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف ﷺ کی نبوت اور رسالت کا مخفی وحدنا لاساخا کہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ حضرت ابراہیم ﷺ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزد یک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت داؤد اور سلیمان ﷺ کی حیثیت بھی ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت نحیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں اسی طرح عیسائیوں میں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ”مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے۔“ مسیح موعودہ انجلیوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت میحیٰ ﷺ جن کے تذکرے انجلی میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے فرائض بتائے اور اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانا نجات کا ضروری ذریعہ فرا دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشنا ہوا ایک منصب ہے جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گے ہیں کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں وہ ہادی (راہنمای) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) میشو (خوشخبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا نے احکام پہنچانے والے) اور سور (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے نئے اور خدا ان کے لیے تھا۔ یہ سیاں اپنے فرائض کو ناجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں

۱۔ دیکھو تورات صاحیفہ تکوین، باب: ۲۰۔ ۲۰۔ ۲۰۔ ۱۴۔ ۲۔ نہر تکوین: ۱۸۔ ۱۴۔ ۳۔ انجیل۔

جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹالا یا بلک و بر باد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی رواداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی طرف شان بیوت کے خلاف جو غلط باقیں دوسرا سے صحقوں میں منسوب ہیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض بیوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو بیوت اور رسالت کے اس بلند تخلیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لیے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گناہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاک اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کہ جو خود گناہگار ہے وہ گناہگاروں کی راہنمائی کا مستحق نہیں کہ انہا انہ ہے کوراہ نہیں دکھاسکتا اس بنا پر محمد رسول اللہ علیہ السلام کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو رباطوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھوکر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی علیہ السلام کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَبَرَأَ يُوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَارًا شَقِيَّاً﴾ (۱۹/ مریم: ۳۲)

”اور اپنی ماں کے ساتھ بیگی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بدجنت نہیں بنایا۔“

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بخوبی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر تھوپا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروانہ کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَمَرِيمَ ابْنَتَ عَمْرَانَ الَّتِيْ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوْحِنَا وَصَدَقَتْ بِكَلِمَتِ رَبِّهَا وَلَكُنْهَا وَكَانَتْ مِنَ الْقَرِيْتِيْنَ﴾ (۶۶/ التحریر: ۱۲)

”او مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھوکی اور اس نے اپنے پروڈاگر کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔“

یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو گندہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجہ سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ تورات میں شرک قرار دیا جا پکھا اور قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

﴿وَمَا لَكُمْ سُلَيْمٌ وَلِكُنَ الشَّيْطَانُ كُفَّرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّاحِرُونَ﴾

(۲/ البقرة: ۱۰۲)

”اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سمجھاتے تھے۔“
اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام پر بدکاری کا جواہر امیہ یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں
کہ صرف ناموں کی فہرست یا نام معلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت پیدا نہیں ہو سکتا، تاہم
معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچ گی اور بہت سی غیر قومیں
اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کا نام و شان حیفہ محمدی علیہم السلام
میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان
 بتادی گئی، فرمایا:

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كُلَّاً أَوْحَيْنَا إِلَى تُوْجِهِ وَالنَّبِيُّنَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَعِيسَى وَأَبْيَوبَ وَنُوحُ وَهُرُونَ وَسُلَيْمَنَ وَأَتَيْنَا دَاؤَهُ
زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَا لَمْعَنِّكَ مِنْ قَبْلِ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصَصْهُمْ عَلَيْكَ طَ وَكَلَمَ اللَّهُ
مُؤْنَى تَكْلِيمًا طَ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرَّسُولِ طَ
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا طَ﴾

(۴/ النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

”ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وہی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے
پیغمبروں کو بھیجی، ہم نے ابراہیم کو اور اسماعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو
اور عیسیٰ کو اور یوپ کو اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو، وہی بھیجی اور داؤ دکوز بور عطا کی اور
دوسرے رسولوں کو بھیجا، جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال
ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موئی سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا
اور ہشیار کرنے والا ہنا کر بھیجا، تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجائے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر
باتی نہ رہ جائے اور خدا غالباً اور وانا ہے۔“

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورہ موسیٰ میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ
عَلَيْكَ طَ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷۸)

”اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔“^۱

تعلیمِ محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیاء محبوب ہو چکے ہیں اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور استیازی کا قطبی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام  کو بلکہ ایران کے زرتشت  کو بھی اور بعض صاحبوں نے توبو درست کو بھی پیغمبر کہا ہے، ہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تیزی بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء ﷺ کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنا ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن پختہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قریبہ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان بالتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ اس تخصیص تیزیں سے خاموش ہے۔ اس قسم کے انبیاء ﷺ جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں، ان کی شناشت اور پیچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيٗ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا إِنَّا عَبْدُهُ وَاللّٰهُ وَآجِتَبْنَا الظَّاغُوتَ﴾

(۳۶) التحلیل:

”اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرشیش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا مَاعِدُ دُنُونٌ﴾

(۲۵) الانبیاء:

”اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی تبھی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھ کو پوجو۔“

اس لیے وہ تمام قدیم رہبران انسانی اور رہنمایاں عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی

۱- کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا ظہیر جان جاتاں ہوئیں۔ ملتوی چہارم ص: ۳۷۴۔

۲- ملک و نحل لابن حزم، الكلام علی النہیود، ج: ۱، ص: ۱۱۳۔

تبیغ اور تعلیم تو حید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بنیاد نمیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس بنیاد پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے کیاں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ تو حید ہے البتہ ان انبیاء ﷺ میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

﴿تَلَكَ الرَّسُولُ فَضَلَّنَا بِعَضُّهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَنَهْمُ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَقَمَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٌ طَوِيلَاتٍ﴾

وَأَيْنَنَا عَيْنُكِ ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتِ وَأَيْدِنَهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۝ (۲۵۳) (بقرہ: ۲)

”ان رسولوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔“

آپ نے دوسرے انبیاء ﷺ کی جائز تقدیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریت اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا: ”وَهُوَ أَبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الْأَنْعَامُ“ * ایک دفعہ ایک صحابہ نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کوں تھا، فرمایا: ”يُوسُفَ عَلَيْهِ الْأَنْعَامُ“ پیغمبر بن غلیل اللہ * ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر فضیلت دی ایک مسلمان کھڑے یہ سن رہے تھے ان کو غصہ آیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپر کھٹکی مارا، اس نے دربار نبوی میں جا کر کہکشانی کی آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی رو دادی اور نہایت برہم ہو کر فرمایا: ”پیغمبروں میں باہم ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔“ * یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تقیص ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات اور انسانی اخوت اور تمام انبیاء ﷺ اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھوں سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان کی عظمت، جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس

* مسند احمد، ج ۳، ص ۱۷۸، ۱۸۴۔ ** صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله عزوجل: ﴿لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَآخُوهُمْ﴾

- ۳۴۹۔

*** صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ: ﴿وَإِنْ يُونِسَ لَمِنْ الْمُرْسَلِينَ﴾: ۱۴۔

تک یہودیوں کی جھوٹی تہبیت سنتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس کو منایا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان، ایران، چین جن کے پچ رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت اور رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انہیاً علیہ السلام اور رسولوں کی سیرتوں سے نا آشنا تھے، جوان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے اور جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ اہن مریم علیہ السلام پر تحقیر انہی آتی تھی، ﴿۱۸﴾ اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے ﴿۱۹﴾ محمد رسول اللہ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تمباً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے اور آج تمام مسلمانوں میں وہ نام شائع اور رذائل ہیں، ان کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی اور ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تنظیم و تحریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنالیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انہیاً علیہ السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

﴿۱﴾ قرآن پاک سورہ زخرف، آیت نمبر: ۵۷۔

﴿۲﴾ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب (ان یونس لمن المرسلین)، ۳۴۱۴۔

کتب الٰہی پر ایمان وَكُتُبِهِ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفہ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات کو اور وحی کو مان لینے کے متراود ہے۔ تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی ہے، تاکہ یہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفہ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ سورہ بقرہ کے شروع ہی میں چچے موسنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ﴾ (۲/ البقرة: ۴)

”اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجوہ پر (امے محمد) اتنا ری گئی۔“

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور عکموں کو بد دجان قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں، اس لیے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام کی باتیں ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تسلیم و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس کی تصریح آنحضرت ﷺ نے بھی ان الفاظ میں فرمائی کہ **((بِمَا جِئْتُ بِهِ))** ”جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاو۔“ قرآن نے کہا:

﴿وَأَمْنَأْتُ بِمَا أُنزِلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ﴾ (۴۷/ محمد: ۲)

”اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتنا رکھا۔“

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیر و صرف مجھ پر ایمان لا سیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہل قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانوں کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفہ محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورہ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (۲/ البقرة: ۴)

”اور جو ایمان لائے اس پر جو تجوہ پر اتنا اور جو تجوہ سے پہلے اتنا۔“

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

﴿أَمَّنِ الرَّسُولُ يَهَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ طَمْلٌ أَمَّنِ بِاللَّهِ وَمَلِكِهِ﴾

(۲۸۵/ البقرة)

”رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اتر اور اہل ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔“
بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء ﷺ کا تفصیلی و رجہ اور بقیہ تمام انبیاء ﷺ کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور حیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

﴿فُلُوا أَمَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوْتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوْتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ﴾

(۱۳۶/ البقرة)

”اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب ﷺ اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ان سب پر ایمان لائے۔“

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے:

﴿فُلُوا أَمَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوْتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ﴾

(۸۴/ آل عمران)

”کہہ کہ ہم خدا پر جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب ﷺ اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔“

سورہ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو فرقہ اردا گیا:
 ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْنُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالْكِتَابَ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابَ الَّذِي نَزَّلَ مِنْ قَبْلُ طَ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلِكِهِ وَنَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّلًا بَعِيدًا﴾ (۱۳۶/ النساء)

”اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان لا ڈھا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں

کا اور اس کی کتابوں کا..... انکار کیا وہ نہایت سخت گراہ ہوا۔“

سورہ مومن میں ان منکروں، کو منذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی تینگر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں:

﴿الَّذِينَ لَكَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَيَقُولُونَ إِنَّا أَرْسَلْنَا يَهُوَ رَسُولُنَا فَكُلُّ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذَا الْأَغْلَلُ فِيْ أَعْنَاكَ قَهْمٌ وَالشَّلَسْلُ مُيَسْعِبُونَ﴾ (۴۰/۷۱، ۷۰ المؤمن)

”جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، ان کو جھٹلا یادہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گرونوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ بھیچے جائیں گے۔“

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے توراة جس کو ایک جگہ صحف موئی بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

﴿إِنَّ هَذَا لِفِي الصُّحْفِ الْأُولَى صُحْفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى﴾ (۱۹/۸۷)

(الاعلیٰ: ۱۸، ۱۹)

”یہ باقیں گز شہزادیوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔“

ان کے مساوا جمال کے ساتھ دو موقعوں پر گز شہزادیوں کی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

﴿أَوْلَمْ تَأْتِيهِمْ بِيَتَّهُ مَا فِي الصُّحْفِ الْأُولَى﴾ (۲۰/۱۳۳)

”کیا انکے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟“

﴿وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ﴾ (۲۶/الشعراء: ۱۹۶)

”اور بے شہبیہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔“

اس بنا پر انبیاء علیہما السلام کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیلی اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالا جمال ایمان ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصحت ہے تو اگرچہ اس کو بصرت خدا کی کتاب قبول نہیں کر سکتے، تاہم بالصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ”اہل کتاب کی نہ تقدیم کرو اور نہ تکذیب۔“ ۲ یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ یہ وہ توراة کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراة کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں مگر انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں

۲ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب یجوز من تفسیر التوراة: ۷۵۴۲ و کتاب التفسیر: ۴۴۸۵۔

کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شہبھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری پیشتر آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جائیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی بہت سالانہ تعلیمات میں سے ہے، جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری، بے تعصی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہوداپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تو راتہ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا موقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربائی کتابوں کو باطل مان کر بھی میتو (جنت) کا اتحاقاً پیدا کر سکتا ہے، ہندوؤا پنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی آواگوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سواتnam دنیا کی وجہوں کا انکار کر کے بھی نزدوان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو نجائب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور ”غیر قومیں“ یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیساییوں میں مذہبی حیثیت سے سمجھی اور یہودا اور بت پرستی گوئی قومیں مانیں جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں، اس لیے وہ اکثر امور میں رومان لا کے ماخت رہے ہیں لیکن رومان عیساییوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسمیں ہیں روای اور غیر روای اور ایک روای ملک میں غیر روای کا کوئی حق نہیں کہ روای حکومت کے لیے اور غیر روای غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤوں میں اوپری ذاتیں اور اچھوت اور ملچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے اور اسلام کی تیرہ صدیوں میں ان پر برابر عمل ہوتا رہا یہ تقسمیں حسب ذیل ہیں:

① مسلمان

جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں وہ ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی یا

کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح کیے ہوئے جانور کھا سکتے ہیں اور اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

② اہل کتاب

یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گواہی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی تکمیل (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے دور میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے مذہب کے بد لئے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ رہیں گے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

③ شبہ اہل کتاب

یعنی وہ لوگ جو قرآن اور تورات اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعا ہیں، جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوچھتے تھے اور محوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صفت میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبح نہیں کھا سکتے ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کیے اور وہ اسلامی حکومتوں میں اداۓ جزیہ کے بعد قریم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں اور ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

④ کفار اور مشرکین

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق کے حصول کے لیے ان کو کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں جیسا کہ عبادیوں کے ابتدائی زمانہ میں خرانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جوں کے

لیے آمادہ کیا اور مجوہ سیوں اور صابوں اور بیہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی نیازدار کھنے کی قوت پیدا کی۔

وحدة الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد تک جتنے بچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد تک باری باری سے پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفہ محمدی نے ہمارے سامنے دولظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعاً، منک اور منہاج۔ شرعاً اور منہاج کے معنی راستے کے ہیں اور منک کے معنی طریقہ عبادت کے ہیں۔ دین میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ اللہ ہمیشہ ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا، ہماری معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام میں یکساں آیا اور ہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائیٰ حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید، اس کے صفات کاملہ انبیاء اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اور اخلاقی فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا اور سزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حق کا اتفاق ہے اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرعاً منہاج اور منک کہا ہے اور وہ جزئیات احکام اور متقدّه حصول مقصد کے جدا چدار استے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں، مثلاً: عبادتِ اللہ ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریقہ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے اسی طرح اعمالی فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا متفق نصب اعین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقہ جدا چدائیں، غرض یہ راستے اور طریقہ مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جواز کی سچائی اور ابدی صداقت ہے ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا دنیا میں وقایو تھا ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی اذلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اپنے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جوان کے لیے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔ انبیا علیہم السلام کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مسجوت ہوا ہے جب اس کا صحیفہ وحی جو اس کے دین و شریعت کا محافظ ہوتا ہے کھو گیا ہے یا انسانی دست برداشتے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، صحیفہ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ تورات کے سفرنگوین میں ہے صحیفہ موئی نازل ہوا۔ صحیفہ موئی کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر اس کی تحریک کے لیے انخلیل آئی اور انخلیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا اور چونکہ وہ دنیا کے آخر تک کے لیے آیا اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعاویات واحد احادیث کے انسداد کے لیے اسکے خلاف، مجددین، محمد شین اور علمائے راشدین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پیچان سنت مجری علیہم السلام کا احیا اور بدعاویات کا قلع و قع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی علیہم السلام کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

”وَحدَتْ دِيْنَ“ کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ قِنَ الدِّينِ مَا وَظِيَّ إِهْ تُؤْمِنُوا وَالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكُ وَمَا وَصَيَّبَ إِهْ إِلَيْهِمْ
وَمُوْلَى وَعِيَّتَی اُنْ آقِيَّوْ الدِّينَ وَلَا تَنْقَرُّوْ فِيْهِ طَلَبَ عَلَى الْمُشَرِّكِيْنَ مَا تَدْعُوهُمْ
إِلَيْهِ طَأَللَّهُ يَعْتَبِرُ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يَنْهِيْ طَ وَمَا تَنْقَرُّوْ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا
جَاءَهُمُ الْعِلْمُ يَغْيَا بِهِمْ طَ وَلَوْلَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَيْ آجِلِ مُسَيَّ لَقْضَى بِيَّنَهُمْ طَ
وَإِنَّ الَّذِيْنَ أُرْتُوا الْكِتَبَ مِنْ بَعْدِ هُمْ لَفْ شَكَّ قِنَهُمْ مُرِيَّ طَ فَلِذِلَكَ فَادْعُ طَ وَاسْتَقِمْ
كَمَا أُمِرْتَ طَ وَلَا تَنْتَهِيْ أَهْوَاءُهُمْ طَ وَقُلْ أَمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَبٍ طَ وَأَمْرْتُ لَآعْدِلَ
بِيَنَمُ طَ أَللَّهُ رَبِّنَا وَرَبِّكُمْ طَ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ طَ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَمُ طَ أَللَّهُ يَعْلَمُ
بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَحِيرَ طَ﴾ (۱۳، ۴۲/ الشوری)

”اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو اس نے نوح سے کہی تھی اور جو ہم نے حکم بھیجا تھم کو اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موئی کو اور عیسیٰ سے یہ کہ ”دین“ کو قائم رکھا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس

کو چاہتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقہ انہوں نے وحی کے علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لیے نہ ہو سکی ہوتی تو (کشف حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان الگوں کے بعد کتاب و راثت میں ملی وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو جیسی نہیں لینے دیتا سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تھوڑا حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کرو کہ کہ میں ایمان لا یا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے نیچے میں انصاف کرو، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، حکم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کام کا، ہم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔“

ان آیات مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو مویں کو اور عیسیٰ علیہ السلام کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے الگوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذاتی تحریفات اور ذاتی تصرفات سے اس میں تفرقہ پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ واری کی راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب نہیں ہے حالانکہ وہ شکوہ و شہہرات کے دل میں پھنسنے ہیں پھر حکم ہوتا ہے کہاے محمد رسول اللہ ﷺ ا تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلا اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کرو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اے اہل کتاب اجو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بث گئے ہو تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معمالات میں ان کے ساتھ عدل و انصاف کروں پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دونیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم تحدی ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جواب دنیں اور تمہارے کام کے ہم نہیں، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ تَكْبِيرٍ سُوَّا إِيمَانَنَا وَيَنْكِمُ الْأَنْعِدُ إِلَّا اللَّهُ وَلَا نُشْرِكُ يَهُوَ كَمَا كَوَّلَ
يَتَّخِذُ بَعْضُنَا بَعْضًا وَرَبُّنَا أَنَّ دُونَ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا الشَّهَدُوا إِنَّا مُسْلِمُونَ﴾

”اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے۔ متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہ دے کہ تم گواہ رہو کر ہم حکم الہی کے تابع (مسلم) ہیں۔“

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں، ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَرَفُواْ دِيْنَهُمْ وَكَانُواْ شَيْعَالَسَّتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ عَطَ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَتَّهِمْ بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۹)

”بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ را ہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے، تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں، ان کا کام اللہ کے حوالے ہے، وہی ان کو جنادے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔“ پھر وہ نوں کو اس کے بعد ہی اصل ”دین قیم“ جوبراہیم علیہ السلام کا تھا، اس کی دعوت دی گئی:

﴿فُلَّ إِنَّمَا هَدَى رَبُّنَّا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِيْنُنَا قِيَمًا قَلَّةٌ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (۶/ الانعام: ۱۶۱)

”کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جو دین صحیح ہے، ابراہیم حنیف کا ندہب اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

غرض اسلام و ”دین قیم“ ہے جو ہمیشہ سے انہیا کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مناکر اسی ایک متحده دین کی پکار ہے، جس کی طرف انہیا علیہ السلام اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے، اسی لیے اکثر انہیا علیہ السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فِيهِدُهُمْ أَفَتَنِدُهُمْ﴾ (۶/ الانعام: ۹۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہیں کی راہ پر چل۔“

بعض اسلامی حدود و شرائع کے بعد فرمایا گیا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنْنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۴/ النساء: ۲۶)

”خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے کھائے جو تم سے پہلے تھے۔“

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا

ہے اور یہ امر واقع ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے یہ کہا گیا:

﴿إِنَّ هَذَا إِلَيْكُ الظُّفُرُ الْأُولُىٰ ۚ صُحُفٌ إِنْرِهِيمٌ وَمُونِسٌ ۚ﴾

(الاعلى: ۱۸، ۱۹) / ۸۷

”بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی، یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔“

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿وَإِنَّهُ لَهُ زُبُرُ الْأَوَّلِينَ ۝﴾ (الشعراء: ۲۶) (۱۹۶: ۲۶)

”اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔“

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

﴿مَا يَقُلُّ لَكَ إِلَّا مَا فَدَدَ قَيْلَ لِلرَّسُولِ مِنْ قَيْلَكَ ۝﴾ (۴۱ / ختم السجدة: ۴۳)

”اے محمد ﷺ! تھے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تھے سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔“

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ اسی پرانی دعوت کی پیشکار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یادب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وہی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آثارہ اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نیکان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلت اور گم ہوتی اور آخري دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک تحفظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصود نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہدِ محمدی تک برابر بدلتی رہتی ہے، اس کا نام شریعت، منہاج اور نسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزویات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سست کا تبعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے حضرت داؤد کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گردیدگی تھی وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیم

عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی واپسگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ ان کا قبلہ تھی۔ چنانچہ قرآن نے تعین قبلہ کے موقع پر کہا:

﴿وَلِكُلٌّ وَجْهَةٌ هُوَ مُولَّهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (۱۴۸/ البقرۃ)

”اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھروہ منہ کرتا ہے، سوتمنیکیوں کی طرف سبقت کرو۔“
یعنی سوتمنیوں اور جہتوں کی تعین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو اسی لیے فرمایا:
﴿لَئِسَ الْبَرَّ أَنْ يُؤْتُوا وَجْهَلَمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَ الْإِيمَانُ أَمَّا إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ بِالْأَمْرِ﴾

(۱۷۷/ البقرۃ)

”نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پھر تم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرا نیک کام کرے)۔“

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو راجح کیا تو کہا، ہر منہج سب نے اپنے لیے عام نہ ہی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے، اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لیے تعین کیا:

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَجِحًا هُمْ نَاسِكُونَ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ طَإِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيْوَ وَكَانَ جَدُّ نُوكَ قَتْلُ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

(۶۸، ۶۷/ الحج)

”ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ نہ ہیں پاہندی کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو یہ شک سو جھک کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑا نہ لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔“

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا اور سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسایوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پہلے یہودیوں سے کہا:

﴿إِنَّا آنَزَلْنَا التَّوْرِيهَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحَكِّمُ بِهَا التَّقِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالَّذِينَ لَمْ يُؤْمِنُوا وَالْأَحْبَارُ إِيمَانًا اسْتَحْفِظُمُ إِنْ كَثِيرٌ إِلَلَهُ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ﴾

(۴۴/ المائدۃ)

”ہم نے تورات اتنا ری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ

کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کے اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔“ پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿وَقَفَّيْنَا عَلَى أَثْارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مُرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرِيقَةِ وَأَئِنَّهُ
الْأَنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرِيقَةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ
لِلْمُمْكِنِينَ وَلِيَحْكُمُ أَهْلُ الْأَنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ﴾ (۴۶، ۴۷ / المائدۃ: ۴۶)

”اور ہم نے ان پیغمبروں کے پچھے مریم کے بینے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا تاہماں کو جو اس کے پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی اور ہدایت اور نصیحت پر ہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں اتراء۔“

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَبِ وَمُهَيِّنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ
بِيَنْهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْمُ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط﴾ (۴۸ / المائدۃ: ۴۸)

”اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر، جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔“ دیکھو کہ کس خوبی کے ساتھ صحیفہ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مرح و تعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گزشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یک جا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہوا کیا ہیں؟ کتاب الہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الہی کے مقابلہ میں انسانی احتیادات کی آمیزش:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتَبُونَ الْكِتَبَ يَأْكُلُونَهُمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

(۷۹ / البقرۃ)

”افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔“

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی شریعت الہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کر،

اس کے بعد حدود اور جزا اور سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا فرمایا:

﴿لِكُلٍ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاءٌ﴾ (۵/ المائدۃ: ۴۸)

”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ بنادیا۔“

انہی اختلافات کی بنابریہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برباط کہتے تھے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَى عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتَّلَوُونَ الْكِتَابَ ط﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۳)

”اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ را پڑھنیں اور نصاریٰ نے کہا: یہود کچھ حق پڑھنیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔“

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

﴿وَقَالُوا كُنُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهَدُّدُوا﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۳۵)

”اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔“

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آ جاؤ اور اصل دین ابراہیم پر متفق ہو جاؤ:

﴿فُلِّيْلَ مَلَّةٌ إِنْ يَهِيمَ حَيْنَفَاطٌ وَمَا كَانَ فِي الْمُشْرِكِينَ قُلْلُوا أَمْتَأْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلَ إِلَيْنَا وَمَا أَنْزَلَ إِلَيْنَاهُمْ وَإِنْمَعِيلَ وَإِسْلَحَقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أَوْتَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أَنْزَلَ إِلَيْنَيْنَ مِنْ رَزْيَهُمْ لَا تُنَزِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ قِنْهُمْ وَسَخْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنَّ أَمْنَوْا بِيَثِيلٍ مَا أَمْنَتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَكُونُوا إِنْتَهَا هُمْ فِي شَقَاقٍ﴾

(۲/ البقرۃ: ۱۳۵-۱۳۷)

”کہہ بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو، جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتر اور جو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اس کی اولاد پر اتنا را گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔“

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿لَئِنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ط﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۱۱)

”یہود اور نصاریٰ کے سوکوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔“

جواب دیا گیا:

﴿تِلْكَ آمَانٌ لِّهُمْ﴾ (۲/ البقرة: ۱۱۱) ”یہاں کی باطل آرزوئیں ہیں۔“

﴿كُلُّ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۶/ البقرة: ۱۱۲)

”ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطع بنا�ا اور وہ نیکو کار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہو گا اور نہم۔“

تمام اہل مذاہب کو یہ سال خطاب کر کے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِرِينَ مَنْ أَمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَكُلُّ صَالِحٍ فَلَهُمْ أَجْرٌ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ بَغْيٌ وَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

(۲/ البقرة: ۶۲)

”بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابیٰ جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروار گار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابیٰ جیسیں ان میں سے جو بھی اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ یعنی جس نے بھی اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور پیغمبیری شریعت کے مطابق جوشک و کفر و بہت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روز آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے، جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا منتظر مسئلہ ہے، اس لیے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّقْوَ بَيْنَ أَنْ يَأْتِيَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَيَقُولُونَ تُؤْمِنُنَّ بِعَصْرٍ وَكَلَّفُرٍ بِعَصْرٍ لَّا يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَيِّئًا﴾ أُولئکہ همُ الکفُرُونَ حَتَّىٰ وَأَعْتَدْنَا لِلْكُفَّارِ عَذَابًا مُّهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَلَمْ يَقُولُوا بَيْنَ أَحَدٍ قِنْهُمْ أُولئِكَ سُوْفَ يُؤْتَيْهُمْ أَجْوَرُهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا حَمِيًّا﴾

(۴/ النساء: ۱۵۰-۱۵۲)

”بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں

کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے
ہدایت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان
میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخششے والا
رحم کرنے والا ہے۔“

دوسری آیت میں ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ أَمْنَوْا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (٤٢: النور)

”مُؤْمِن وَهِيٌ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔“

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبول عمل کے لیے ایمان مشروط ہے اور
دوسرے یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اور جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے
وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا
جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں ہے:

﴿فَلَمَّا يَأْهَلُ الْكِتَابَ لِسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّىٰ يُقْبِلُوا التَّوْلِيَةَ وَالْإِجْيَلُ وَمَا آتَنَا إِلَيْكُمْ مِّنْ
رِّزْكٍ مُّكْثُرٍ وَلَيَرَيْدُنَّ كَثِيرًا فِيمُرْمَثَةً آتَيْلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغِيَانًا وَنُفَرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى
الْقَوْمِ الْكُفَّارِ إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالظَّاهِرُونَ وَالظَّاهِرُونَ مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ بَعْدَنَوْنَ﴾

(۵) / المائدۃ: ۶۷-۶۹

”کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف
اتا را گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر ﷺ) جو تیری طرف اترتا ہے وہ ان کی سرکشی اور
انکار کو اور بڑھائے گا، تو ان مکرروں کا غم نہ کرو اس میں کوئی شہر نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو
یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ان پر
کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر

ستیث اور الوہیت مسیح میں بنتلا ہو گئے اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں بہت گئے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ أَخْذُنَا بِيَقِنَّا بِيَقِنَّا إِسْرَاعِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رَسُلًا مُّكَلَّمًا جَاءُهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَأَنْهَا
أَنفُسُهُمْ وَلَا فِي قَوْمٍ لَّذِيْلُوا وَلَا فِي قَوْمٍ يَقْتَلُونَ وَلَا حَسِبُوا أَلَا لَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمِلُوا وَصَمِّلُوا تَبَّأْنَ اللَّهُ
عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمِلُوا وَصَمِّلُوا كَثِيرًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَاتَلُوا إِنَّ

اللّٰهُ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ لِيَسَعَى اسْرَائِيلَ اعْبُدُ وَاللّٰهَ رَبِّي وَرَبِّكُمْ إِنَّمَا مَنْ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ فَقُدْ حَكْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَمَا أَوْلَاهُ الشَّارِطُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثٌ ثَالِثٌ وَمَا مِنَ إِلٰهٖ إِلَّا إِلٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّ لَمْ يَنْتَهُوا عَنْهَا يُقُولُونَ لَيَسْتَقْرِئُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ» (٥ / المائدة: ٧٣-٧٠)

”بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عبادتیا اور ان کی طرف کی رسول بھیجے جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتنوں کو جھٹالیا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا اور ان میں بہتیرے اندر ہے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، بے شبهہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بینا مستحیل اہی اللہ ہے مستحیل اہم نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جو اللہ کو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا نہ دزخ ہے اور گناہ کاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں بے شبهہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی اللہ نہیں، مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے بازنہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔“

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی روایت میں ان کے ”حسن عمل“ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

«وَكُونُوكُلُّوْيُومُونَ بِاللّٰهِ وَالثَّقِيْلِ وَمَا أَنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أُولَيَاءٌ وَلَكُنْ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَسِقُونَ» (٥ / المائدة: ٨١)

”اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اتر اس پر یہ ایمان لے آتے تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بنتاتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔“

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترکہ دین کا اصل الاسرول دو باقی ہیں تو حید کامل اور رسالت عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو تو حید کی تمام صفتتوں میں کامل بلا شریک مانا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

«أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَكَ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكُرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ قُلْ أَمَّا بِاللّٰهِ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا وَمَا أَنْزَلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أَوْتَنِي مُوسَى وَعَيْسَى وَالثَّقِيْلُونَ مِنْ رَبِّهِمْ مَنْ لَا تَقْرِئُ بَيْنَ أَحَدٍ

فِنْهُمْ وَسَعْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ وَمَنْ يَكْتَنِ غَيْرُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۝ وَهُوَ فِي
الْآخِرَةِ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝» (۳/آل عمران: ۸۳-۸۵)

”کیا وہ دین الٰہی کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً اخدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائیں جائیں گے (اے پیغمبر!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتنا را اور جو ابراہیم اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اُتر اور جو کچھ موکی اور عیسیٰ اور سب تینوں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلات باطلہ اور اتباع متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے، یعنی دین اسلام سے روگردان ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّيَنَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۝ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ
الْعِلْمُ بِغَيْرِ يَقِيْنٍ ۝ وَمَنْ يَكْفُرُ بِأَيْتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ فَإِنْ حَاجُوكُمْ فَقْلُ
أَسْلَمُتُ وَسُجْنِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِّ ۝﴾ (۳/آل عمران: ۱۹، ۲۰)

”بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ، جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر اے پیغمبر ای پنجھ سے پھر کج بھی کریں، تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔“

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اس اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُقْرَبَيْنَ إِنَّ أَسْلَمُتُمْ ۝ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدُوا ۝ وَإِنْ تَوَكُّلَا
فَإِنَّمَا عَلَيْكُمُ الْبُلْمُ ۝ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادَ ۝﴾ (۳/آل عمران: ۲۰)

”اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکا کیا تو تجوہ پر صرف پہنچا دینا ہے

اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔“

یہود و نصاریٰ کو اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ”ہدایت نامہ“ ہے کہ وہ دین اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گز شرعاً پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آئتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے تک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ”توحید کامل“ ہے اور اس کا یہ منشاء نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس تو حید کامل کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی، یوسفی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیغمبر کاری کا مدعا ہو۔

نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سواب مثلاً ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو، اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو بر باد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخري وفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف و تصرف سے محفوظ دپاک رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی ﷺ کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گزری یہ ہے:

﴿وَقُلْ لِلّذِينَ أُولُو الْكِتَابِ وَالْأَقْبَيْنَ إِنَّمَا أُلْكِمُوا فَقْدَ اهْتَدَوْا﴾

(۲۰/آل عمران: ۳)

”اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے، تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔“

سورہ بقرہ میں ہے:

﴿ قُلُّوا أَمَّا بِاللّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوْتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوْتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا تُفْرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَسَخْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ أَمْتُوا بِيُثْلِ مَا أَمْنَمْتُهُ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوْلُوا فَإِنَّمَا

﴿هُمْ فِي شَفَاقٍ﴾ (۲/ البقرة: ۱۳۷، ۱۳۶)

”(اے مسلمانو)! کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترنا اور جو ابراہیم اور اسماعیل پر اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اور ان کی اولاد پر اترنا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی را پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض صد میں ہیں۔“

یہود و نصاریٰ اور اہلی کتاب کو تعلیمِ محمدی علیہم السلام کی طرف دعوت اسی ”ہدایت“ کے پانے کے لیے ہے جو اسلام یعنی انہیا کے دین ازی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاج و نجات کا ملابس اسی کے مانے پر منحصر ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ وَإِلَّا خَرَجَ هُمْ يُوقَنُونَ أُولَئِكَ

﴿عَلَى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۵، ۴/ البقرة: ۱۳۷)

”جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر)! اترنا اور جو تجھ سے پہلے اترادونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تصدیق کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الہی کو عام ہے مگر یہ غلت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیمِ محمدی علیہم السلام کو قبول کریں اور وہی نجات کا مل کے مستحق ہیں:

﴿وَرَحْمَةٌ وَسَعْةٌ كُلُّ شَيْءٍ فَسَأَلْتَهُمَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَلَيَوْمَنَ الزَّلْكَةِ وَالَّذِينَ هُمْ يُلْتَمِسُونَ إِلَّا لِلَّذِينَ يَتَّقَعُونَ الرَّسُولُ الْأَعْلَى الَّذِي يَجِدُونَهُ مَلْكُوْنَا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا مُنْكِرَهُمْ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُهُمْ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَ وَيَنْهَا عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّزُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا التُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَيِّعاً لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُنْهِي وَيُبَيِّنِي سَفَّارِيْنَ يَا إِنَّمَا وَرَسُولُهُ الْأَعْلَى الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَالْيَوْمَةَ لَعَلَّكُمْ تَهَتَّلُونَ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۸-۱۵۶)

”اور میری رحمت ہر چیز کو سامائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا

ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جوان پر پڑی تھیں اتنا رکھتا ہے تو جنہوں نے اس پیغام برکو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اُتری وہی کامیاب ہیں کہہ دے (ای پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی جلتا اور وہی مارتا ہے سوال اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رسال رسول پر ایمان لا و جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کر دتا کہ تم سیدھی را پاؤ۔“

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحیفہ الہی کی پیشین گویوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھرناکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی ختنیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں اور نیز آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مجموعت ہوئے، اس لیے ہدایت نامہ نبوت عموی اور نجات کامل اور فلاح عام اب صرف وحی محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازی جو ہر مذہب کا جو ہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے بر باد ہو گیا تھا اسی کو صحیفہ محمدی ﷺ لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحیفہ الہی پر مبنیں اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیل دین، قرآن کا نہیں ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختم نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں:

تکمیل دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دین الہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و منائع و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہہ گا۔“ (استثناء ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں

اللّٰهُ تَعَالٰی خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا:

”لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باقیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا۔“ (یونہا ۱۲۶)

”اور وہ فارقلیط (احمد) آ کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور و ارٹھبرائے گا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے کی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔“ (یونہا ۸-۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناقابلہ ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تتمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم علیہ السلام آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے مائدہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور سچ کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آیا ہوں، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اور پر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الہی نے آپ علیہ السلام کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:

﴿الْيَوْمَ أَكْلَمْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَمْمَتُ عَلَيْنُّمْ نَعْمَانِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(۵/ المائدۃ: ۳)

”آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کروی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔“

اسی تتمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام جوان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے۔ بدلت کرایے مناسب اور آسان احکام نازل کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیش گوئی نہیں کی، نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تتمیل کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿وَمَا آنِزَلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (جو محمد علیہ السلام سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن وہ میں آنِزَلَ مِنْ بَعْدِكَ کے دیکھو آیت: ﴿كُلُّ الطَّعَامٍ كَانَ حَلَالٌ لِّتُبْرِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ﴾ الآلہ (۳/ آل عمران: ۹۳)

قبول کرنے کا کہیں شاید بھی نہیں۔

قرآن مجید کتب ہے

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدقہ ہے:

﴿مُصَدِّقًا لِّيَابِيْنَ يَدِيْهِ﴾ (۵ / المائدة: ۴۸)

”اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔“

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتون اور تعلیمیوں پر مشتمل ہے، اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتون اور تعلیمیوں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرا صحیفہ کو حاصل نہیں۔ فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّيَابِيْنَ يَدِيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَمَّهُمَا عَيْنِهِ﴾

(۴ / المائدة: ۴۸)

”اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب انتاری جو اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔“

لفظ ”مہمکن“ کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: شاہد اور امین، قرآن اپنے سے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قادة رضی اللہ عنہم: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں، قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتون اور پچھلی تعلیمیوں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن حفظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفہ الہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تربیتی نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کرنے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر ہوئی پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو گئی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر متترجموں کی کتری بیوں نے حقیقت مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا اور اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا، کھچا رہ گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو داگی اور آخی نذر ہب بنانے کرنے کی بھیجا تھا اسی بناء پر ان کی واگنی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور حفظ رہے گا اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور پھر کس وثوق سے فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الْذِيْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۹)

”ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتنا اور بے شہہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔“

یہ وعدہ الہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرا یا گیا ہے:

﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمِيعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأَنَهُ فَإِنَّهُ قُرْآنٌ عَلَيْنَا يَعْلَمُ إِنَّمَا يَعْلَمُهُ مَنْ أَنْزَلَهُ﴾

(۱۹-۲۰ / القیامۃ: ۱۶)

”بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شہہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔“

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خداۓ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ ایک تیری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَكَلِبٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ طَنَزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾

(۴۱ / ختم السجدة: ۴۱، ۴۲)

”اور بے شک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اتراء۔“

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لیے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔ یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور سازھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت

مقدمات بالا کا تجھے گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وہی محمدی ﷺ کے بعد نہ ہے جو شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ وہیں کامل اور صحیفہ الہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت رب انبیٰ کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں۔ زمین کے کوئے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغله عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور

صادق مانے کا دلوں آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدث ادیان اور دین اسلام

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا نہ ہے رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے گزٹا رہا، اسی دین از لی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آ جائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ ہی دین از لی ہو گا جس کا نام ”اسلام“ ہے اور نوحی اور ابراہیمی اور موسیٰ، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لیے فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنَأُوا الْكِتَابَ إِنَّمَا يَنْزَلُنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ فِيمَنْ قَاتَلَ أَنْ ظَفَّمَ وُجُوهًا فَتَرَدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلَعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَاهُ أَصْحَابُ السَّبِّطَةِ﴾ (٤٧: النساء)

”اے وہ لوگو! جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم پھر وہ کو گاڑ دیں اور ان کو پھیکی طرف پھیر دیں یا سبت کے گناہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں، اس وجہ پر ایمان لاو جو ہم نے اب اتاری، قرآن (جو) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں، تصدیق کرتی ہے۔“

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لیے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

﴿وَأَمْنَأُوا يَمَّا آنِزلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَنْزَلُوا أَكْلَانَ كَافِرِيهِ﴾

(٤١: البقرة)

”اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو چاہتا تھا ہے، اس پر ایمان لاو اور تم ہی پہلے کافرنہ بنو،“

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَمْنَأُوا يَمَّا آنِزلَ اللَّهُ قَالُوا تُؤْمِنُ بِيَمَّا آنِزلَ عَيْنَتَ وَيَكْفُرُونَ بِيَمَّا أُرْأَءَةَ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (٩١: البقرة)

”اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاو تو جواب دیا کہ جو ہم پر اتنا ہم اس کو مانتے ہیں اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے

پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔“

اس کے برخلاف محدث رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام الگی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر کھنگتی گئی، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے سلماں ہونے کے لیے صرف بھی نہیں فرمایا کہ وہ تھا آپ کی نبوت پر ایمان لائے، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم طبق آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے، سورہ سبامیں ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ رَبَّنَا مَنْ يَهْدِ إِلَّا قُرْأَنُنَا وَلَا يَالَّذِي بَيْنَ يَدَيْنَا طَ﴾ (۲۱: سبا)

”اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے الگی کتاب (یعنی تورات) پر۔“

اور اسی لیے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ ”جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ ابن مریم ﷺ کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔“ ❶ الغرض وہ ازلی وابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیاء ﷺ اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے، یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ كُلُّنَا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَأَعْمَلُوا صَالِحَاتٍ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلَيْمٌ وَإِنِّي هُدَىٰ أَمْتَّمُ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونَ ﴾ فَتَقَطَّعُوا أَمْرُهُمْ بِنِعْمَهِ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فِرِحُونَ ﴾﴾ (۲۳: المؤمنون: ۵۱-۵۳)

”اے پیغمبر و استھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں نکڑے نکڑے کرڈا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔“

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی:

﴿الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لَعَلَّاتٍ، أَمْهَاتُهُمْ شَتَّىٰ وَدِينُهُمْ وَّاحِدٌ﴾ ❷

”تمام انبیاء میں بھائی ہیں، جن کا باپ ایک ہے اور ماں میں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔“

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلِوا... ۳۴۳۵۔

❷ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قوله: وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْیَمَ... ۳۴۴۳۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَإِلَيْهِ الْأُخْرِ﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۷) ﴿وَإِلَيْهِ الْأُخْرَةُ هُمُّ يُوقَنُونَ﴾ (۲/ البقرة: ۲)

(۴/ البقرة: ۴)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی: * ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یا ب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَإِلَيْهِ الْأُخْرَةُ هُمُّ يُوقَنُونَ﴾ (۲/ البقرة: ۴) ”اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“

﴿مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۹/ التوبہ: ۱۸)

”جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے۔“

﴿الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۹/ التوبہ: ۴۵) (۲/ البقرہ: ۱۷۷)

”جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔“

”آخرہ“ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کردیتے ہیں، مثلاً: ”دنیا“ کے لفظی معنی ”قریب ترین“ کے ہیں اور یہ صفت ہے، اس کا موصوف الحیاة (زندگی) یا الدار (گھر) ہے، اس لیے الدنیا کا مفہوم الحیاة الدُّنْیَا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدَّارُ الدُّنْیَا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الآخر اور الآخرة کا مفہوم الْيَوْمُ الْآخِرُ وَالْحَيَاةُ الْآخِرَةُ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سوتیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محدود ف موصوف حیاة (زندگی) یادار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منكشف ہوگی:

﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِ الْحَيَاةُ﴾ (۶۴/ العنكبوت: ۲۹)

”بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔“

﴿وَلَلَّدَارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ﴾ (۶/ الانعام: ۳۲)

”اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔“

ان دونوں آتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿أَرْضِيُّمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (۹/ التوبہ: ۳۸)

”کیا پچھلی زندگی کو جھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر قسم راضی ہو گئے۔“

* قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں یہ آخرت پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءَ الْآخِرَةِ وَأَنْزَلْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَا﴾

(٣٣) / المؤمنون:

”جنہوں نے انکار کیا اور پھیلی زندگی کی ملاقات کو جھٹالایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔“

ان آئین میں الحیات الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے، کہ الآخرۃ سے مراد الحیات الآخرۃ یعنی پھیلی زندگی ہے۔ اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر حشر و شر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیح سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿يَقِيتُ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنَوْا بِالْقُولِ التَّالِيِّ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (٤/ ابراهیم: ٢٧)

”جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس کی کپی بات کلمہ تو حید پر مضبوط رکھے گا۔“

اس آیت میں ”آخرت سے مراد عالم برزخ“ ہے اور قرآن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولی ثابت پر قائم رہنا کوئی بڑی بات ہو گی، جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہو گی۔ اس لیے اس آیت میں ”آخرۃ“ سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، ایک اور حدیث میں تصریح یا بیان ہے کہ ”قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔“

یوم آخر اور حیات آخرا بیان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآن پاک میں ایمان بالله کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائیٰ بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ دیوار اور آخرت کا مقابلہ قرآن پاک کی بے شمار آئین میں نہ کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے: ﴿وَجِئْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (آل عمران: ٤٥) ”دنیا اور آخرت میں معزز“ سلسلہ دعائیں ہے:

﴿وَرَبَّنَا إِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ﴾ (٢/ البقرة: ٢٠١)

”پروردگار ہم کو دنیا میں تسلی اور آخرت میں تسلی دے۔“ کفار کے باطل ان عمل کے ذکر میں ہے:

﴿لَمْ يَحْكُمْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (٢/ البقرة: ٢١٧) ”ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔“

﴿لَا يُحِلُّ لِلْجِنَّةِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ﴾ (١٦/ النحل: ١٠٧) ”جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔“

﴿تَحْمَنُ أَوْلَيَ الْكَلْمَفِي الْحَسْوَةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (٤١/ حم السجدۃ: ٣١)

”ہم تمہاری تربیت کی زندگی اور پھیلی زندگی کے دوست ہیں۔“

اور کسی دنیا کے بجائے ”اول“، ”پہلی زندگی“ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا:

﴿فَأَفَلَمْ يَرَهُ اللَّهُ نَكَانَ الْآخِرَةُ وَالْأُولَى﴾ (٧٩/ النازعات: ٢٥) ”تو خدا نے اس کو پھیلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بیانی۔“

﴿وَإِنَّ لَنَا لِلْآخِرَةِ وَالْأُولَى﴾ (٩٢/ الطیل: ١٣) ”اور ہمارے ہی لیے ہے، پھیلی اور پہلی زندگی۔“

ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی فضاعة القبر: ٢٣٠: ٨؛ ابن ماجہ، ابواب الزهد، بباب القبر والبلی:

- ٤٢٦٧: مسنند احمد، ج ١، ص: ٦٣؛ کنز العمال، ج ٨، ص: ٩٥ -

ریشہ شیخ بن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو معین تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسری قیامت سے لے کر اباد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت و فنا نہیں، پہلے دور کا نام ”برزخ“ اور دوسرے کا نام ”بعث“ یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی اُٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمه کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں «الدّارُ الْآخِرَةُ» اور «عُقْبَى الدّارِ» وغیرہ ہے۔ جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراة و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گھنک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدان قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں شخص موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلہ خلق کے خاتمه پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوگی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور عظیل ہوگی، چنانچہ سورہ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے:

﴿سَنَعْذِيْهُمْ مَرَّتَيْنِ تُعَذِّيْدُوْنَ إِلَى عَذَابِ عَظِيْمٍ﴾ (١٠١: التوبۃ)

”ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

آن تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (ماہہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسخرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس ماہی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت ولذت کا اس ماہی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہو گا، لیکن اس تیرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

”برزخ“ کا الفاظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورہ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بینے میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا:

﴿يَنْهَا بَرْزَخٌ لَا يَفْعَلُونَ﴾ (۵۵ / الرحمن: ۲۰)

”ان دونوں کے بینے میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔“
اسی عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورہ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:
 ﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَّأَمِنَّا بَرْزَخَ هَذَا عَذَابُ فُرُّكَ وَهَذَا فِتْنَمُ أَجَاجٍ وَجَعَلَ يَنْهَا بَرْزَخًا وَجَعَلَ مَنْجُورًا﴾ (۲۵ / الفرقان: ۵۳)

”اور اسی نے دو دریاؤں کو ملائے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بینے میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔“
اسی بناء پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ”برزخ“ ہے سورہ المؤمنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿وَمِنْ وَرَأَهُمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ الْيَقْوُونَ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۱۰۰)

”اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔“

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشابہات کی بناء پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ”قبر“ ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قبر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا:

﴿وَأَنَّ اللَّهَ يَعْنَثُ مَنْ فِي الْقُبورِ﴾ (۲۲ / حج: ۷)

”بے شب اللہ ان کو جو قبروں میں میں اٹھائے گا۔“

اب ظاہر ہے کہ یہ ”بعث“ صرف انہی مددوں کے لیے مخصوص نہیں جو تو وہ خاک کے اندر رہن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگد حاصل کی۔

موت و حیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دو زخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:
 ﴿قَالُوا رَبِّنَا أَمْتَنَا الشَّنَعَيْنِ وَأَحْيَنَا النَّتَّعَيْنِ فَأَعْتَرَ فَتَأَبَدُّلُ نُوَيْنَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (۵۰)

(٤٠) المؤمن: (١١)

”ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دفعہ مارا اور دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔“

ان دعوتوں اور دعیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے:

﴿كَيْفَ تُكَفِّرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ آمَّاً فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ مُمْتَنَعْتُمْ ثُمَّ حَيَّيْكُمْ لَمَّا إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

(٢٨) البقرة:

”کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا، انسان بن کر پیدا کیا تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یا اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۝ لَمَّا أَنْتُمْ مُّيَمَّوْمَ الْقِيمَةَ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِّمُونَ ﴾

(٣٩) الزمر:

”بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔“

﴿لَمَّا أَنْتُمْ مُّيَمَّوْمَ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَّا يُنْذَلُونَ ۝ لَمَّا أَنْتُمْ يَوْمَ الْقِيمَةِ تَبْعَثُونَ ﴾

(٢٢) المؤمنون: (١٦، ١٥)

”پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن انھائے جاؤ گے۔“

اب سوال یہ ہے کہ بزرخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لیے ایک مختصری تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک اور اس و احساس کا اور دوسرے تدبیر و تغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات اور اک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردش کی مادی دنیا سے یک سر بیگانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیر ویں اور دل و ماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذار سائی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری

تعلق ہے اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزاء اپنے دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی سبی مشابہت ہے جس کی بنابر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشیید دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے
قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَوْقِلُكُمْ بِالْيَوْمِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ إِنَّ اللَّهَ إِلَّا ثُمَّ يَعْلَمُ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ
مُّسَيَّٰ﴾ (۶۰/الانعام)

”اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔“

اس سے زیادہ تفصیل سورہ زمر میں ہے:

﴿أَللَّهُ يَتَوَفَّ الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَإِمْسِكُ الَّتِي قُضِيَ عَلَيْهَا
الْمَوْتَ وَوَرِسِلُ الْآخِرَىٰ إِلَى أَجَلٍ مُّسَيَّٰ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيَّةً لِّقَوْمٍ يَتَغَلَّبُونَ ۝﴾ (۴۲/ الزمر)

(۴۲/ الزمر)

”وَهُوَ اللَّهُ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نبیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے پیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے شانیاں ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی ”برزخ“ کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گناہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہو گا:

﴿قَالُوا يَوْمَئِنَّا مَنْ يَعْشَأْ مِنْ مَرْقُومِنَا﴾ (۳۶/ یس: ۵۲)

”اے ہماری خرابی! کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔“

غزوہ احمد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت میں نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو تکل کر اپنے مقلد میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

﴿فَلَمْ يُكُنْتُمْ فِي يَوْمَكُمْ لَبِرْزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ﴾

(۱۵۴/آل عمران)

”کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی بجھوں میں چلے آتے۔“

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر لفظ ”بعث“ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں ॥ جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَ حُثُمٌ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَعْلَمُ فِيهِ﴾

(الانعام: ٦٠)

”اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔“

﴿وَأَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَنْ فِي الْقُبورِ﴾ (الحج: ٢٢)

”اور بے شک اللدان کو جو قبروں میں ہیں، جگا لے گا۔“

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ((نَسْمٌ كَنَوْمَةٌ
الْعُرُوضِ)) ”ذہن کی نیند سجاوے“ جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ ॥

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل
عمیق نیند کے مشاہد ہے۔
خواب میں لذت والم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادر اک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادر اک و احساس کی تجھیلی، تہشیل یا یافہ دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متسلک ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم کو دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگلیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد، رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں

صحيح بخاری، کتاب التہجد، باب تحریض النبی ﷺ علی قیام اللیل: ۱۱۲۷ میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تجد کے لیے اس وقت تک بیدار رہنے پر سوال فرمایا تو حضرت مدوح نے ان لفظوں میں مفردات پیش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ افسنا بیداللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا۔ ”تماری روحس خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگنا چاہتا ہے جگتا ہے۔“ اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔ ॥ جامع ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء عن عذاب القبر: ۱۰۷۱ حدیث حسن غریب۔ ॥ شاولی اللہ صاحب جو اللہ الباقي میں لکھتے ہیں: فهذا المبتلى فی الرؤيا غير انها رؤيا لا يقطنة منها الى يوم القيمة۔ (باب اختلاف احوال الناس في البرزخ، ج ۱، ص: ۲۷) یعنی ”یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یا یا خواب ہے جس سے قیامت تک جا گئیں ہے۔“

تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ امتحنا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جانے کے بعد بھی نظر آتے ہیں غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی، شادی و رنج اور لذت والم میں فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی بیداری والی لذت و تکلیف احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہوتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذت اندو آلام کے مختلف مناظر کے حقائق اور اسباب و عمل پر اگر فالسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراس باری سے آزادی کے بعد سامنے جسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوز معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظت سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتی، بلکہ دماغی جگہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لیے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم و مفقود نہیں ہو گئی۔

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے، جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمت کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ سیاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے صاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت (سات) سالہ قحط سالی کو سات دلی گایوں کی صورت میں دیکھا۔ *
آنحضرت علیہ السلام نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سرمنڈڑائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلہ اور اسود غصی دو کذا بیوں کو سونے کے دو گنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے احمد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان سو، کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو دوں کھینچنے کی اور حضرت عمر بن الخطابؓ کے علم کو دو دھکی اور ان کی دیداری کو لمبی لمبی میں دیکھا۔ * ان کے علاوہ ہر شخص

* یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دیکھئے سورہ الصافہ و سورہ یوسف۔

** ان خوابوں کو صحیح بخاری، کتاب التعبیر: ۷۰۰۷، ۷۰۳۵، ۷۰۳۷، ۷۰۴۸، ۷۰۰۸، ۷۰۳۹، ۷۰۴۷، میں دیکھو۔

کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب جسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً: اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی صورتیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں جسم اور مشکل ہو کر دلکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قلب میں جسم ہو جاتے ہیں اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہو گا کہ وہ مردار کھار ہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بجل کا اثر دھا ان کی حفاظت میں بھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردان میں لپٹتا اور کافٹا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک برصیا کی شکل میں نظر آتی۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً: غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿وَلَا يَعْتَبَرُ بِعَصْمَكُهُ بِعَصْمَأَيْمَنٍ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ حَمَّأً أَخِيهُ مِنْتَأْكِلَهُمْ مَوْهِمٌ﴾

(۴۹) الحجرات: ۱۲)

”اور پیٹھے پیچھے ایک دوسرے کو برانہ کہے، کیا تم میں سے کوئی پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوئی نوج نوج کر کرھائے سو گھن آئی تم کو۔“

اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبُولَا يَقُولُونَ إِلَّا كُمَا يَقُولُ الَّذِي يَتَعَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَيْتِ﴾

(۲۷۵) البقرة: ۲)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں۔“

تیمیوں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنा فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِلَيْهَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَأْصَلُونَ سَعْيَهُمْ﴾

(۱۰) النساء: ۴)

”وہ لوگ جو تیمیوں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے بیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی

*) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ عاصیہ ذکر برزخ، ج ۱، ص: ۲۷۔

*) صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء: ۳۴۹۔

آگ میں داخل ہوں گے۔“

وَخُودُغُرُضُ اُوْگُ جو بیکوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غربیوں کے درگر شنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل پکیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے دوزخ میں ان کو زخموں کا دھون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

﴿إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَلَا يَحْصُّ عَلٰى طَعَامِ الْمُسْكِنِينَ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَّا حَمِيمٌ وَلَا طَعَامٌ لِأَمِنٍ غُشْلِينَ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْفَاطِنُ﴾

(الحاقة: ۳۲-۳۳) (۶۹)

”بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے سوا کوئی کھانا ہے، اس کو وہی گناہ گار کھائیں گے۔“

بلوٹ مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سربراہ شاداب باغ سے دی:

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْقِضُونَ أَمْوَالَهُمْ أَيْتَهُمْ مَرْضَاتٍ اللّٰهُ وَتَعْلِيمًا قُنْ أَنْفُسِهِمْ كُمْثُلٌ جَنَّةٌ بِرْبَوْةٌ﴾

(۲/ البقرة: ۲۶۵)

”اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہئے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک میلہ پر ہے۔“

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مر جانے والوں کو جان نو اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی فرمایا:

﴿وَلَا تَنْهُوُنَّ الْمُنْ يَقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٍ طَبَلٌ أَحْياءً﴾

(۱۵۴) (۲/ البقرة)

”جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں۔“

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا۔ جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوچی کرے گا اللہ اس کی ستاری کرے گا۔ قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا اور سزا کے ذکر سے لمبڑی ہیں۔

جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، ان کی نسبت فرمایا:

﴿سَيْطَوْقُونَ مَا يَجْلُوْيْهِ يَوْمَ الْقِيْمَةِ﴾

(۱۸۰: ۳) (آل عمران: ۱۸۰)

”جس مال کا جنل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔“

﴿يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتَكُوْيِ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجَنُوْبُهُمْ وَظَهُورُهُمْ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا فِيْسِكُمْ قَدْ وَقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِوْنَ﴾

(۳۵) (التوبۃ: ۳۵)

”جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان کی

پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ کھاتا تاوب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔“

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نایابی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكاً وَمَخْسُرَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْلَىٰ ۝ قَالَ رَبِّي لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْلَىٰ وَقَدْ كُنْتَ بِيَسِيرًا ۝ قَالَ كَذَلِكَ أَتَشَكَّ أَيْتَنَا فَنِسِيتَنَا ۝ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُؤْتَىٰ ۝﴾ (۱۲۶، ۱۲۴ طہ)

”اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیے شگرداں اور ہم قیامت کے دن اس کو انداھا انھائیں گے وہ کہے گا، میرے پروردگار! تو نے مجھے انداھا بنا کر کیوں انھیا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ خدا کہے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلا جائے گا۔“

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْلَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْلَىٰ وَأَضَلُّ سَيِّلًا ۝﴾

(۱۷/ بنی اسرائیل: ۷۲)

”جو کوئی دنیا میں (دل کا) انداھا تھا وہ آخرت میں انداھا ہے اور استہ سے بہت بھٹکا ہوا۔“

اس باب میں سب سے زیادہ صرتیح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا: قال رسول الله ﷺ ((من اتاه اللہ مالا فلم يؤذ زكاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبستان يطوقه يوم القيمة ياخذ بالهز متىه اي شدقىه يقول انا مالك انا كنترک))

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو چھل کر ڈینے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا، جس کا سرزہ ہر کی شدت سے گنجایا ہوگا اور اس کے منہ میں دودانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہو گا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا، میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خانہ۔“

بخاری، کتاب التفسیر، باب ولا يحسين الذين يدخلون بما: ...: ۴۵۶۵

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنایاں کیا گیا ہے، مثلاً نیک کرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر دانے بائیں سے نمودار ہوں گے یعنی یہ بھی حدیث میں ہے کہ ”مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ عَنِ الدُّنْيَا وَالْآفَاتِ بِهَا يَنْهِي مَرْدُومَيْلَانَ اس تھگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔“ یہ ظاہر ہے کہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ در حقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مشابی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزا میں

لما ہوں یہ مری یعنی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ اوپر کے بیانات سے ہو یاد ہے کہ غیر جسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیل مشاہدہ رکھتے ہیں، مثلاً: ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہرہ ہی ہے اور جب اس کا ذکر حضرت علیہ السلام سے کیا تو آپ علیہ السلام نے اس کی تعبیر میں فرمایا: (ذلک عملہ) ﴿ یہ نہر، ان کا (ایک عمل ہے۔ ﴾

(ذلک عملہ) یہاں انہیں کہ قیامت کا نہیں کہ اس تہذید کے بعد آنحضرت علیہ السلام کے اس روایائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ بزرگ ہی کا مرتع پیش کرتا ہے جواب بھی قائم ہے، آپ علیہ السلام نے ایک صحیح کو فرمایا: ”رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پھر لیے کھڑا ہے اور وہ اس پھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پھر لا حکم لگاتا ہے وہ اس کے پیچے جا کر اس کو اٹھالا تا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اونڈھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکھ لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نہیں کو پھر آنکھوں کو لگدی تک چیڑalta ہے پہلے ایک طرف بعد ازاں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دیکھ رہی ہے اور پچھے مردا اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پھر رکھے ہیں، وہ تیر نے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پھر اٹھا کر اس زور سے

^{٤٢٧٢} سنن ابن ماجه، أبواب الرزق، باب ذكر القبر والبلى: ٣٥٢.

³ محدث مسلم بن حجاج ، كتاب التعبير ، باب رفيا النساء : ٤٧٠٠ .

مارتا ہے کہ وہ پھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سر بزرگ شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کل کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہ یوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھانک پر پہنچ دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گئے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بد صورت تھا میرے ہمراہ یوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو پیچ میں نہایت صاف و شفاف بہرہ تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بد صورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہ یوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ”جنت عدن“ ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر انہا کر دیکھا، پسید لکھ ایر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔ پھر میں نے ان ہمراہ یوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پھر سے کچلا جا رہا تھا وہ جو قرآن پڑھ کر اس کی قسمیت سے انکار کرتا ہے اور صحیح کی مفرد و ضم نماز سے غافل ہو کر سور ہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے پھر سے اور نہیں اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تور میں جو مراد اور عورتیں نہیں جل رہی تھیں، وہ بدکار مردا اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا وہ منہ سے پھر لگتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم عليه السلام تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ کہنے پہنچے جو فطرت پر مرے تھے۔ کسی صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ”اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بد صورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔“

برخ کی ان تمام سزاویں پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نماز صحیح سے غافل ہو کر بالین راحت سے سرہ انھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا پھر اپھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جانا، خون چو سنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا اپنا دوالا شست کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پھر کے لئے کھانا، سر اسران کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوئے عمل سے آدھے دھڑ کی بد صورتی پوری مشابہ ہے اور

❶ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعیر الرؤيا بعد صلوٰۃ الصبح: ۴۷، ۴۸۔

صف و شفاف نہ کی صورت میں رحمت و مغفرت الہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔ ۱۰۱ ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ”آفاتی“ یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیاء کے خواص و صفات کے جانے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے نفس کہا ہے ان نفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے۔ ہماری سایہ کا لو جی علم نفس ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اس پر پچھلے ملزم (علم ارواح) ابھی طسم و فریب کے عجائب میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنسک تحریر بے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے بہر حال ابھی تک علم نفس و روح کے عجائب پر پڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک سیہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معاہدہ ہے بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفہ برلن کے نزد یہک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کر ڈھنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔ بہر حال نفسِ انسانی کے اندر رونی قوی کا علم گواہی بہت کچھ تھانج متمکل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت سا شدید تعلق ہے، سکریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہو گا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم یقین اور عین یقین۔ کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علمتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کرو، تو یہ علم یقین (یقین جانا) ہے اور اگر وہ شے خود تہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین یقین (خود یقین) ہے۔ قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا ہے:

﴿أَلْهِكُمُ التَّكَاثُرُ ۚ حَتَّىٰ زُرْمُ الْمَقَابِرِ ۖ كَلَّا سُوقٌ تَعْلَمُونَ ۗ ثُمَّ كَلَّا سُوقٌ تَعْلَمُونَ ۗ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۗ لَتَرَوْنَ الْجَحِيمَ ۗ ثُمَّ لَتَرَوْهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۗ﴾

(۱۰۲ / التکاثر)

”تم کو دولت و نعمت کی بہتان نے غفلت میں بٹلا کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جادیکھا ابھی نہیں تم آگے جان لو گے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لو گے ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جانا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین یقین سے اس کو دیکھ لو گے۔“

ہنابریں اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرے جو کمالی ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی

* حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ ہبھی ذکر واقعات حشر، ج ۱، ص: ۲۸، ۲۹۔

آنکھوں سے اپنی دوزخ نہیں دیکھ لے:

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوْنَ الْجَحِيْمَ﴾ (١٠٢ / التکاثر: ٦٥)

”نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو بے شہر دکھلو گے۔“

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کافوری مطالہ کرتے تھے وہی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

﴿يَسْتَعِيلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَجُيْنَةً بِالْكُفَّارِ﴾ (٥٤ / العنكبوت: ٢٩)

”وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ کو گھیر رہی ہے منکروں کو۔“

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ذر سے جہاد کی شرکت سے غدر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان میں سے فرمایا گیا کہ وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ إِنَّنِي لَوْ لَتَقْتَلُنِي لَوْ لَأَتَقْتَلُ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَجُيْنَةً بِالْكُفَّارِ﴾ (٩ / التوبہ: ٤٩)

”اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔“

لیکن یہ علم یقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ درنہیں ہوتا بلکہ باہمیتے اس کے منکر ہیں اس لیے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ جواب جو آنکھوں پر پڑا ہے، انھوں جائے گا اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی متأنج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظران کے سامنے آ جائیں گے اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر و اتعابات کا مشاہدہ کر لیں گے:

﴿لَمْ يَرَهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ﴾ (١٠٢ / التکاثر: ٧)

”پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لو گے۔“

یہ موت کے بعد کامان ہو گا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا:

﴿يَوْمَ تُبَيَّنُ السَّرَّاَبُوْرُ﴾ (٨٦ / الطارق: ٩) ”جس دن تمام بھید کھل جائیں گے۔“

اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آ جائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شابہ بھی باقی نہ رہے گا وہ علم حقيقة اور یقین تحقیقی کا دن ہو گا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمُ الْوَعْدِ۝ وَجَاءُتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِنٌ وَّشَهِيدٌ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ قَنْ هَذَا فَلَكَ شَفَاعَةٌ عَنْكَ غُطَّاءُكَ فَبِصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (۵۰/۲۰-۲۲)

”اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ذر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پرده تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔“

اس پرده کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی، فرمایا:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الطَّائِمَةُ الْكَبِيرِيَّةُ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ وَبِرْزَكُهُ لِمَنْ يَرِيَّهُ﴾ (۳۴-۳۶/ النازعات: ۷۹)

”جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لا جائے گی۔“

حوال برزخ کا عین الیقین

ایک طرف شاعر (ابوالغافریہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:
الموت باب وكل الناس داخله یلیت شعری بعد الباب ما الدار
”موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا
کہ اس دروازہ کے بعد کون سا گھر ہے۔“

یہ علم جس کی حضرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہو گا تو اس کو اس پرده کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلَّقَ أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكَتُ
كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَالِهَا وَهُنَّ وَرَأَيْهُمْ بَرَزَخٌ إِلَيْهِمْ بَيْعَوْنَ﴾ (۹۹/۱۰۰)

”جب ان گناہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پرده کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کامے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے، تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی یہ کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور اب ان گناہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پرده (برزخ) ہے جب وہ موت

* الانوار الزاهية في ديوان ابى العتاهية، ص: ۹۶۔

کے بستر سے جا کر اٹھائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی، تو اس کا شک و شبہ دفعہ یقین سے کیسے بد جاتا ہے فرمایا:

﴿وَجَاءَكُمْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِيقَةِ طَلِيكَ مَا لَنْتَ مِنْهُ تَعْيِيدٌ﴾ (۱۹۰/ق:۵۰)

”اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آگئی ہی ہے وہ جس سے تو ہنا کرتا تھا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ”حقیقت“ کا کوئی مظہر سامنے ضرور آ جاتا ہے، اہل تفسیر نبھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، این جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الآخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه۔

”حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔“

حافظ ابن کثیر رض محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عزوجل وجاءت ايهـا الانسان سكرة الموت بالحق اي كشفـت لك عن اليقين الذي كنت تمترى فيهـ

”الله تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان اموت کی بے ہوشی حق کو لے کر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پرده کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔“
قاضی شوکانی رض محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ما جاءت به الرسل من الاخبار بالبعث وال وعد والوعيد۔
”اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزا اوسرا کی خبریں لے کر آئے تھے۔ ان کی صحائی ہو یہاں جو جاتی ہے۔“
مفتوح آلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر (ج ۲۶، ص: ۱۶۵) کی عبارت یہ ہے:

والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقـت به كتب الله تعالى ورسله عليهم السلام۔

”اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مد ہوشی اس حقیقت امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔“

١ تفسیر ابن جریر، طبری، ج ۲۶، ص: ۹۱۔ ٢ تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان، ج ۹، ص: ۲۹۸۔

٣ تفسیر شوکانی، ج ۵، ص: ۷۳۔

رختری معززی کی تفسیر (کشاف ج ۲۲ ص ۱۳۰۲، ملکتہ) اور ابو حیان اندرسی مالکی کی تفسیر (خرمیط ج ۸ ص ۱۲۳ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

﴿فَكَلَّفْنَا عَنْكَ غَطَّاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (۵۰/ق: ۲۲)

”ہم نے آج تھے سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر ”خدا کی طرف بازگشت“ یعنی اللہ کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح

اختیار کی گئی ہے:

﴿فُلَّ أَنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَغْرِبُونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيْكُمْ نَّمَّأُرْدُونَ إِلَى عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

فَيُنَتَّسِّكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۶۲/ الجمعة: ۸)

”کہہ دو بیٹک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جانے والا ہے۔ تو وہ تم کو تھارے کرتا تھا۔“

﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَجَعْنُونَ﴾ (۱۵۶/ البقرة: ۲)

”ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔“

﴿إِلَى اللَّهِ مَرْجَعُكُمْ جَمِيعًا﴾ (۱۰۵/ المائدہ: ۵)

”تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

یہ طرز ادبی میں آیات میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیکی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادراہ صرف وہی ہو گا جو اس دنیا کے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندر ورنی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جزو نہیں ہو گی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہو گی:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَوْمَ قُرْبَكُمْ بِإِلَيْلٍ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالْهَمَرِ ثُمَّ يَعْلَمُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَى أَجَلُهُ

مَسْمَىٰ لِمَالِيْهِ مِنْ جَعْلُمْ ثُمَّ يُتَسْكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦﴾ (٦ / الانعام: ٦٠)

”اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کماچے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتابے گا۔“

ایک اور آیت میں ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا مَغَيَّبَكُمْ عَلَى أَفْسِرَكُمْ لَا مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَمْ يَأْتِنَا مِنْ جَعْلُمْ فَنُتَسْكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥﴾ (٥ / یونس: ٢٣)

”اے انسانو! تمہاری بغادت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتابیں گے۔“

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف والپس آجائے کی اطلاع دی ہے اور اہل تغیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبیر جلد ااص ۲۳ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گناہگاروں کی رو حسین موت کے بعد ہنکا کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

﴿كَلَّا إِذَا بَلَقْتُ التَّرَاقَةَ وَقَيْلَ مَنْ رَأَيَ وَكَلَّا إِذَا الْفَرَاقَ وَالنَّفَقَ السَّاقِ بِالسَّاقِ إِلَى رَيْلَكَ يَوْمَيْذِ الْمَسَاقِ﴾ (٣٠ - ٢٧ / القیامۃ: ٧٥)

”ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسی) تک آپنچھ اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھوک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدا کیا کا وقت آگیا اور پنڈلی سے پنڈلی پٹ گئی اس دن تیرے پرور دگار کی طرف ہے ہنکا جانا۔“

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفَسُ الْمُطَمِّنَةُ ارْجِعْ إِلَى رَيْلَكَ رَاضِيَةً مَرْضِيَةً﴾

(الفجر: ٢٨، ٢٧)

”اے مسلمان روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تھے سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا۔“

یہ یہی دلآ ویز صد اور کسی والپسی ہو گی۔

اس وقت کا سامان

وَلَهُمْ جَبَ اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قابل میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور شیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بوقتی چلتی سنائی دیتی ہیں:

﴿وَلَوْبَرَى إِذَا الظَّالِمُونَ فِي غَرَرِ الْمَوْتِ وَالْمَلِكَةُ يَأْسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ الْيَوْمَ هُمْ مُزَوَّنَ عَذَابَ الْهُوَنِ يَمَا لَتَمْ تَعْلَمُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرُ الْحَقِّ وَلَكُنْتُمْ عَنِ الْيَقِينِ شَكِيرُوْنَ وَلَقَدْ جَنَّمُوْنَا فَرُّادِي لَمَّا خَلَقْنَاهُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلَرُكُنُمَا حَوَّلْنَاهُمْ وَرَأَءَ ظُهُورُكُمْ﴾

(۹۳، ۹۴/ الانعام)

”اور کبھی تو دیکھیے جس وقت گناہ گار موت کی بیہوٹی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تھا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مفرودہ بنا�ا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔“

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

﴿وَلَوْ تَرَى إِذْ يَتَوَوَّلُ الظَّالِمُونَ كُفَّرُوا الْمَلِكَةُ يَضْرِبُونَ وَجْهَهُمْ وَأَدْبَرَهُمْ وَذُوْقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ وَذَلِكَ بِمَا فَدَمْتُ أَيْدِيهِمْ وَأَنَّ اللَّهَ لِيَسِ بِظَلَامٍ لِلْعَيْنِدِ﴾

(۵۰، ۵۱/ الانفال)

”اور کبھی تو دیکھیے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھوئی تھا رے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدله ہے اللہ یندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

اس سے واضح ہے کہ یہ زاموت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ نیکو کاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سامان سامنے ہوتا ہے:

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغُتُ الْحُلُومَ وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْتَظِرُونَ وَسَكُنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكُنْ لَا

تُبَصِّرُوْنَ۝ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ۝ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَدِقِيْنَ۝ فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُفَرِّيْنَ۝ فَرَوْحٌ وَرِيْحَانٌ لَهُ وَجَتْ تَعْيُّوْنَ۝ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِ۝ فَسَلَمٌ لَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِ۝ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُلْكِيْنَ الصَّالِيْنَ۝ فَنَزَلَ قِنْ حَمِيْوٌ لَهُ وَتَصْلِيْهُ جَحِيْمٌ۝ إِنَّ هَذَا اللّٰهُ وَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ۝

(٥٦-٩٥ / الواقعۃ)

”پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو تو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے پیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلانا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار و تکذیب میں پیچ ہو تو اگر وہ (مر نے والا) مقرب بندوں میں سے ہو تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہو تو تجوہ پر سلامتی داہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو گرم پانی کی مہماںی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبیہ بات یقین کے لائق ہے۔“

یہ تمام سال موت کے بعد اور عالم بزرخ ہی کے مناظر ہیں۔

بزرخ کا عذاب و راحت

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہو یاد ہے کہ روح و حُم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے رو برو عذاب کے مظفر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ مظفر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا رحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

﴿سَنَعِدُ بِهِمْ مَرَيْئِيْنَ تُمَرِّدُوْنَ إِلَى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (٩/التوبۃ)

”ہم ان کو دودو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“

﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دوران پر اور گزر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

﴿وَحَاقَ بِالْفِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ۝ أَلَّا يَرْعَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوْا وَعَشِيَّاً وَيَوْمَ نَهْرٍ

السَّاعَةِ۝ أَدْخِلُوا إِلَى فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (٤٠ / المؤمن)

”اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا آگ کا اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے

ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ پچھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریع میں گویا آنحضرت نے فرمایا ہے: ”تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیر مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے۔ * ایک اور صحیح حدیث میں ہے: ”جتنی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اپنے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیر مقام ہے * اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں اس پر سربراہی بھروسی جاتی ہے۔“ *

بشرکوں اور قیامت کے مکنروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الہی صحیح ہے تم ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے۔ جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اور پرآئوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے اس لیے ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلِكَةَ لَا يُبْشِّرُ يَوْمَيْذَ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حُجْرًا لَّكُحْجُرًا وَقَدْ مَنَّا إِلَى مَا عَلِمُوا مِنْ عَمَلٍ فَعَلَّمَهُمْ هَبَاءً مَّنْتُرَاهُ أَضْلَعُ الْجَنَّةَ يَوْمَيْذَ خَيْرٌ مُّسْتَقْرَأً وَأَحْسَنُ مَقْيِلًا وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْعَمَاءِ وَتُنَزَّلُ الْمَلِكَةُ تَنْزِيلًا الْمُلْكُ يَوْمَيْذُ الْحَقُّ لِلرَّحْمَنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكُفَّارِ عَسِيرًا﴾

(الفرقان: ۲۶-۲۷)

”جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گناہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤ نا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی پیکار بے سود معدوم) جنت والے لوگ یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے اس دن ان کے لیے خوب تھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہو گا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے

* صحیح مسلم، کتاب الجنة والنار، باب عرض مقعد الموت: ۷۲۱۱، ۷۲۱۲، جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر: ۱۰۷۲؛ حدیث حسن صحيح: صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الموت یعرض علیه مقعدہ بالغدۃ والعنی: ۱۳۷۹ و کتاب البرقاو، باب سکرات الموت: ۶۵۱۵۔ ** صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ۱۳۷۴۔ *** صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب عرض مقعد الموت: ۷۲۱۶۔

جائیں گے اس دن راج پچ خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر بخت ہوگا۔“
کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اتنا قیامت کا نقشہ ہے اب اس سے پہلے
فرشتوں کے دھائی دینے کا وہ دن جس میں گناہگاروں کے لیے خوب خبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ دراؤ نا
منظراً ہماری لگا ہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے تحقیق کو ایک اچھا مستقر قرار گا اور دوپہر کی دھوپ سے
بچانے والی خواب گاہ نی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورہ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گناہگاروں کی روحوں کو
قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَلَيْسَ إِذَا تُوقَتُهُمُ الْمَلِكَةُ يَصْرِفُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ أَتَّبَعُوا مَا أَنْهَىَ اللَّهُ وَمَنْ كَرِهُ هُوَ أَرْضُوا نَاهَةً فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷/ محمد: ۲۷، ۲۸)

”پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر بارتے
ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی بیرونی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور
جنہوں نے خدا کی خشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔“
یہ شیئی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثلی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہر حال اس سے
یہ ثابت ہے کہ گناہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔ سورہ انعام میں اس
سے زیادہ ہے:

﴿وَلَوْ تَرَى إِذَا الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَتِ الْمَوْتِ وَالْمَلِكَةُ بِإِسْطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَهُمْ أَلِيُّومَ مُبْعَزُونَ عَذَابَ الْهُوَنَ﴾ (۶/ الانعام: ۹۳)

”اور اگر تو دیکھئے جب گناہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ کالو
اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔“

الیوم جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن
سے روح نکالتے ہیں، اس ”آج“ سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۷ فرشتوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ
برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدر ی شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی) قوم نوح کے غرق
ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

﴿أَغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا لَا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ قِنْ دُونَ اللَّهِ أَنْصَارًا﴾ (۷۱/ نوح: ۲۵)

”وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے تو انہوں نے خدا کے سوامدگار نہیں پائے۔“

حضرت لوط اور حضرت نوح ﷺ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

﴿وَقَيْلٌ أَدْخَلَ النَّارَ مَعَ الدَّخْلِينَ﴾ (۶۶/ التحریم: ۱۰)

”اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔“
یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب بلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفاً کا نام ”برزخ“ ہے۔
سورہ یس میں ایک ”خیر خواہ“ قوم کا ذکر ہے جو عمر بھرا پی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت میں تو اس نے بڑی حضرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا، کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ درہ کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

﴿فَيُنَزَّلُ إِلَيْهِ الْجَنَّةُ ۚ قَالَ يَلِيقُنَتْ قَوْمِيْ يَعْلَمُونَ ۗ يَمَا غَفَرَ لِي رَبِّيْ وَجَعَلَ لِيْ مِنَ الْمُكَرَّمِيْنَ ۗ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنُدِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝﴾

(پنس: ۲۶-۲۸)

”کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا، اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا، کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فونج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔“

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

﴿بَلْ أَحْيَاهُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرِيدُونَ ۝﴾ (۱۶۹/آل عمران)

”پلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

﴿الَّذِينَ تَنَوَّقُهُمُ الْمُكَبَّلُهُ طَيَّبِيْنَ لَيَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْهِمْ أَدْخُلُوُ الْجَنَّةَ يَمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾

(۳۲/النحل)

”جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدله جنت میں چلے جاؤ۔“

قبر کی اصطلاح

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیح میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں۔ وہ عموماً قبر ^۱ کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہے۔ بعض معتزل عذاب قبر کے مقابلہ میں اس کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمیں کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قیامت قابل قیامت ارواح انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اس قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

ہوئی ہیں لیکن، اس لفظ ”قبر“ سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح و نقوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ ہمیشہ نفس اور نقوس کو خطاب کیا ہے اور انہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہبہ و خواص کے خاکی جسم کا شئی ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ وہ ہے جس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعد نہ تھا راجسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بھار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہبہ و خواص کے خاکی جسم کے مطابق ہوگا اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ لِّيَمَا كَسْبَتْ رَهِينَةٌ﴾ (۷۴/المدثر: ۳۸) یعنی ”ہر روح اور جان اپنے اعمال کے باقیوں گروہ ہوگی۔“ اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم صرف بمنزلہ الہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ یا مادیات سے پاک و بری ہوگا، تاہم اس کو اپنے خاکی جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بناء پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے:

﴿وَلَوْ تَرَى إِذْ يَتَوَقَّى الَّذِينَ لَكُفُرُوا الْمُلَكَةُ يَقْرَبُونَ وَجْهُهُمْ وَأَذْنَافُهُمْ وَذُوَّبُوْتُوْنَا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (۸/الانفال: ۵۰)

”اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جانے کا مزہ۔“

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ماران کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاش کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے شبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو۔

* اس سے اس شبیہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے، لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبیہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم گل سر جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

یہ مفہوم صاف لفظوں میں اسی آیت میں ہے:

﴿إِلَى رَيْكَ يَوْمِيذِ الْمَسَاقِ﴾ (٧٥ / القيامة: ٣٠)

”اس دن تیرے پرور دگار کی طرف ہے، ہنکایا جانا۔“

بعض ایسی سعید رو حیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ ”مومین کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔“ * اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ بزر پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قدیمیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو روایا ہے اس میں جن جسمانی قابوں میں گناہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تمثالی ہیں، ظاہر ہے کہ مومین سعید اور شہدا کے وہ مثالی قابوں اور ان گناہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قابوں واجام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں مغل نہ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوائیں اُڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزو و بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قبور کے نزدیک جومردوں کو گاڑتی ہیں اس سمیت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ذہیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جائے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ دھیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم بلا کر اس کی راکھ ہو ایں اڑادی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضرنما کیا جائے، مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو محسوس کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ *

سوال و جواب

احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔“

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

﴿الَّذِينَ تَوَفَّهُمُ الْمَلِكَةُ طَيِّبِينَ لَا يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (١٦ / النحل: ٣٢)

”جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر

* سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فيما يقال عند المريض اذا حضر: ١٤٤٩۔

** صحیح بخاری، کتاب الرفاق بباب الخوف من الله: ٦٤٨٠ - ٦٤٨١۔

سلامی ہو اپنے کاموں کے بدل جنت میں چلے جاؤ۔“

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَوْقُفُهُمُ الْمَلِكَةُ طَالِبِيْنَ أَنْفِسِهِمْ قَالُوا فَيْمَنْ كُنْتُمْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا مُسْتَضْعِفِيْنَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَمْ نَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَأَسْعَةً فَهَا جِرْوًا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَا وَهُمْ جَهَنَّمُ﴾

(النساء: ٩٧)

”بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نلک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشاہد نہ تھی کہ تم اپنا طلن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔“ ایک اور آیت ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتُهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّهُمْ لَا قَالُوا أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالُوا صَلَوَاعَتَا وَشَهِدْدُوا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كُفَّارِيْنَ قَالَ ادْخُلُوهُنَّا فِي أَمْمَهُمْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي الْكَابِرِ﴾ (آل اعراف: ٣٧)

”یہاں تک کہ جب ان جھٹانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا مل جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔“

پہلی آیت میں عدم بھرت کے گناہ کے مرتب مسلمانوں کا اور دوسرا میں کافروں کا حال بیان کیا ہے، کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ ہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی یہ کہ تو حید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہو گا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گزی ہیں، اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں، اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں میں سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تباہ گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

﴿يَقِيْنُ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقُوْلِ الْكَابِرِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَيُضْلِلَ اللّٰهُ الظَّلَّمِيْنَ﴾ (ابراهیم: ٢٧)

”اللہ ایمان والوں کو کپی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخوند میں بھی اور اللہ ظالموں کو بجلاتا ہے۔“

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ بزرخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح بزرخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافروں شرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور ہمک جائے گا۔ ہر چند کہ رسول کریم ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائید آیہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ”قول ثابت“ پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے آخرت قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مرد انہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہل ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار، آخرت کے اس حصے میں موزوں ہو سکتا تھا، جہاں ہنوز اسرار پس پرده کی پوری نقاپ کشانی نہیں ہوتی اور وہ بزرخ کا عالم ہے۔ اس آیت مبارکہ کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیح پرمنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں بزرخ کا میدان بھی داخل ہے۔ حقیقت میں اس عالم بزرخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہو گی یا یوں کہو کہ آج کے آئینے میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہو گی۔

برخ میں ارواح کا مسکن

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس نیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہو گا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب مفکرین سے سوال و جواب کرچکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اینے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَلَّبُوا إِيمَانَهَا وَسْتَلُّبُرُوا عَنْهَا لَا تَفْعَمْ لَهُمْ أَيُوبُ السَّمَاءُ وَلَا يَدْخُلُونَ جَنَّةَ حَكَمٍ لَكَعَابَ أَبْصَمٌ فِي سَمَاءِ الْجَنَّاتِ﴾ (٧/الاعراف: ٤٤)

”بے شک جنہوں نے ہماری آئیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکھے اونٹ سوئی کے نکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔“

اس سے معلوم ہوا کہ آیات الہی کے منکروں اور جھلکنے والوں کی رو جیسی مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی

کے حدود میں قدم نہ کھسپیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ پرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔ اس کے برخلاف ہمدرتن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الہی کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں صدارتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكَ رَاضِيَةً مَرْضِيَةً فَادْخُلُ فِي عَبْدِيٍّ وَادْخُلُ جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۷ - ۳۰)

”اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جاؤ، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔“ ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و سرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کرو دی جائے گی۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِيَمْ يُقْتَلُ فِي سَيِّلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلِكُنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

(البقرة: ۱۵۴)

”جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔“ یہ پرمسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَلَا تَحْسِبَنَّ الَّذِينَ قُتُلُوا فِي سَيِّلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فِي جَنَّتِنَ يَمَّا لَهُمْ لِلَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبِغُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحِقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ لَا أَلَاخُوفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ يَسْتَبِغُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيمُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۶۹، ۱۷۰)

”اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں، کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔“

یہ پرمسرت زندگی شہدا کو ملے گی اس زندگی کا مقام ”خدا کے پاس“ بتایا گیا ہے، احادیث صحیح میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں نفسِ عضری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ لَمْ يَسْتَقِمُوا تَنْزَلٌ عَلَيْهِمُ الْمُلْكَةُ الْأَعْلَمُوْلَا تَحْرُنُوا وَأَبْشِرُوْا

١١) خالد بن عبد الله (٢) ، عاصم بن عبد الله (٣) ،

﴿تَشْهِي أَنفُسَكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ﴾ (٤١ / خَمْ السَّجْدَةٌ) (٣٠، ٣١)

”بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخوند میں بھی۔“
سآوازہ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

^٤ جامع ترمذى ، ابواب المناقب ، باب مناقب جعفر بن ابي طالب: ٣٧٦٣.

۲۲ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تحت پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگد خالی کر جاتی ہے یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہ قائم ہے اور اس مغل کی جو روشنی اول روختی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض ہے

ہزار شمع بکشتند و انجمان

باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے گزرے ٹکر کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلائق عالم اپنی صفت خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر، ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہو گا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیا کے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنسٹس) کو ہو سکتا ہے مگر اہل فلسفہ کا بڑا اگر وہ بھی اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہل سائنس بھی اس امکان کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبعیات و بیوت جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں اور اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے ذریعے پیشیں گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے اس نظام عالم کی پوری گاڑی جس انہن سے چل رہی ہے وہ یہ گرم آفتاب ہے اور اس کی یہ گری روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آخ را ایک دن آئے گا جب یہ انہن بالکل محشردا ہو جائے گا اور یہ ساری گاڑی نوٹ پھوٹ جائے گی۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور نضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ باہمی توازن باتی نہ رہے گا اور اس وقت تمام کرے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکر جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا۔

ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارے سے تکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ہباءً متنوزا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسے طبعی پکھ ہوں مگر ایسا ہونا اہل سائنس کے نزدیک بھی امکان، بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہل مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور اس میں اس کو ”عدالت کا دن“ کہا گیا ہے۔ ﴿حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک ”صدوقی“ جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا مگر دوسرا فرقہ جو ”فریسی“ کہلاتا تھا بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا﴾ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینیوں کو اور تیسرا پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھ گا اور نہادے گا کہ ”میں ہوں بادشاہ۔“ ﴿انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے﴾ اور مکافات یوختا میں قیامت کے احوال و احوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو ”پر لے“ کے نام سے اس عقیدہ (فناۓ عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تصریح خاتم انبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریع سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورہ میں ہے، وہ یوم الدین ہے یعنی ”جز اکادن“ جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور بالی عدالت کا دن ہو گا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں:

السَّاعَةُ وَهُوَ مُقْرَرٌ وَهُوَ قَدِيمٌ

يَوْمُ الْقِيَامَةِ کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)

الْيَوْمُ الْحَقُّ سچادن (ذہب کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)

٢ زبور: ٩، ١٦، ١٧، ١٨، ٢٤، ٢٢، ٢١ و باب: ٤٩ و ٥٠ - انجيل مرقس: ١٢، ٢٤ و اعمال: ٢٣ -

^٣ صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة زمر: ٤٨١٢، ٤٨١١ - ٤٨١٠.

٤ متى: ٢٢، ٣١، ٣٢؛ لوقا: ٢٠-٢٧؛ مرقس: ١٢-١٨.

يَوْمُ مَعْلُومٍ جاناً هوا دن یا مقررہ دن

الْوَقْتُ الْمَعْلُومُ جاناً هوا وقت یا مقررہ وقت

الْيَوْمُ الْمَوْعُودُ موعدہ دن

الْيَوْمُ الْآخِرُ پھٹلا دن

قَرِيبٌ آنے والی مصیبت کا دن

يَوْمُ الْأَزِفَةِ ایک سخت دن

يَوْمُ عَسِيرٍ ایک بڑا دن

يَوْمُ عَظِيمٍ ایک سخت دن

يَوْمُ عَصِيبٍ سخت دن

يَوْمُ الْبَعْثِ جی اٹھنے کا دن

يَوْمُ التَّغَابُنِ افسوس کا دن ॥

يَوْمُ التَّلَاقِ باہم ملنے کا دن

يَوْمُ التَّنَادِ پکار کا دن

يَوْمُ الْجَمْعِ اکٹھے ہونے کا دن

يَوْمُ الْحِسَابِ حساب کا دن

يَوْمُ الْحُسْرَةِ حرست کا دن

يَوْمُ الْخُرُوجِ قبروں سے نکلنے کا دن

يَوْمُ الْفَصْلِ فیصلہ کا دن

الْقَارِعَةُ کھڑکھڑانے والی

الْعَاشِيَةُ چھا جانے والی

الْطَّامِمَةُ الْكُبْرَى بڑی مصیبت

الْئَيَّامُ الْعَظِيمُ بڑی خیر

الْحَقَّةُ ضرور آنے والی کھڑی

الْوَعْدُ وعدہ

الْوَاقِعَةُ وقوع پذیر

أَمْرُ اللَّهِ خدا کی بات

۱۰۰ عام مترجمین نے ہار جیت کا دن لکھا ہے اور شاہ عبدالقدار صاحب نے نقصان المحسنة کا دن لکھا ہے اسی سے اس میں حرست و افسوس کا مجموع بھی شامل ہوا۔

الصَّاعَةُ بہرا کرنے والی گھڑی

قیامت کے اوصاف

یہ تودہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور یہی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً:

﴿يَوْمَ يُنَعَّرُ فِي الصُّورِ﴾ (٦ / الانعام: ٧٣ - ٢٠ / طہ: ١٠٢ - ٢٧ / النمل: ٨٧)

”جس دن زندگا پھونکا جائے گا۔“

﴿يَوْمَ يُنَعَّرُ الظَّدِيقُينَ صَدَقُهُمْ﴾ (٥ / المائدہ: ١١٩)

”جس دن پھوں کو ان کی حکایت کام دے گی۔“

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنْوَنٌ﴾ (٢٦ / الشعراء: ٨٨)

”جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔“

﴿وَيَوْمَ يَعَصُّ الظَّالِمُونُ عَلَى يَدِيهِ﴾ (٢٥ / الفرقان: ٢٧)

”جس دن گناہ کاراپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔“

﴿وَيَوْمَ تَكُونُ الشَّمَاءُ﴾ (٢٥ / الفرقان: ٢٥) ”جس دن آسمان پھٹے گا۔“

﴿وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ (٤٠ / المؤمن: ٥١) ”او جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔“

﴿لِيَوْمٍ لَأَرِيَتْ فِيهِ﴾ (٣ / آل عمران: ٩) ”جس دن میں کوئی خنک نہیں۔“

﴿وَيَوْمَ تَخْشُرُ مِنْ كُلِّ أُنْثَى فَوْجًا﴾ (٢٧ / النمل: ٨٣)

”جس دن ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرِتَّ الْعَلَمِينَ﴾ (٨٣ / المطففين: ٦)

”جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔“

﴿يَوْمَ جُوْنَ مِنَ الْأَجْدَاثِ﴾ (٥٤ / القمر: ٧)

”(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔“

﴿يَوْمَ يَقْرَأُ الْمَرءُ مِنْ أَحْيَاهُ وَأَمْيَاهُ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيَّهُ﴾

(٨٠ / عبس: ٣٤ - ٣٦)

”جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔“

﴿يَوْمًا لَا يَخِزُّنِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا﴾ (٢ / البقرة: ١٢٣)

”جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلتہ ہو سکے گا۔“

يَوْمَ تُشَهِّدُ عَلَيْهِمُ الْسَّتَّةُ هُنَّ

”جس دن ان کی زبان میں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔“

﴿يَوْمَ لَا تَنْهِكُ نَفْسٌ لِّتَعْصِيمِ شَيْءًا﴾ (١٩) / الْأَنْفَطَار: (٨٢)

”جس دن کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ بھلانہ کر سکے گا۔“

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا﴾ (٤٤ / الدخان: ٤١)

”جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔“

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا

قیامت کے متعلق بعض مشکلمین کو یہ شہبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے بھض، یا عدم بھض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام ترقیات اور آسمان و زمین کے نظام کی رہنمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے چنانچہ حسب ذیل آیات یغور کرنے سے پہنچی خود بخود سامنے آجائے گا:

﴿أَلْقَاعِهُ۝ مَا أَلْقَاهُ۝ وَمَا أَدْرِكَ مَا أَلْقَاهُ۝ يَوْمٌ يَأْتُونَ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ۝﴾

وَتَكُونُ الْجِيَالِيَّاتُ كَالْعَهِينَ الْمَنْقُوشِ (٦) (١٠١ / القارعة: ٥)

”متبنہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متبنہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متبنہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پھاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔“

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ لِزَلَّهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَنْقَالَهَا وَقَالَ النَّاسُ مَا هَذَا﴾

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدَّثُ أَخْبَارُهَا﴾ (٤-٦) / الزمر: ٩٩

”جب زمین خوب پلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن زمین انیٰ حالت بیان کرے گی۔“

﴿إِذَا السَّمَاءُ اشْقَرَتْ ﴿١﴾ وَأَذْنَتْ لِرِبَابًا وَحُفَّتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ﴿٣﴾ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا

وَتَخَلَّتْ ﴿٤٨﴾ /الإنشقاق: ٤

"جب آسمان پھٹ چائیں گے اور زہاینے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری

کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ ڈال دے گی اور وہ خالی ہو جائے گی۔“

﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَافِرُ انتَرَتْ ۝ وَإِذَا الْيَحَارُ فُقِرَتْ ۝ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْرَتْ ۝ عَلَيْهَا نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَمَا حَرَثَتْ ۝﴾ (۸۲/الانفطار: ۵-۱)

”جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب دریا چلاۓ جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، روئوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس وقت جان لیں گی۔“

﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِرَتْ ۝ وَإِذَا اللَّجُومُ الْكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجَبَالُ سُرَرَتْ ۝﴾

(۳۰/التکویر: ۱)

”جب آفتاب اندر ہر کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلاۓ جائیں گے۔“

﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوْاقِعَةً ۝ فِي إِذَا اللَّجُومُ طَبَسَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۝ وَإِذَا الْجَبَالُ نُسْفَتْ ۝﴾

(۷۷/المرسلات: ۱۰-۷)

”جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔“

﴿فَإِذَا لَرَقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجْمَعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝﴾ (۹۷/القيامة: ۷۵)

”جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔“

﴿يَوْمَ نَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِلِ ۝ وَكَلُونُ الْجَبَالُ كَالْعُفَنِ ۝﴾ (۹۰، ۸/المعارج)

”جب آسمان پھٹھلے ہوئے تابے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی ماند ہو جائیں گے۔“

﴿فَإِذَا نَفَخْتُ فِي الصُّورِ نَفَخَةً وَاحِدَةً ۝ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجَبَالُ فَدَكَتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۝ فَيُؤْمِنُنَّ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْفَقَتِ السَّمَاءُ فَوْيَ يَوْمَيْدٍ وَاهِيَةً ۝﴾

(۶۹/الحاقة: ۱۳-۱۶)

”جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں نکڑے ہو جائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس

دن کمزور ہو جائے گا۔

﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجَهَنَّمُ وَكَانَتِ الْجَهَنَّمُ كَثِيرًا مَهِينًا إِنَّمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا إِذَا شَاهِدًا عَنْهُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَى فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخْذَنَاهُ أَخْذًا وَكَيْلًا فَيُكَلَّ فَتَقْوَنَ إِنَّ كُفُورَهُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْأُولَادَنَ شَيْبَاتٍ إِلَّسْمَاءُ مُنْفَطِرٍ بِهِ طَكَانَ وَعَدْدًا مَغْفُولًا﴾ (۷۳ / المزمل: ۱۴ - ۱۶)

”جب زمین اور پھاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پھاڑ پکھلا ہوا تاباہو جائیں گے.....
کیونکہ متqi ہو سکتے ہے، جب اس دن کا انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔“

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۴۸)

”جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔“

﴿فَإِذَا النُّشُقَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرَدَةً كَالْلَّهَانَ﴾ (۵۵ / الرحمن: ۳۷)

”جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تپھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔“

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَئِسْ لِوَقْعَتِهَا كَأَدِبٍ هُنَّ خَافِضَةٌ رَازِفَةٌ إِذَا رَجَّتِ الْأَرْضُ رَجَّاهُ وَبَسَّتِ الْجَهَنَّمُ بَسَّاهُ فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَطاً﴾ (۵۶ / الواقعة: ۶-۱)

”جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر وزبر کردیتے
والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پھاڑ پر انگدہ کیے جائیں گے اس وقت وہ پریشان
ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔“

﴿وَفُتحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَاجًا وَسُرْيَاتِ الْجَهَنَّمُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾

(۲۰، ۱۹ / النبایا: ۷۸)

”اور آسمان کھول دیے جائیں گے اور وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پھاڑ چلاۓ
جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔“

غرض اس قسم کی اور بہت سی آئیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہی اور
دنیا کی حیات موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بننے گا اور پچھلی دنیا کے
اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہو گا:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرْزَوًا إِلَهُ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾

(۱۴ / ابراہیم: ۴۸)

”جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔“

قیامت کی حقیقت

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاد کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور، اس سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل سا کت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے:

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَنْوَفِ الْقِيمَةِ۝ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفَسِ اللَّوَامَةِ۝ أَبْيَسْبُ الْإِنْسَانَ أَنَّ كُلَّهُمْ
عَظَامَهُ۝ لَلَّىٰ قَدِيرُنَّ عَلَىٰ أَنْ سُوَىٰ بَنَائَهُ۝ بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَنْجُرُ أَمَامَهُ۝ يَسْئُلُ
أَيَّانَ يَوْمَ الْقِيمَةِ۝ فَإِذَا يَرِيقُ الْبَرَرُ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ۝ وَجُمِعَ التَّكَمُّلُ وَالْقَمَرُ۝ يَقُولُ
الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَقْرَرُ۝ كَلَّا لَأَوْزَرَهُ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ إِلَّا مُسْتَقْرَرٌ۝ يَبْتَوِلُ الْإِنْسَانُ
يَوْمَئِذٍ يَبْتَأِدَّهُ وَآخِرَهُ لِلْإِنْسَانِ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ۝ وَكَوَافِقُ مَعَادِيَةٌ۝﴾

(القیامۃ: ۱۵-۷۵)

”میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں، کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی بڑیوں کو اکھنائیں کر سکتے، کیوں نہیں، ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے ڈھنپائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیے جائیں گے، انسان اس دن کہے گا، اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ زبان سے بہانے ترا شاکرے۔“

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روز قیامت اور نفس اتواء مکی کیے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفس اتواء ”یعنی ملامت کرنے والے نفس سے“، مقصود انسان کا اندر کا ضمیر ہے جو انسان کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غلکیں و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ ”بلکہ انسان اپنے حال کو آپ خوب جانتا ہے اگرچہ زبان سے

اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشے، انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفسِ لا امد ہے۔

① اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فردا جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تدرست ہوتا ہے، گناہ کار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیک نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ وقت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے اور پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔ یعنیہمیں تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تدرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہ کار ہوتی ہیں، نیکوکار نہیں ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر اب موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ، جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، وہ ایک دن فتنے میں کاٹھ عاد و نوح و داولی فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگئے گی۔

بہر حال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفسِ لا امد یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر بڑے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گناہ کار نہیں ہوتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارنا موس پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصور دار جانتا ہے اور گناہ کار نہیں ہوتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتا تا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے، اسی طرح یہ پوری انسانیت کبھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارنا موس پر نادم و پشیمان ہو گی اور اس کا ضمیر نفسِ لا امد اس کو ملامت کرے گا۔ کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کا نبات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورہ بالا میں نفسِ لا امد اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں سمجھا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورہ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھئے۔ *

② اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ وہ متفاہ عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے اس میں سردی و گرمی، بیماری و تدرستی، بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متفاہ قوتیں و دیعث رکھی گئی ہیں، ان متفاہ قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ایک

* متفاہ اتفاسی سورہ قیام، مولانا حیدر الدین چشتی ص: ۱۲، ۱۳۔

درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان مقناد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شفقت رہا جس آن کسی ایک قوت نے نکست کھلی پھول کی بستی معرض فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر، جو غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔ پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں مقناد عناصر و اخلاق کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات، روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں، تند رستی اور یماری، دولت اور افلas، حیات اور موت، آسمان و زمین، سکی و بدی، خیر و شر، غرض جدھر بھی دیکھو یہی معلوم ہو گا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری، انہیں مقناد قوی اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہو گا۔ لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں یماری کے بعد تند رستی اور تند رستی کے بعد یماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تند رستی کے بعد یماری اور یماری کے بعد تند رستی کی صلاحیتیں موجود ہیں، لکھی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی اور کشت و خون کے سیالاں نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعہ وہ پھر بھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشی نوح بن کر کرہ ارضی کو بچا لے گیا۔ بارہاں باعث ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا۔ اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ نکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بیٹھ گئی۔ یہ کڑے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے مگر فساد و صلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان مقناد قوی اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہو گا، نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خلق کے سامنے کھڑی ہو گی اور اپنے اوپر کی ہر کوتا ہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے سنائے گی:

﴿إِذَا زُلْزَلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَلَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَنْقَالَهَا وَقَالَ إِنْسَانٌ مَا لَهَا^۱
يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا^۲ يَا أَنَّ رَبِّكَ أَوْلَى لَهَا^۳ يَوْمَئِذٍ يَصَدِّرُ النَّاسُ أَشْتَأْنَاهَا لَيَرَوَا^۴
أَعْمَالَهُمْ^۵ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ^۶ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ^۷﴾

(الزلزال: ۱-۸)

”جس وقت پوری زمین بلالی جائے گی اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو اگلے دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برادری کی کی کی کی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برادر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔“

صورِ قیامت

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے «فَإِذَا نُفَخَ فِي الصُّورِ» ۲۷۰ «پھر جب صور پھونکا جائے گا، صور کے لفظی معنی زر سکھا کے ہیں اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بالیوں، کنیانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر زر سکھا پھونکا جاتا تھا، اس لیے زر سکھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی کہ «لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمُ» ۲۷۱ «آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا» (اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْفَهَارُ) ۲۷۲ اس ایک سب پر غالب آنے والے کی۔ غرض وہ دن آسان و زیمن اور ظلم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال و شدید خطرہ جنگ کے اعلان کا ہو گا اس لیے اس کے لیے نفع، صور اور زر سکھا پھونکنے کا قدیم محاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے زر سکھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تقلیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو تو حید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے متوالنہ اور پرستش اور جزا اوسرا سے قطعاً عالم تھے اور اس لیے ان میں اعمال کے خیر و شر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جن پر تمام اخلاق و معاملات کا دار و مدار ہے، عرب کا شاعر آپ کی اس تعلیم کو سن کر تجوہ سے کہتا ہے:

اموت ثم بعث حشر

حدیث خرافۃ یا ام عمر!

”کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر آٹھنا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات بتیں ہیں۔“

قریش کے ایک دوسرے شاعر نے کہا:

یحدثنا الرسول بان سنحی

وکیف حیا اصداء و هام

”رسول، ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے حالانکہ صد اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟“

صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابہ الى المدينة: ۳۹۲۱

(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں صدقی اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ قول بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿عَإِذَا مُتَّنَا وَلَنَا رَأَيْنَا ذَلِكَ رَجُمٌ يَعِيْدُ﴾ (۵۰/ ق: ۳)

”کیا جب ہم مر جائیں گے اور مرنی ہو جائیں گے، یہ لوٹا بہت دور ہے۔“

﴿عَإِنَّا لَمَدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ عَإِذَا أَكَنَا عَظَامًا تَخْرُقُهُ﴾

(۱۰، ۱۱/ النازعات: ۷۹)

”کیا ہم دوبارہ ائے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔“

﴿عَإِذَا أَكَنَا عَظَامًا وَرَفَقَاتِنَا عَإِنَّا لَبَعْوُنُونَ خَلَقَنَا جَيْدِيدًا﴾ (۴۹/ بنی اسرائیل: ۱۷)

”کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نے بنائے پھر انھائے جانے والے ہیں۔“

﴿مَنْ يُعْيَى الْعِظَامَ وَهُنَّ رَمِيمٌ﴾ (۳۶/ بیش: ۷۸)

”ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلانے گا۔“

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسرا زندگی نہیں:

﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاةُ الدُّنْيَا مَوْتٌ وَنَحْيَا وَمَا يَهْلِكُنَا إِلَّا اللَّهُ هُوَ﴾

(۴۵/ الجاثیہ: ۲۴)

”انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسرا نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔“

﴿وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاةُ الدُّنْيَا وَمَا تَحْنُنُ بِبَعْدِ عِيْدِنَ﴾ (۶/ الانعام: ۲۹)

”اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں انھائے جائیں گے۔“

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا﴾ (۷۸/ الہب: ۲۷)

”وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔“

خباب بن الارت، ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاصی بن واکل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاصی کہتا جب تک تم محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ”یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔“ اس نے کہا، کیا مر کر مجھے پھر جیتا ہے؟ انہوں نے کہا: ”بے شک۔“ اس نے مذاق سے کہا، اچھا تو پھر وہیں میرا

مال و دولت اور سروسامان ہو گا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ * اس سے اندازہ ہو گا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد حس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی کمی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے یعنی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بتکار بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ہبہت الہی، ہنگامہ قیامت اور حشر و نشر کے رست خیز کی ایسی تصور کی چیز ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عمر، عقل کے تصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامنے ہر قدم پر لرزہ بر انداز ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، غیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بُی، دنیا کی قناعت، دوزخ کی دہشت اور عذابِ الہی کی تهدید کا ایسا ہونا کہ نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وہی الہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہؓ ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہؓ نے بتایا فرماتی ہیں، پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بد کاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے۔ یہ آیت کہ «بِلِ السَّاعَةِ مَوْعِدُهُمُ وَالشَّالَّةُ أَذْهَلُهُ وَأَمْرُهُ» (٤٦ / السُّقْمَر: ٥٤) ”بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی۔“ مکہ معظمه میں اتری اور میں اس وقت کمن پنجی تھی کھلی تھی۔ بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں، جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ *

اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیمِ محمدی ﷺ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا اوسرا کی ہبہت اور عظمت نہ پہنچتی اور نہ احکامِ الہی کی تعمیل میں ولی رحمان اور میمان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا اوسرا کا ذکر باقی ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْلِرُونَ﴾ (١٦ / النحل: ٢٢)

”تجو لوگ آخرت کا عقین نہیں کرتے، ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں بدلائیں۔“

اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ تلاوت کریں، جس کا ایک نکٹڑا یہ ہے: **﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾** ”روز جزا کا مالک۔“ اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر تفسیر سورہ کعبہ عص: ۴۷۳۴۔

* صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن: ۴۹۹۳۔

پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مذاخذه اور جزا اوس زمانہ ہوتی تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری انتیاز لغواڑ انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

﴿أَفَيْسِتُمْ أَنَّهَا خَلَقْنَا مُبَشِّراً وَّ أَنَّكُلْمَ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ (۲۳ / المؤمنون: ۱۱۵)

”(اے لوگو) اکیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔“

﴿أَيَحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًّا﴾ (۷۵ / القیامۃ: ۳۶)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ، یا جائے گا۔“

دوسری پاریتی جو اسکی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر ابھی برے انسانوں کے اعمال کی جزا اوس زمانہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہیں، بلکہ ان عقوبات بالله خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، مگر تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گناہ کار، یہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بس رکرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پر ہیز کار اور اپنے لوگ مصلحتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا اوسرا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بناء پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا تجھیل کئے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا اسزادیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا اوسزادے کر اپنے عدل و الناصاف کا ثبوت دے۔ سورہ واتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ هُمُ الْجُرَّارُ غَيْرُ مُمْنُونَ ۝ فَمَا يُكْلِلُ بُكْ بَعْدُ إِلَّا لِلَّذِينَ ۝﴾

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمُ الْعِلْمِينَ ۝﴾ (۹۵ / التین: ۸-۶)

”لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا جر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔“

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجہ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

﴿أَمْ بَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْفَاسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ بَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَارِ﴾ (۲۸/ ص: ۳۸)

”کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی طرح کر دیں، جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پر ہیز گاروں کو بد کاروں کی طرح کر دیں۔“

۱۰۔ سری جگہ ارشاد ہوا:

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَّ حُوالتَّهُا إِنْ يَكْنِعُوهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا سَوَاءٌ لَهُمْ وَمَمَّا يَنْهَا مَا يَنْهَا مُؤْمِنُونَ﴾ (۴۵/ الجاثیة: ۲۱)

”کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کئے یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برائے۔“

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا، اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے انہوں نی اور حال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی ﷺ نے اس گھنی کو اس طرح بلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا:

① مر کر جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزریؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرندمر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

② جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعہ بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے بزرے نکل آتے ہیں، کہیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو الگوادے گی (﴿وَآخْرَ جَهَنَّمُ الْأَرْضُ الْفَالَّهَا﴾) اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی۔ ”اوہ دوبارہ نی زندگی پیدا کر دے گی۔

③ دوبارہ زندگی پر تجھب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری بھیجی میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، بزرے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

④ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقش

اول بنایا، کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی نیاد ڈالی، قوموں کو اپنا حکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور و نجوت، ظلم و تسلیم اور دوسرا قوانین الٰہی کی جو قوموں کی تھی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی توجہ فنا کروی گئیں اور ان کا نام دشمن بھی صفحی ہستی سے مت گیا۔ عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و شمود جو کبھی بوسام کے مالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سما اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوٹ اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا:

﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ طَكَانُوا هُمْ﴾

أشدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثْرًا فِي الْأَرْضِ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۲۱)

”کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا، جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔“

**﴿أَكْفَرُ يَا تَذَكَّرُمْ تَبَوَّأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمٌ نُؤْجِي وَعَادٍ وَّكَوْدَةٍ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ طَلَّا
يَعْلَمُهُمُ الَّلَّهُ ط﴾** (۹ / ابراهیم: ۱۴)

”کیا تم کو نوح کی قوم اور عاد و شمود کی اور جو ان کے بعد آئے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔“

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بالی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوں لِمَنِ الْمُلْكُ بجائی تھیں، ہزارہا سال سے بے نشان ہیں۔ نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تہماں ملک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جروم کے مقابل صدیوں تک برسر پیکار رہے ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں رہی، امریکہ کے قدیمہ باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔ الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیا یہ مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گوا فراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں اسی طرح جن کی نظر دنیا کے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ایک

دن وہ آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معاہدہ کرنا ہو جائے گی اور کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اور اس میں موجودہ عالم کا قانون طبعی ایک دوسرے طبعی قانون سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سامنے کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور تمام اجرام فلکی مکرا کر چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرُزُوا يَلِوُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

(۴۸/۱۴) ابراهیم

”جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیدہ زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہو گی۔“

سورہ ق میں قیامت پر استدلال انہیں دیلوں سے کیا گیا ہے:

﴿قٌ وَالْقُرْآنُ الْحَمِيدٌ بَلْ عَجِيبًا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالُ الْكُفَّارُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ وَعَرَادًا مِنْتَأْ وَكُنْتَ تُرَايَأْ ذِلِّكَ رَجُمْ بَعِيدٌ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَفْعَلُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ بَلْ كَذِيلُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مُرِيْجٍ أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ وَقُوَّتْهُمْ كَيْفَ بَيْنَهَا وَرَسَّلْنَا وَمَالَهَا عِنْ فُرُوجٍ وَالْأَرْضُ مَدَدَهَا وَأَقْيَانَا فِيهَا رَوَابِيٍّ وَأَبْتَنَنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ رُوْجٍ بَيْهِيجٍ تَبَرَّةً وَذَكْرٍ لِكُلِّ عَبْدٍ مُنْبِيْبٍ وَتَرَنَّنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مِبْرَحًا فَأَبْيَثَنَا يِه جَهَنَّ وَحَبَّ الْحَصِيدٌ وَالْخَلُ بِسْقَتَ لَهَا طَلْعَ نَسِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَنَا يِه بَلْدَةً مِيَّاطًا ذِلِّكَ الْخُروجُمْ كَذَبَثَ قَبْلَهُمْ قَوْمٌ نُؤْجِ وَأَصْبَحُ الرَّكَشَ وَكَمُودَةً وَعَادَ وَفِرْعَوْنَ وَإِخْوَانُ لُوطٍ وَأَصْبَحُ الْأَيْكَةَ وَقَوْمُ تَعْمَلُ كُلُّ كَذَبَ الرَّسُولَ فَعَقَّ وَعِيدٌ أَفَعَيْنَا بِالْحَقِّ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبِيْسٍ مِنْ خَلْقِ جَدِيدٍ﴾

(۵۰/۱-۱۵)

”قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کا فردوں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس سے تعجب ہے کہ ان میں کا ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ذرستا تا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹا تو، وہ از عشقیل ہے، (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان مردہ جسموں میں جو کی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کا فردوں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی انہوں نے جھٹلا دیا تو وہ ابھی با توں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور

کس طرح اس کو سجا یا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لگڑا لے اور اس میں قسم قسم کی روفق کی چیزیں آگئیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوچھ ہوا اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا پھر اس سے باغ اور کلٹن کھیت کے انداج اگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اور پر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبوں سے) نکلا ہو گا، ان کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والے اور شہود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تعجیل کی قوم نے اس کو جھلایا ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھلایا تو میری دھمکی پوری اتری، کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدا کش میں شک ہے۔“

سورہ قیامتہ میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًّيًّا ؟ إِلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيَّتِنِي ؟ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَلَكَ فَسَوْيٌ فَبَعَلَ وَمِنْهُ الْزَّوْجُينَ اللَّذِكَرُ وَالْأُنْثَى ةَلَيْسَ ذَلِكَ بِقِدْرٍ عَلَى أَنْ يُبْيِحَ الْمُوْلَى ؟﴾

(القيامة: ٣٦-٤٠/ ٧٥)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار تجوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک پیکی ہوئی بوندنے تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنا یا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا، یعنی نر اور مادہ کیا یہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلانے؟“

﴿وَقَالُوا إِذَا أُكْنِيَ عَطَّامًا وَرَفَاتًا عَلَيْهِ لَبَعْدُونَ خَلْقًا جَدِينَ إِنَّا أَوْلَمْ يَرِدُوا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ (١٧/ بنی اسراء یہل: ٩٨، ٩٩)

”اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے، تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنا یا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی نا ساختا ہے؟“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدِئُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهُوَ عَلَيْهِ ةَرُوم٢٧﴾ (٢٧/ الرُّوم)

”او رخدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا، یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے بہت آسان ہے۔“

﴿إِنْ كُنْتُمْ فِي رَبِّبٍ مِّنَ الْبَعْثَ فَإِنَّا خَلَقْنَا مِنْ تُرْكَابٍ﴾ (٥/ الحج: ٢٢)

”(لوگ) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو (پہلے) تم کو اسی مردہ مٹی سے پیدا کر چکے ہیں،
(پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔)“

قیامت کے متعلق تمام و دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا منحصر جواب ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُنْهِيُ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْبِهَا الَّذِي أَنْفَأَهَا أَوْلَ مَرَّةً ۝﴾

(۷۸، ۷۹ / یت: ۳۶)

”وہ بولا کہ کون ان سڑی کو محلی ہڈیوں کو جلائے گا، کہہ دے وہی جس نے پہلی وفعان کو بنایا۔“
غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استجواب اور استبعاد کو درکیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا لیتین دلایا۔

حشر جسمانی

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر کرکی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی اور جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گزرنہ ہوگا۔ گوفر آن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارہ ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اور کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو۔ کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مرکر پھر جئے گا؟ کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر انکھ کھڑے ہوں گے؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فاشدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھوکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخلیل ان کے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخلیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جانشے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لیے مصلحت الہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقع پر زور دے اور کیسے اور کیوں سے تعزز نہ کرے اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿وَقَالُوا إِنَّا أَضَلَّنَا فِي الْأَرْضِ عَرَىٰتَ الْفُنُونَ حَلْقٌ جَدِيدٌ ۝ بَلْ هُمْ يَلْقَوْا رِتْهُمْ كَفِرُونَ ۝﴾

(۳۲ / السجدۃ: ۱۰)

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہونگے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں) بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

خور کر کہ ان مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لیے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے

ان کو انکار ہے اور خواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود بھی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿فَلَمَّا يَوْمَ قِيَمُكُمْ مَلْكُ الْمَوْتَ الَّذِي وُكِلَّ بِكُمْ نَهَارًا لِرَبِّكُمْ تُوْجَعُونَ ﴾

(٢٢/السجدہ: ١١)

”خواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹادیے جاؤ گے۔“

یہی ملاقات اور جو عالم اللہ اس عقیدہ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہیں باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مشابیں اور نظائریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکمیر اس سوال سے وہ بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس ہی پر اس نادیدہ شہرستان بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔ جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس کے نزد یہکہ تھا وہ اسی زندگی کا تختیل تو اور بھی زیادہ محال ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو وہ جانی وجود میں نہیں دیکھا، بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لیے اگر یہ حق ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی، تو ظاہر ہے کہ موت آنے کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت و کیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسم نی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیات ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گوروح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لیے آلات و اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعل لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی لذت ہے کہ لذت والم کا کوئی رو حاصل احساس جسمانیت کے شاہپر سے مبراہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح کا محض جنت کی لذتوں سے متعنی یا دوزخ کی تکلیفوں سے متألم ہونا کسی جسمانی وساحت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر وہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم و جسد

شر جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قابل میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھوکی جائے گی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اس دنیاوی جسم کے مثال ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا اوسرا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قابل میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر متواخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا البته یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و روایا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے انہیں خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

خلق جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے مکرور کے جواب میں یہ کہا ہے:

﴿إِنْ هُمْ فِي لَيْسٍ مِّنْ خَلْقِ جَدِيدٍ﴾ (۱۵: ق: ۵۰)

”بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔“

مکررین کی زبان سے کہلوایا:

﴿عَرَأَ اللَّهُمَّ بِعُوْنَوْنَ حَلَقَنَ حَدِيدَنَ﴾ (۹۸: السراء: ۱۷)

”کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔“

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:

﴿إِنَّمَا تَفْعَلُ حَلْقَ جَدِيدٍ﴾ (۳۴: سبا: ۷)

”بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔“

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

﴿كَمَا بَدَأَنَا أَوْلَى حَلْقَ تَعِيدَةً﴾ (۲۱: الانبیاء: ۱۰۴)

”جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنا سکیں گے۔“

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعدہ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے اور

نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ "جسم" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قاب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرے لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گز شستہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كُفَّرُوا يَأْتِيَنَا سُوقٌ نَّصْلِيهُمْ نَّارًا كُلُّهُمْ نَّاضِجُتْ جُنُودُهُمْ بِذَلِكُنْهُمْ جُلُودًا غَيْرَ هَا لِيَدُ وَقُوَّالْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (٤/ النساء: ٥٦)

"بے شبہ جو لوگ ہماری آئیوں کے مکرر ہوئے، ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

جب کھالیں کیے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم کا جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہو گا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے

یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے متوالنہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا وہ نفس یعنی روح ہے:

﴿أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ لِّيَسْرَتِي عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ﴾ (٣٩/ الزمر: ٥٦)

"تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے، کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔"

﴿وَلَنَتَرَنَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدِّ﴾ (١٨/ الحشر: ٥٩)

"اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا۔"

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا أَخْضَرَتْ﴾ (١٤/ التکویر: ٨١)

"(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔"

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَآخَرَتْ﴾ (٢٢/ الانفطار: ١٥)

"اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچے چھوڑا۔"

﴿فَلَا ظُلْمٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا﴾ (٢١/ الانبیاء: ٢٧)

”تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔“

جنت کی نسبت ہے:

﴿فَلَا يَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أَخْفَى لَهُمْ قِنْ قُرْيَةٌ أَعْيُنٌ﴾ (۳۲ / السجدة: ۱۷)

”کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر کھی گئی ہے؟“
ان آنکھوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور بے تینجوں کا بار جنم پر نہیں، بلکہ روح اور
نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

﴿فَادْخُلُوا فِي عَبِيدِيٖ وَادْخُلُوا جَنَّتِيٖ﴾ (۳۰ / الفجر: ۸۹)

”اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی اللذت والم کی اصل احساس کرنے والی
ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلہ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔
یہ جسم لاکھ بار بد لے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا اوس زمانہ رہی ہے۔
لوگ اپنی ظاہری بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ذہیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا
ہو تو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ نسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے
تھا، حالانکہ اس کی جسمانی بیعت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے اور یہاں یوں میں وہ
سوکھ کر کاٹا ہو گیا پھر تدرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہھائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی
جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں بھرتے اور
گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل ماتحتمل ہن کر ان کی جگہ لیتی رہی پھر کیا ایسے ہر
آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان
کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جاسکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ
گیا اور چند سالے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی
تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگ تھا اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیے وہ لائق تعریف نہیں،
کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا وہ جس طرح
کل تھی لیعنہ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعے کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بیعنی وہی اس کو
پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیری سے اس کی روحانی خصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی
جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعراض

کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پڑھج ہوگا۔ جسم کے اجزاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو یماری اگلے اجزاء میں پیدا ہو گئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مث نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سراست کرتی رہتی ہے۔

آخری جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے جیسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لفاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاسی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ خدا نے فرمایا:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِنَ مُّسْفِرَةٌ ۚ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبِشِرَةٌ ۚ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِنَ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۚ تَرْهَقَهَا﴾

قتراۃ (۴۱-۳۸) / عبس:

”کتنے چہرے اس دن روشن ہنتے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کم درست ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔“

﴿يَوْمَ تَبَيَّضُ وُجُوهٌ وَسُودٌ وَجُوْهَرٌ فَأَمَّا الَّذِينَ أَسْوَدُوا وُجُوهَهُمْ فَلَمْ يَرْجِعُوا إِلَيْهِمْ كُلُّهُمْ فَلَدُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ أَبْيَضُوا وُجُوهَهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَلِيدُونَ ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۶، ۱۰۷) (۲/۳)

”جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جاویان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلے عذاب کا مزہ چکھواد ریکن جن کے چہرے چھائی ہوئے توہہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدار ہیں گے۔“

صحیح حدیثوں میں ہے کہ ”جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپانہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اوپرین ہٹھتی قد کے مطابق ہوگا،“ دوزخیوں میں سے کسی کا سر پھاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مغلوق ہوگا، کسی کے ہوت لٹکے ہوں گے، دل کے اندر ہے آنکھوں کے اندر ہے بن کر اٹھیں گے، سزاوں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر ان کے جسم صحیح و سالم نہ مودار ہوں گے پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی۔“ یہ بھی آیا ہے کہ ”جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیزوں بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔“ ان تمام شواہد سے ہو یاد ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

♦ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في صفة ثواب اهل الجنة: ۲۵۳۹ و باب ماجاء في سن اهل الجنـة: ۲۵۴۵؛ دار مـی، کتاب الرفقـ، بـاب فـی اـهل الجــنة و نــعيمـها: ۲۸۲۸؛ مــسندــأـحمدــ، جــ ۲، صــ ۲۹۵، ۳۴۳۔

جز اور سزا

”یوم آخر“ یا ”یوم دین“ پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی نتایج ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسرا دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے اور دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نواہیں۔

جز اور سزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا بر احتیا کا مام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کا اچھا یا بر احتیا ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصروف بال جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعسیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا متبہ بھگتی ہے اور پھر انہوں کے قالب میں لا لی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو ”یہم لوک“ میں جانا پڑتا ہے، جہاں نزک (دوزخ) ہیں وہاں وہ قسم کی سزا بھگتی ہے بعد از یہی اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قبل قرار نہ پائے اس وقت وہ مادی قالبؤں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجر امام کا دویں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا انانج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جمنوں میں پیدا ہو کر سزا بھگتی ہے اور اس وقت تک اس آمد و رفت اور آواگوں کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس۔ اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لیے کامل اور دائیٰ نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا براؤ کوئی کام ہی صادر نہ ہو یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھنکارا (موکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پر لے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بننے لگی تو پھر وہی عمل اور سزا و حنفم کے آواگوں کا چکر شروع ہو گا اور پھر اسی طرح چھنکارا پائے گی اور پھر دوسری پر لے کے بعد نیادور اسی طرح شروع ہو گا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکالتا نصیب نہ ہو گا لایہ کہ حالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے، لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بھارتستان دم

کے دم میں خارستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے اور بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور با ایس ہمدردگی وابدی نجات میرمنہ ہو کیونکہ ہر پر لے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آداگون پھر شروع ہوتا ہے۔ *

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس پچھا اور بے عملی سے انسانوں کو تجات دلائی ہے، انہوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک، ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی، مختلف زرتشتی فرقوں نے آرین نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناخ کے بجائے مختلف سماں مذاہب کے خیالات کی نقلی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارواںہ ویراف" کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ *

صحیفہ ابراہیم یعنی سفر نکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (نکوین ۱۹-۲۰) علیٰ هذا حضرت مولیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اخروی جزا اوسرا کے اصول مذکور ہیں۔ نیکوکاروں کے لیے ایک "ستھری آبادی" کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہیں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لیے ہلاکت اور بر بادی اور در دن اک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر متربوں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر نکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (پیدائش ۲۵-۱۸) اور یعقوب علیہ السلام (پیدائش ۳۲-۲۹) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جاماً ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۲-۲۲) کا بھی تذکرہ ہے اور جنم کی آگ (استثناء ۲۲-۳۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیے جانے کی بھی تصریح ہے (یہ میاہ ۱۱-۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۲۱-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۷-۱۲) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈرا اور اس کے حکموں کو مان کر انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۳-۱۲) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثالی سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشنیوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا، وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھلتا

* تناخ کے دو میں الدوہ مگی، جون ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون ہے۔ * دیstan المذاہب کا مصنف جوز رشتی مذاہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

پھرے گا (۲۱۔۵) دنیا میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سورے ہے ہیں جاگ اٹھیں گے، بعض حیاتِ ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے (۲۔۱۲) حزقيال (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں "صدوقی" نام ایک فرقہ پیدا ہوا، جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں گے مجملہ ان کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کوفری (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریلی یہی اعتقد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہو گی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی۔ (مرقس ۱۲۔۲۳) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا اسرائیل کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گناہگار ہوں گے مگر چند روز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (۲/۸۰، ۲۳/عمران) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز یا گیارہ میں ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آ کر صدو قبوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزا اسرائیل ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنانے اپنے مکافہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھپٹی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جوانہوں نے ایک صدقوی کے سوال کا جواب دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشنا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افسرہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں: "میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھرنہ پیوں گا، اس دن تک کہ تھا رے ساتھ اپنے باب کی بادشاہت میں نیا نہ بنوں"۔ (متی ۲۶۔۲۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

"اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔" (متی ۲۲۔۳۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعرز کو اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باب

برلش انسیکلو پیڈیا مضمون صدو قین (صدقہ کیز)۔

کتب تفسیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

میل کا ترجمہ قرآن مجید حاشیہ زیر جسم آیت بقرہ رکوع ۸۔

اس کے اور آگے کے والوں کے لیے دیکھئے الکتاب المقدس، کتاب العہد الجيد یہ۔

ابراہام! مجھ پر حرج کرو اور عز کو بحق کر اپنی انگلی کا سراپا نی سے بھکو کر میری زبان مختدی کرے،
کیونکہ میں اس لوگوں تربا ہوں۔“ (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنائیں دوزخ کو آگ اور گندھک، کہا گیا ہے۔ (۱۰-۱۲) اور متی کی انجیل میں اس
کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں۔ (متی ۱۸-۱۲) اسی طرح جنت اور اس کی طلاق و جواہراتی تعمیر اور نہر آب
حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افسرداہ کا بیان متی میں ہے۔ (متی
۱۹-۲۶) وہاں کے آب سرداڑ کر بھی انجیل میں آتا ہے۔ (لوقا ۱۶-۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلتے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط
میں موجود ہے۔

”مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔“ (رمیون ۲-۸۰)

”سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔“ (رمیون ۱۱-۱۳)

”لیکن دے اس کو جزو نہیں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گیا۔“ (اول بطرس ۵-۲)
اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی
کیا، بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیے گئے تھے مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں اور ان کے
نقائص کی تکمیل کی اور جزا اور سزا کے اصول اس طرح بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوہ و شبہات سے پاک
ہو گیا۔

آئینہ مباحثت کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہیں۔

عالم آمر خرت کا فہم و ادراک

اس عالم آمر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا
تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے
ساتھ مخصوص ہے، اس لیے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص ولوازم ملزم ہو گئے ہیں باہم ان کے دیکھنے
اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بعینہ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان
لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض
امور کو محال اور ناممکن کہا اٹھتے ہیں اور بعضے ان کی تشریع و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں اوفی
اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وہی محمدی ملیٹیزم نے ان نازک و
دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لاحاظہ کیا ہے، اس نے تو یہودیوں کی طرح ان
واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالم آمر خرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنادیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان

مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی موهوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقولوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے یہ زم کے اہل نظر تماشا ہائیوں اور دونوں کی تخفیٰ اور تکمیل کا سامان بھی پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف اخیال مفہوموں اور مصادقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی ﷺ نے ایسے مجھے تسلی الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی سہرہ یا بہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھاسکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مطابق بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی، تاکہ وہ سب کے لیے اپنی اپنی جگہ پر تشفیٰ کا باعث ہو سکے ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا میں تمام تر مادی ماحول، مادی مفہوم و مصادق اور جسمانی تجیلات ہر چار طرف سے لپٹے ہیں، ان لفظوں کے سنتے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادی قید و لوازم کے ساتھ آتا ہے ہم جب "آگ" کا لفظ سنتے ہیں تو معاں دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کا اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلا تینی کیساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گناہ کار انسانوں کو جلانے کی، کسی کے پاؤں چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، وہ ایسی تیز و گرم ہو گی کہ یہ دنیاوی آگ، اس کے مقابلہ میں خندک ہے۔ "وزن" کا لفظ سنتے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تو نہ کی ساری خصوصیتیں آجائیں ہیں ترازو، پاسنگ، پلے ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں حسمیت اور ثقل کا ہونا۔ اسی طرح نامہل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں گے تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی اس بنا پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سچھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے، کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے بایس ہمسان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں اگر مراد الہی یہی تھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقولوں کے اس اختلاف مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ کی الفاظ میں ظاہر فرماسکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا، تاکہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لیے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سچھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ قوانین نظرت کو اس طرح لازم و ملزم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاں کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن

کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مہبمات اور ان کے موجودہ علی و اسباب میں جو لاروم ہیں وہ محض عادی ہیں یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کری جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علی و اسباب اور ان کے متاثر کارفرماں ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی تینی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل رہے، تینی خصوصیات کے جسم ہوں، تینی قسم کی زندگیاں ہوں، تینی قسم کی آگ ہو، تینی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، تینی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علی و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں وہی محمدی ﷺ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرُ الْأَرْضِ وَالشَّمَوْتُ﴾ (۱۴ / ابراہیم: ۴۸)

”جس دن یہ میں تینی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)۔“

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس تینی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری تھے اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آنکہ حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔ اس ضروری تمهید کے بعد جزا از را کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وہ وہاں لہادی الی الصواب۔

اصول جزا

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہل فلسفہ قانون قدرت اور اہل نہجہ تقدیر اور اندازہ الہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں، حالانکہ مادیات ہوں یا روحاںیات، ذہنیات ہوں یا علمیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان یہاں ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے پھر جس طرح دو اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی یہاںی کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تمذیب علاج کے ذریعہ بھی وہ شفایاں ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و متنابع

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب بیہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندر ورنی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے غرور اور خاکساری، بخشن اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدیلی، تقویٰ اور فتن، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے منہاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحاں اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعتی اشیاء میں ہے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوتوں کے جواہروں ہیں وہی جماعتیں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوتوں پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنس (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جانتا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحاں ایسا بعل اور آثار و متنابع کو جانتا اور بتانا ان بیانات کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام ”شریعت“ ہے، ان بیانات کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحاں و آثار و متنابع کے متعلق وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے، سایہ کا لوچی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے بحثیں میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول، عمل اور رد عمل کے جس اصول پر ہی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالی صالح کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آ جاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے بحثیں میں کوئی وقت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہ کافی دفعہ فرمایا گیا ہے:

﴿أَلْيَوْمَ تُجْزَوُنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ ۵۰ (الجاثیہ: ۲۸)

”جو تم کرتے تھے، آج وہی بدلہ پاؤ گے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا اوزن اہمارے ہی اعمال کے رد عمل (ری ایکشن) کا نام ہے۔ ایک اور جگہ ہے:

﴿لَيَعْلَمَ كُلُّ نَفِيسٍ بِمَا أَسْتَغْوَى﴾ (۱۵: ۲۰ طہ)

”تاکہ ہر جان کو اس کا بدل دیا جائے، جو وہ کرتی تھی۔“

ان آئینوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا اوزن اتمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں:

﴿فَأَصَابَهُمْ سَيِّئُتْ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهِزُونَ﴾

(۳۴ / النحل)

”تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھنڈھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔“

غرض جزا اوزن انہیں اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریع میں یہ اشارہ فرمایا کہ ”قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر بیہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزاۓ خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برابی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔“ *

حصول راحت کا اصول

یہ نظری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجله یعنی موجودہ اور آخڑہ یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجله) راحت کو پسند کر کے آیندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی لگاہ میں موجودہ راحت گوچھوٹی مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آیندہ ہو مگر وہ نیسہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ ”قدر اب نیسہ مگدار“ لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جو حکم میں ڈالتے ہیں، تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں، تاکہ دولت فردا سے وہ بہرہ مند ہوں ہر مہذب انسان اپنے بچ کو میں پھیپس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھومنک دیتا ہے، تاکہ اس کی آیندہ کی زندگی راحت و سرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایہ عزیز تکلیفیں انہا انہا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ دتی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائزگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۲ و ادب المفرد وبخاری، باب الظلم ظلمات: ۴۹۵۔

سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کر دیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائیٰ کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آیندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں، اسی لیے ایمان کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی گوارا کر لیں۔ جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہو گا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے گناہ گار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

﴿كَلَّا بْلَىٰ تُجِيئُونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُّونَ الْآخِرَةَ﴾ (٢١، ٢٠ / القبامة: ٥٧)

”ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آیندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔“ حالانکہ انسان اسی اصول کا رکورڈ دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتنے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آیندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا بھی کامیابی کی لشگری ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آیندہ کی دائیٰ لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیر پاراحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی اخراج نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو سخت کی دیر پاراحت کی خاطر قربان کرتے ہو۔ ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور پیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکتے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائیٰ خوشی نصیب ہو گی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

﴿وَجَزِيهُمْ بِمَا صَرَبُوا جَنَّةٌ وَّخَرِيزٌ﴾ (٦ / الدہر: ٧٦)

”اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو پانچ اور ریشم کے کپڑے اور مزدوری دی۔“ یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی، تاکہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

﴿حُقُّتُ الْجَنَّةِ بِالْمَكَارِهِ وَحُقُّتُ النَّارِ بِالشَّهَوَاتِ﴾

”یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔“ نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبرا تے ہیں اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس لیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دینانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لا انتہا لذتوں سے شاد کام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

******** جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ماجاه حفت الجنة بالمكاره: ٢٥٥٩۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَلَهُ الْقُوْسُ عَنِ الْهُوَىٰ فَإِنَّ الْجِنَّةَ هِيَ الْمُأْوَىٰ﴾

(٤١، ٤٠) النازعات: ٧٩)

”لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور قفس کو ناجائز تتوں اور خوشیوں سے باز رکھا، تو جنت اس کا نہ کھانا ہے۔“

نامہ عمل

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بلا حکم خدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو کپڑا پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوام وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہوا ہے۔ قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿هُنَالِكَ تَبْلُوُ الْكُلُّ نَفِيسٌ مَا أَسْلَفتُ﴾ (٣٠/ یونس: ١٠)

”اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمائے گی۔“

﴿كُلُّ نَفِيسٍ يَمْاَكِبَ رَهِيْنٌ﴾ (٢١/ الطور: ٥٢)

”ہر آدمی اپنے عمل کے بدله گرو ہے۔“

﴿كُلُّ نَفِيسٍ يَمْاَكِبَ رَهِيْنٌ﴾ (٧٤/ المدثر: ٣٨)

”ہر جان اپنے عمل کے بدله گرو ہے۔“

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يُرَدُّهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يُرَدُّهُ﴾

(٧، ٨) الزلزال: ٩٩)

”تو جو کوئی ایک چیزوں بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چیزوں برادری کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا۔“

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفِيسٍ مَا عَمَلْتُ مِنْ خَيْرٍ فُحْضَرٌ وَمَا عَمَلْتُ مِنْ سُوءٍ﴾

(٣/ ۲) آل عمران:

”جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے، ان کو موجود پائے گی اور جو بردے کام کیے وہ بھی۔“

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثابت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی تہائی میں بولا جائے، خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کوں کر حفظ کر لیتے ہیں:

﴿إِذْ يَتَّلَقُ الْمُتَّلَقِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَاءِ قَعِيدُونَ مَا يَلْفِطُ مِنْ قَوْلِ إِلَّا دِيْهُ رَقِيبٌ عَتِيدُونَ﴾ (۱۷، ۱۸/ ق: ۵۰)

”جب دو لینے والے داہنے اور باسیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک مگر ان اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔“
کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

﴿أَمْ يَحْسِبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ طَبَّالٍ وَرَسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾

(۴۳) / الزخرف: ۸۰

”کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال لکھتے ہیں۔“

﴿إِنَّ رَسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَنْهَرُونَ﴾ (۲۱/ یونس: ۱۰)

”بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔“

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور اپنی علم و شہادت کو ظاہر رکرتا ہے:

﴿وَمَا لَكُونُ فِي شَأنٍ وَمَا تَنْلُو هِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا﴾

﴿إِذْ تُقْيِضُونَ فِيهِ﴾ (۱۱/ یونس: ۱۰)

”اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں، جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔“

کبھی یہ کہا کہ ہر انسان کا نامہ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فر عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھلو۔ فرمایا:

﴿وَكُلَّ إِنْسَانٍ الْأَزْمَعَةُ طَيْرَةٌ فِي حُقْقَهٖ وَكُخْرُجَةٌ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كَيْفَا يَكْلِمُهُ مَنْشُورًا﴾ اقْرَا

﴿كَلِمَكَ طَكْفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ (۱۳، ۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۴)

”اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن، ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، اپنا دفتر پڑھ لے آج تیر انفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔“

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامہ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹرنے سمجھے تو سمجھ سکتا

ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جس طرح کاغذ اور جھر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمال انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْجُنُجُورِ مُشْفَقِينَ مَتَّا فِيهِ وَيَوْلُونَ لَوْلَكُتَّا مَالٌ هَذَا الْكِتَابُ
لَا يُغَادِرُ صَفِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا حَصَّهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ
أَحَدٌ﴾ (۱۸ / الکھف: ۴۹)

”اور نامہ اعمال رکھا جائے گا تو، تو دیکھئے گا گناہ گاروں کو، اس میں جو لکھا ہے اس سے ذرر ہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کی ظلم نہ کرے گا۔“

با ایس ہمسہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامہ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، ہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے چیخپے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا براثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

﴿كُلُّ إِنْسَانٍ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَكُلُّ أَنْفُلٍ مَعَذِيرَةٌ﴾ (۷۵ / القیامہ: ۱۴)

”بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگر چہ وہ اپنے غدر رہا شتا ہے،“

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلو ہو جاتا ہے:

﴿كَلَّا لِمَ عَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (۸۲ / المطففين: ۱۴)

”نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھے گیا ہے۔“

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ”جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ و انبات کرتا ہے اور آئیدہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دارہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔“

* ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سوره وبل للطففين: ۳۳۳۴

اسی طرح سے وہ اپنے اعضا سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑو، اسی عالم ظاہر میں تاثر نے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے:

﴿يُعَرَّفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَهُمْ﴾ (۵۵ / الرحمٰن: ۴۱)

”کہنگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔“

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوندِ عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفسِ انسانی کے اعمال بد پر گواہی دے دیں تو تужب کی کیا بات ہے، فرمایا:

﴿وَأَمْتَازُوا إِلَيْهِمْ أَنَّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ أَكْمَلَ عَاهِدَ الْيَمِّ لِيَقِنَّ أَدْمَانُ لَا تَعْبُدُونَا الشَّيْطَانُ ۝ إِنَّكُمْ عَدُوُّنَا مُبِينُ ۝ وَأَنْ اعْبُدُونِي ۝ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ وَلَقَدْ أَهَلَّ مِنْكُمْ جِيلًا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُنُوا تَعْقِلُونَ ۝ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي لَنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ إِلْصَوْلُهَا الْيَوْمَ يَهْبَأُنَتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ أَلَيْوْمَ تُخْزَنُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَلَكُلِّمَنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشَهَّدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝﴾ (۶۵-۵۹ / ۳۶ / یعنی: ۶۵-۵۹)

”اے گناہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ..... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کروتوں کی گواہی دیں گے۔“

﴿وَيَوْمَ سَبِّحُرُوا عَدَاءَ اللَّهِ إِلَى التَّارِقَةِ مُبَوِّعُونَ ۝ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهُمْ شَهَدَ عَلَيْهِمْ سَمَاعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِيَعْلُو دِهِمْ لَعَلَّ شَهِدُنَّمْ عَلَيْنَا ۝ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۝﴾ (۲۱-۱۹ / حُمَّ السَّجْدَة: ۴۱)

”اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ باٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کروتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔“

اس لیے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکر

اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر شفی پاتا ہے تو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا بے دلوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہو گا اور دوسرا زیادہ یا دلوں برابر دو ماڈی چیزوں کے درمیان تقاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تعلیم یا گتنے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ثہیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملنے گا، فرمایا:

﴿جَزَاءُ فَاقْتَلَ﴾ (النَّبَاءٌ: ٧٨) “پورا پورا بدلہ۔”

اس برابری اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

﴿فَلَنَكُفَّرُنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَابِرِينَ وَالْوَزْنُ يُوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ تَكَلَّتْ تَوَازِينُهُ كَأَوْلَئِكَ هُمُ الْفَقِيلُونَ وَمَنْ حَفَّتْ مَوَازِينُهُ كَأَوْلَئِكَ الَّذِينَ حَسِرُوا أَنفُسَهُمْ﴾

(الاعراف: ٩٧)

”پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سوہی ہیں جو اپنی جائیں ہار جیئے۔“

﴿فَأَتَامَنْ تَكَلَّتْ مَوَازِينُهُ كَهُوَ فِي عِيشَةٍ قَرَاضِيَةٍ وَأَتَامَنْ حَفَّتْ مَوَازِينُهُ كَفَمَةَ هَاوَيَةٍ﴾

(القارعة: ٩٦)

”تو جس کی تول بھاری ہوئی، تو وہ خوش عیش میں ہو گا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہو گی۔“

ان دلوں آتیوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے۔ پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے سراحت حق و عدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الہی میں موجود ہو گا اور وہ کسی طرح کم و بیش نہ ہو گا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

﴿أَنَّهُ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ﴾ (الشوری: ٤٢)

”وَاللَّهُ جَسَنَ لَهُ كِتَابٌ كُوْنَ كَسَاتِحَهَا تَارَا وَرَمِيزَانَ كَوْ“

یعنی کتاب الہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے،

(طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کا نات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

﴿وَوَضَعَ الْيِزَانَ﴾ (الرحمن: ۷) (۵۵ / الرحمان: ۷) ”اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔“

حساب

کمی بیشی کے علم کا دوسرا اطریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعمال استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورہ انبیاء میں یہ مفہوم ہر یہ تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح تبھی میں آتی ہے، فرمایا:

﴿وَنَضَمُّ الْمَوَازِينَ الْقُسْطُ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُنْظَلِمُ نَفْسٌ شَيْئًاٌ وَإِنَّ كَانَ مُشْكَلَ حَيْثُ مَقْنَ

﴿خَرْدَلٍ أَتَيْنَا يَهَا مَا وَكَفَى بِنَا حَسِيبِينَ﴾ (۲۱ / الانیاء: ۴۷)

”اور ہم قیامت کے دن کے لیے ترازو میں یعنی انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں، حساب کرنے والے۔“

اس آیت سے دو باتیں بھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں جھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن ہر حال وزن و حساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت و وزن

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا غشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمال بد سے پر بیز پر رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلق انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الہی کی تعلیم کرے، تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور معمودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی ملتی ہیں بہشت ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کی تلافی اور گرگشته حیات فانی کے اعمال بد کے نتائج سے پا کی حاصل ہوگی وزن

ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو توراة اور قرآن پاک میں مذکور ہے، وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں، بلکہ وہ حقیقت انسانی کی پچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو

اپنے فضل سے جس جنت میں جگدی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿إِنَّ جَاءَكُلُّ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (٢٠ / البقرة)

”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشیں گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنایا اشارہ رکھتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا:

﴿قُلْنَا أَهِبُّوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِنَّمَا يَاتِيهِنَّمُ مِنْيٰ هُدًى فَمَنْ تَتَّبِعَ هُدًى إِنَّ فَلَأَخْوُفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَجْزِئُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَلَكَذَّبُوا بِآيَتِنَا أَوْ لَكَ أَصْلَحْتُ النَّارَ هُمْ فِيهَا لَخِلْدُونَ﴾

(٣٩، ٣٨ / البقرة)

”ہم نے کہا، تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو اس کو نہ ڈر ہو گا نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں رہا کریں گے۔“

﴿قَالَ أَهِبُّا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِيَعْضِدُ عَدُوًّا فَإِنَّمَا يَاتِيهِنَّمُ مِنْيٰ هُدًى لَا فَيَنْتَهُ عَنْهُمْ هُدًى إِنَّمَا يَرِيَضُ وَلَا يَتَفَلَّ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِنِي فَإِنَّ لَهُ مَوْعِيشَةً ضَنِّيَا وَكَثِيرَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٤، ١٢٣)

”خدانے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہو گا اور نہ بدجنت ہو گا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کے لیے تنگ معاشر ہو گی اور قیامت میں ہم اس کو اندرھا اٹھائیں گے۔“

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پیچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، تورات کی رو سے آدم علیہ السلام کو اسی نیک و بد کی پیچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے

اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخوندانے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدا کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا (سنن تکوین ۲)

”اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے عُم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھراں سے کھائے گا اور وہ تیرے لیے کا نئے اور اونٹ کثارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسند کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھرنا جائے۔“

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو رکھا تھا تصریح کرد کرنیں، لیکن ایک آیت سے اشارۃ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ”یہ حیات جادید اور ملک جاوداں کا درخت ہے۔“ مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ”برہنگی کا علم“ ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَنُ قَالَ يَا آدُمُ هَلْ أَدْلُكَ عَلَى شَجَرَةِ الْغُلْمَلِ وَمُلِكٌ لَا يَبْلُلُۚ فَأَكَلَاهَا فَبَدَدَتْ لَهُمَا سَوَادَهَا﴾ (۱۲۰: ۱۲۱) (طفہ: ۲۰)

”شیطان نے آدم کو دوسرو دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاوداں اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیز ان پر کھل گئیں۔“

اب سوال یہ ہے کہ ”حیات جاوداں“ اور ”غیر فانی باوشاہی“ سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے درسر بیمیش رہنے کا سختم کو بتاؤ؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مَوَاجِدِ کی بنیاد ہے۔ ہر دن مخلوق بلکہ ہر دن انسان جو اس اور اک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مَوَاجِدِ سے بھی گرانا بہتیں ہے، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ اس کے سرڈاں اگئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز نظری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا:

﴿وَنَقْيَسْ وَمَا سَوَّهَاۚ فَلَهُمَا فَجُورُهَا وَسَقْوَهَاۚ﴾ (الشمس: ۹۱) (۷: ۸)

”اوْنُفُس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر فس میں اس کی بدی اور نیکی کو الہام کیا۔“

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجَهَالِ فَأَكَبَّنَ أَنْ يَحْمِلُنَّهَا وَأَشْفَقُنَّ مِنْهَا

وَحَمَّلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ طَلُومًا جَهُولًا لِيُعَذَّبَ اللَّهُ الْمُنْتَقِيَنَ وَالْمُنْفَقِيَنَ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشَرِّكَتِ وَيَنْبُوَبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا

(٣٣/الاحزاب: ٧٢، ٧٣)

”هم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آئیا تو پھر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں، شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھا لیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی تبتھ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی تبتھ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے سختی خبریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا انتقاما یہی ہے کہ گناہ کاروں کو معاف کرے اور نیکو کاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کاراپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں بنتا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الہی جو انسان کی بیداری سے تھی اس صورت سے پوری ہوئی اور وہ حیات جاویدا اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضاۓ الہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی عمل پر موقوف رکھا تھا اور جیسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت و اتفاق سے دلوادیا چاہا تھا بالآخر اس کا ملتا تقدیر الہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی و جدوجہد اور اس کے مطابق سعی عمل کے ذریعے سے مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا:

﴿فَلَمَّا أَهْطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَأَقَاتَاهَا يَأْتِيَكُمْ قِبْلَتُ هُدًى فَمَنْ تَعَزَّزَ هُدًى إِذَا فَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ بَعْرَثُونَ﴾ (٢/ البقرة: ٣٨)

”یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی تو ان کو نہ ڈر ہو گا نہم۔“

﴿قَالَ أَهْطِطُ مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِيَعْضِنَ عَدُوَّهُ فَإِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ قِبْلَتُ هُدًى لَّهُمْ هُدَى إِذَا فَلَّا يَبْيَضُّ وَلَا يَشْقَى﴾ (٢٠/ طہ: ١٢٣)

”تم دونوں یہاں سے بیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے راہنمائی آئے تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ

بد بخت۔“

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیات جاوید اور ملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے ذریعہ اسی حیات باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو مزدوم معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہی ہے:

﴿فَلَا يُحِبُّ حَيَّنَمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْفِيٰ إِنَّ لَكَ أَلَا تَجُودُ عَفْيَهَا وَلَا تَغْرِيٰ ۝ وَإِنَّكَ لَا تَظْمُنُهَا فِيهَا وَلَا تَضْلِيٰ ۝﴾ (۲۰ / طہ: ۱۱۷، ۱۱۹)

”تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کر دے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ اور جنت میں تجوہ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہو گا، نہ ننگا، نہ پیاسا ہو گا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔“ آدم علیہ السلام اس جنت سے نکلنے کو بھوک بھی لگی اور ننگے بھی ہوئے پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آ کر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا۔ یہی انسان کی چار محض ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا وہوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا اور انہیں کے تیار کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام ترتیجہ کو مصروف کر دیا اور اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصولی معاملات اور اخلاقی انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے، تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے، عرفانِ الہی (عقائدِ صحیح) اور عبادت و اطاعتِ الہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے:

﴿أُولَئِكَ هُمُ الْوَرِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرْثُونَ الْفِرَدَوْسَ ۝ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝﴾

(۲۳ / المؤمنون: ۱۰، ۱۱)

”یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی۔ چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

﴿وَفِيهَا مَا لَشَّهَدَهُ الْأَنْفُسُ وَتَلَكُّدُ الْأَعْيُنُ ۝ وَأَنْتُمْ فِيهَا حَلِيدُونَ ۝ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُرْتَشَتُهُا إِلَيْكُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾

(۴۳ / الزخرف: ۷۱، ۷۲)

”اور اس (جنت) میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔“

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا:

﴿وَنُودُوا أَنْ تَلْكُمُ الْجِنَّةُ أُولَئِنَّوْهَا لَيَأْكُلُنَّمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۷/ الاعراف: ۴۳)

”اور ان کو پا کر کہہ گا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔“

ملت توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاوں کا ایک فقرہ یہ یہی تھا:

﴿وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَتَةٍ جَنَّةَ التَّعْبُوٰةِ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۸۵)

”اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں کر۔“

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لا زوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ”تقویٰ“ ہے۔

﴿تِلْكَ الْجِنَّةُ الَّتِي نُورِتُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ (۱۹/ مریم: ۶۳)

”یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے، جو تقویٰ والا ہو گا۔“

انسانی جزا اور سرا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دار آخوت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا اور سرا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسرا منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وہی محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا ہے، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا اور تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے گواں کامیابی و ناکامی کے سختے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سرا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کار و بار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مرت جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنائے گا تو فانی انسانوں کو دوائی زندگی کے لیے پیدا کیا

”خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔“

یہ بھی انہیں سے وعدہ ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُسْتَغْفِرُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا أُسْتَغْفَفُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۵۵/ النور: ۲۴)

”خدا نے ان سے جو تم میں میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے الگوں کو حاکم بنا یا تھا۔“

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پاکدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی تدریجی تقویت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسن عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَلُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَدَّا رِبْلَا الْآخِرَةَ خَيْرٌ وَلَعِظَمَ دَارُ الْمُتَقِينَ﴾

(۳۰/ التحلیل: ۱۶)

”جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے اور بے شے آخوندگی کا گھر بہتر ہے اور پرہیز گاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔“

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسولی کو بھی، فرمایا:

﴿خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۱۱/ الحج: ۲۲)

”اس نے دنیا اور آخوندگی کا نقصان اٹھایا۔“

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خُزْنَةٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۱۱۴/ البقرة: ۲)

”ان کے لیے دنیا میں رسولی ہے اور آخوندگی میں بڑی مار ہے۔“

﴿خَطَّتْ أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲۱۷/ البقرة: ۲)

”ان کے کام دنیا اور آخوندگی میں بر باد ہوئے۔“

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا:

﴿فَأَعْذِبْهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۵۶/آل عمران: ۳)

”تو میں ان کو دنیا اور آخوندگی میں سخت سزا دوں گا۔“

شیعی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكاً وَمُخْسِرَةً يَوْمَ الْقِيَمةِ أَعْنَى﴾

(۱۲۴ / طہ: ۲۰)

”اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے نگ گز ران ہے اور قیامت میں اس کو اندرھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندر ہا بنا تھا۔“

انتہای ہے خود صاحب کو حکمِ احمد میں جرخ نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروغ زاشتوں کا شرہ بتایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ التَّقْوَى الْجَمِيعُونَ إِنَّمَا اسْتَرْلَهُمُ الشَّيْطَانُ بِعَضْ مَا كَسَبُوا﴾

(۱۵۵ / آل عمران: ۳)

”تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں جو پیچھے ہے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔“

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

﴿وَمَا آَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِيهَا كَسْبٌ أَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْعَنْ كَثِيرٍ﴾

(۴۲ / الشوریٰ: ۳۰)

”جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگز رکرتا ہے۔“

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

﴿صُرِيتُ عَلَيْهِمُ الدِّلْلَةَ إِنَّمَا تُقْتَلُوا لَا إِحْيَيْلَ مِنَ اللَّهِ وَحْيَلٌ إِنَّ النَّاسَ وَيَأْمُوْرُوْعَضِيْبٌ مِنَ اللَّهِ وَصُرِيتُ عَلَيْهِمُ الْمُسْكَنَةَ ذَلِكَ يَا لَهُمْ كَانُوا يَكْفُرُوْنَ بِاللَّهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكَ يِهَا عَصُوْا وَكَانُوا يَعْتَدُوْنَ﴾ (۱۱۲ / آل عمران: ۳)

”ان پر ذات ماری گئی، جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت حاصل ہے)، وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کمالاً تھے اور ان پر (قوی) احتیاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مارڈالتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدودِ الہی سے آگے بڑھتے ہیں۔“

اس کے مقابلِ عامِ الہی کتاب سے کہا گیا:

﴿وَلَوْ أَكْهَمْ أَقَامُوا التَّوْرِيْةَ وَالْأَنْجِيلَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُمْ قِنْ رَبِّهِمْ لَا كَلُوْمَ لَا فَوْقَهُمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ (۵ / المائدۃ: ۶۶)

”اور اگر یہ تواریخ اور انجلیل کو اور جوان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتا را گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکات آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے

(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔“

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْاَنَّ أَهْلَ الْقُرْبَىٰ أَمْنُوا وَأَتَقْوَىٰ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوكُمْ فَأَخْذَنَّهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۹۶/الاعراف)

”اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کو حکولتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔“

مگر یہ دارالجزاء فانی ہے

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے، جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گوانسان کو اعمال کی جزا اوسرا کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزاء، جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کافی بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتها نہیں بنانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربائی سلطنت ہے جو فناوزوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو نہ بھول جانا چاہیے، اس مسافر کی عقل سیم کی داد کوں دے گا جو راستہ کی عارضی خوش مظنویوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سوا اور سدا بہار و طلن کو فراموش کر بیٹھے:

﴿لَذْنُ تُؤْتَيُونَ الْحَيَاةُ الدُّنْيَاۚ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقَىٖ﴾ (۸۷/الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷)

”بمکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پاکدار ہے۔“

﴿وَلَاَجُوْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ﴾ (۱۲/یوسف: ۵۷)

”اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔“

اور اسی طرح گناہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذات و رسوائی کا مقام ہے:

﴿فَإِذَا قَاهُمُ اللّٰهُ الْحُزْنَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَاۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرٌ۝ تُوْكَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (۷۰)

(۳۹/الزمر: ۲۶)

”تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شہنشہیں کہ آخرت کا عذاب

اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے۔“

اس دنیا کی ذلت و رسائی تو شاید سہہ لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی بختی کوون سہہ سکتا ہے کہ
﴿وَلَعْذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُ وَأَنفَقٌ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۷)

”آخرت کا عذاب البت تر زیادہ سخت اور زیادہ دیر ہے والا ہے۔“

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جوز و روت، جاہ و جلال، نعمت و مال اور حکومت و سروری ملے ان کو بھی آخرت کی لا زوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی با دشائی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پانداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا أَنْكَرَ اللَّهُ الدَّارُ الْآخِرَةُ وَلَا تَنْسَ نَعِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسَنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۸ / الفصل: ۷۷)

”اور خدا نے جو تجوہ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ بھول اور جس طرح خدا نے تجوہ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔“

چنانچہ نا خلف یہود پر بتاہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کر ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

﴿فَلَمَّا كُنْتُ بَعْدَهُمْ خَلَفْ وَرَثُوا الْكِتَبَ يَا خُدُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَذْلِي وَيَقُولُونَ سَيِّعْفَرُ لَنَا وَلَنْ يَأْتِيهِمْ عَرَضٌ قُشْلَةٌ يَا خُزُودٌ أَلْمَرْ يُؤْخَذُ عَلَيْهِمْ قِيَامَقُ الْكِتَبِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَنِ اللَّهِ إِلَّا لَحِقَ وَدَرْسُوا مَا فِيهِ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَنْقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (۷ / الاعراف: ۱۶۹)

”تو ان کے بعد کچھ نا خلف کتاب کے وارث ہوئے، جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو گا اور اگر ویسا ہی سامان و اسbab پھر آئے تو پھر لمیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا، کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پر ہیزگاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔“

یہ دار الحجرا اور دار الاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا داگی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی

گئی کہ وہ اس زمانے میں اس سدا بھار سر زمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسرا مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زد فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبلے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کیے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نهى عن الممنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے اوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مقرر کیے۔

① نیکی سے برائی کا کفارہ: چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول و دلیعات کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے جسم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتناز بروست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام الگی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے اسی کا نام کفارہ عمل ہے، چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

﴿إِنَّ الْعَسْنَتِ يُدْهِنُ الشَّيْأَتِ﴾ (۱۱: هود: ۱۱)

”بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔“

اس آیت کا یہ بھی مفہوم ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکی کار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجے کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآءِ مَا لَنْهُوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرُ عَنْكُمْ سَيِّئَاتُكُمْ وَنُذْخِلُكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾

(۳۱/ النساء: ۴)

”تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تفصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔“

﴿لَئِنْ أَقْتَمْتُ الصَّلَاةَ وَأَتَيْتُ الزَّكُوةَ وَأَمْنَمْتُ بُرُولِيَّ وَعَزَّزْتُ مَوْهُومَ وَأَفْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضاَ حَسَنَاتَ الْكَفِرِنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتُكُمْ وَلَا دُخْلَلُكُمْ جَنَّتَ تَجْرِي مِنْ تَحْمِلَ الْأَنْهَارَ﴾

(۵/ المائدۃ: ۱۲)

”البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لا اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے، تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں

داخل کروں گا، جن کے نیچے نہیں بہتی ہیں۔“

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ تَقْتَلُ عَنْهُمَا حُسْنَ مَا عَمِلُوا وَنَجَأُوْزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْلِبِ الْجَنَّةِ﴾

(الاحقاف: ۱۶)

”یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو (اور) جنتیوں کے (شمول) میں ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگز رکریں گے اور یہی ہیں رہنے والے جنت کے۔“

② توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک ہتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگز اشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آیندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کر لے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گناہگار سے گناہگار انسان کو بھی خدا کے آغوش محبت میں لا کر داں دیتی ہے، آدم عليه السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت اللہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح گناہگار انسان کو داہیں لینے کے لیے ہمیشہ دار ہتی ہے، رحمت اللہی کے اس پر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مددم اور انجیل کی خوش خبری مجسم ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیامربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح وسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ العالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَأَمَّنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا﴾

(مریم: ۶۰)

”مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے، تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔“

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلانی اس کے گناہوں کے سارے دفتر ہو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَأَمَّنَ وَعَمِلَ عَمَّلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُرْدَى اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتِ طَوْكَانَ اللَّهُ غَفُورًا وَحَمِيمًا﴾

(الفرقان: ۲۵)

”مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

اور یہی اس کی شان رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ذاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان

کو بھی بشارت ہے:

﴿كَمْ تَأْبَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمٍ وَّاصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ إِنَّمَا تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَيْعَدْ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (۴۰، ۲۹) (۵/۵ / المائدۃ)

”تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کوسدھا را، توبے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا کہ اللہ بخشنے والا ہم بان ہے، کیا بچھنے نہیں معلوم کر آتا ہوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے جس کو چاہے سزادے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“
اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرمادیا کہ

﴿وَإِنَّ لَفَقَارَ لِمَنْ تَأْبَ وَأَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا مُّهَاجِرَةً﴾ (۸۲/۲۰ / طہ)

”اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر رواہ پر چلا۔“

لیکن یہ توبہ کس لیے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

﴿إِنَّمَا التَّقْوَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلَيْهَا حَكِيمًا وَيَسِّرِ التَّقْوَةَ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّيَّابَ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَحَدُهُمُ الْمَوْتَ قَالَ إِنِّي دَبَّتُ النَّفَرَ وَلَا الَّذِينَ يَعْوَذُونَ وَهُمْ لَغَافِرُونَ﴾ (۱۸، ۱۷ / النساء)

”اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برآ کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں، تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برقے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی اور ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔“

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آیندہ تلائی اور مدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمت اللہ اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

﴿وَالَّذِينَ عَمِلُوا الصَّيَّابَ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَأَمْتَوْا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۵۳)

”اور جنہوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد بازاڑے (توبہ کی) اور یقین کیا، توبے شک

تیرا پر در دگار اس کے بعد اس کو بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔“

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أُوْيَظَلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهُ يَجِدُ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾

(٤/ النساء: ١١٠)

”اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشنش والا رحم کرنے والا پائے گا۔“

③ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ: دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسرا نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرفراز سے مت巴ہ اور ہمیار ہو کر آمادہ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محسان کے جو ہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انہیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غالباً انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی بھی کسی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیز نہیں کہ ان کی بدولت مخدے ملدا انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت کا میابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتنا اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو لکھنا ہی بھولا ہوا اپنی دولت و نژادت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتادے دوچار ہوتا ہے تو دفعۂ اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، ہنگ دستی، عزیزوں کی موت، آزوؤں کی ناکامی، ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست را گیر بھی ایک دفعہ چونکہ ہمیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستے کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جور و حانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو، اس سے پہلے کہ ان کو بہاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و صلاح کی فکر کریں، فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَا إِلَّا فِرْعَوْنَ بِالسَّيِّئِينَ وَلَقَعِيْسَ قِنْ الْكَفَرِ لَعَلَّهُمْ يَذَكَّرُوْنَ ﴾

(٧/ الاعراف: ١٣٠)

”او ربے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور بچلوں کی کمی کی مصیبتوں میں گرفتار کیا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔“

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

﴿وَبَيْتُهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالشَّيْءَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾ (۱۶۸: الاعراف)

”اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا، تاکہ وہ شاید بازاں میں۔“

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیکی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَبِيٍّ إِلَّا أَخْذَنَا أَهْلَهَا إِلَيْأُسَاءَ وَالضَّرَّاءَ لَعَلَّهُمْ يَكَرَّرُونَ﴾ (۹۴: الاعراف)

”اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو نعمتوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، تاکہ شاید وہ گزگرا نہیں۔“

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

﴿وَلَنَبْتُلُوكُمْ شَيْئًا عِنِ الْخُوبِ وَالْجُوْعِ وَتَقْعِيسُنَا مِنَ الْأَمْوَالِ وَالآنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ طَوْبَى
الظَّرِيرَى نَفَرَّتُ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ رَجُوْنَ ﷺ أَوْلَى
عَلَيْهِمْ صَلَوةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأَوْلَى كُلُّهُمُ الْمُهَتَّدُوْنَ﴾ (۶: البقرة)

(۱۵۵-۱۵۷: البقرة)

”اور بالبته ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور پھولوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوش خبری سنائے کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستائی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور حمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔“

اسی اصول کے تحت میں احادیث صحیح میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری («مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَيْهُ») (۴: النساء: ۱۲۳) ”جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔“ تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو بخار آجائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچو وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف سفرہ اور کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سوتا۔“ دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنادیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے

* یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں میں مثلاً: ترمذی، ابواب التفسیر و من سورۃ النساء: ۳۰۳۸؛ سنن ابن داود، کتاب الجنائز، باب عيادة النساء: ۹۳، ۳۰۹۳؛ ابن کثیر، ۲/ ۳۸۲۔

کوئی کائنات پچھے جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے۔^۱ تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کائنات پچھے جائے تو وہ بھی۔^۲ پہنچی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کائنات پچھنے سے لے کر اوپر تک پہنچنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھوڑ جاتے ہیں۔^۳ پانچویں روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرکب ہوا اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف بنانے والی ہے۔^۴

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصالحت پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پاسکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نہ کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَنُذِيقُهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْلَى ۚ وَنَعْذَابُ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

(۲۱/ السجدۃ)

”اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ پکھاتے ہیں، تاکہ وہ اب بھی بازاً کمیں۔“

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبات نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعْدَ إِيمَانِ أَشْكَرُهُمْ وَأَمْنَهُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلَيْهِمْ﴾

(۴/ النساء: ۱۴۷)

”اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاو کر خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جانے والا ہے۔“

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آیندہ گناہوں سے بچانے اور گزشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے اور عالم بر زخ اور عالم بعثت میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اس لیے ان دونوں مقاموں میں آیندہ کوئی سوال

^۱ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارۃ المرض: ۵۶۴۰۔

^۲ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارۃ المرض: ۵۶۴۱، ۵۶۴۲۔

^۳ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب شدہ المرض: ۵۶۴۷۔

^۴ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب فی المشیة والارادۃ: ۷۴۶۸۔

نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گزشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالم بزرخ اور عالم بعثت کے عذابوں کا مقصد ہے الیہ کہ پروردگار عالم خدا پر رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عداب بزرخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھوکر پا کر وصف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی عالم بزرخ میں اپنے اعمال بدکی مناسب سزاوں میں تکلیفیں اٹھا کر پا کر وصف بننا پڑے گا، یہی عالم بزرخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہو گا کہ عالم بزرخ کی یہ سزا اسیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف چیز آتی ہے اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوہ خد میں عالم بزرخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر بچنی کر بھی اگر ہم ان سزاوں کے ذریعہ پا کر وصف ہو سکیں تو پاک و صاف ہو کر اپنی سوروثی بہشت کے قابلِ بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتكب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتكب ہوئے مگر اعمال نیک، توہہ اور مصائب میں صبر و شکر کر کے یا بزرخ میں سزا پا کرو گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذاب بزرخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے اور یہ اسلام کے اصول سے متربع ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب بزرخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہو گا، قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایۃ نکلتی ہے:

﴿وَلَكُفَّاً أَجْلَنَا الَّذِي أَجْلَتْ لَنَا مَا﴾ (٦/الانعام: ١٢٩)

”اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا بخیچ چکے۔“

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایۃ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمر ((ان طول مقام امتی فی قبورهم تمحيض لذنبهم)) * * *

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرنا ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

((الضمة فی قبر کفارۃ لکل مومن لکل ذ نب بقی علیه ولم یغفرله)) *

* کنز العمال، باب عذاب القبر، ج ۸، ص: ۹۶۔ * ایضاً

”یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے۔“

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

((اکثر عذاب امتی فی قبورهم))

”میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔“

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) فنا یہ ہے کہ امت محمد یہ کے اکثر افراد اسی بزرخ کے محدود زمانہ عذاب میں لکھ رکا رہا پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فَانْ وَفَتْ بِالْخَلاَصِ مِنْهَا فِي هَذِهِ الدَّارِ وَالْأَقْفَى الْبَرْزَخُ فَانْ وَفَى بِالْخَلاَصِ

وَالْأَفْفَى مَوْقِفُ الْقِيَامَةِ وَاهُوَ الَّهُ مَا يَخْلُصُهُمْ مِنْ تِلْكَ الْبَقِيَةِ۔

”اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر و رزق بزرخ کی سزا سے اس کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہو گیا تو خیر و رزق پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہوتا کیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔“

رویائے بزرخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گزر چکی ہے، وہ مظہر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گناہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مسخر قرار پائے ہیں غالباً انہی نجات پانے والے مونوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

﴿وَيَوْمَ يَعْشَرُهُمْ جَيْعاً بِعَشَرَ الْحِجَنِ قَدْ أَسْتَلَّنَرْتُمْ مِنَ الْأَئْمَسْ وَقَالَ أَوْيَلَهُمْ قَنَ الْأَئْمَسْ رَبَّنَا اسْأَمْتَعْ بِعَضُنَا بِعَغْسٍ وَبَلَغْنَا أَجْلَنَا الَّذِي أَجْلَتَنَا﴾

(الانعام: ۱۲۹)

”اور جس دن وہ ان سب کو کٹھا کرے گا، اے گروہ جن، تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بحالیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے تھہرایا تھا پہنچ چکے۔“

یہ الفاظ کہ ”ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے“ یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم بزرخ کا مقررہ دورہ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے بعض دوسرے نیک بخنوں کی طرح ہم کو بھی اب چھکارا لٹے۔ جواب ملے گا:

● اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے جیۃ اللہ البالغ، باب الواقع الحشری، ج ۱، ص: ۲۹ میں لفظ کیا ہے، لیکن میں اس کا صل مأخذ معلوم نہ ہو سکا۔

● شفاء العلیل لابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر، ص: ۲۲۴۔

﴿قَالَ النَّارُ مَنْوِيْلَمْ خَلِدِيْنَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ طَإَّ رَبِّكَ حَكِيمٌ عَلَيْهِ﴾

(٦/ الانعام: ١٢٩)

”فرمائے گا آتشِ دوزخ تھماڑھ کانا ہوا، اس میں سدار ہو گے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے، بے شک تیراب حکمت والا اور علم والا ہے۔“

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورہ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گاتم کو اس سے نجات دے گا اس کا ہر کام علم و حکمت پرمنی ہے اس کے علم و حکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہو گاتم کو نجات ملے گی۔ *

عذاب دوزخ کفارہ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے کہ

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ إِلَيْكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَأَمْنَثْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلَيْهِمَا﴾

(٤/ النساء: ١٤٧)

”خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو اور ایمان لاو تو خدا تمہاری شکرگزاری کو قبول کرنے والا (اور تمہارے دلوں کے حال کو) جانے والا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ گناہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گناہگار بندے اس عذاب میں بستلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں۔ جس وقت آدم علیہ السلام کو جنت کی سرز میں سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے انتھاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ تانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

﴿إِهِيْطُوا مِنْهَا حَمِيْعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنْيَ هُدَى فَمَنْ تَبَعَ هُدَى إِنَّ فَلَأَخْوُفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزُنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَلَكُمْ بِأَيْتَنَا أُولَئِكَ أَصْحَبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾

(٢/ البقرة: ٣٨، ٣٩)

”یہاں سے تم سب اتر و تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ناشکری کی اور جماڑی نشانیوں کو جھلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔“

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذاب دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بال مقابل ہیں

* حسب تفسیر ابن عباس، ابن حجر بر طبری، ج ۸، ص: ۲۴ مصر۔

اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان اتحقاقی جنت کی شرطیں اور کفر ان اور تکذیب اتحققaci دوزخ کے اساب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ اور تمام برائیاں کفر ان اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا غیظ و غضب کے اظہار کے لیے نہیں۔ فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأُمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَلَمَّا فَرَأَيْتُمُّنَا أَنَّ يَكْتُلُهُنَا وَأَشْفَقُنَّ مِنْهَا وَحَمَلَهُنَا الْإِنْسَانُ طَإِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا لَّيَعِذَّبَ اللَّهُ الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقُونَ وَالْمُشْرِكُونَ وَالْمُفْرِكُونَ وَيَتَوَبُ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (۳۳/الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

”ہم نے یہ امانت آسانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھایا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو زرا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشش والا اور رحمت والا ہے۔“

اس آیت پاک سے ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و حیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفت ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے وہ اس پر کو رحمت الہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

﴿فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنفَسُهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (۹/التوبۃ: ۷۰)

”اللہ نے تھا کہ ان پر ظلم کرتا ہیں ایکیں وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔“

﴿وَمَا لِلَّهِ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَبَادَةِ﴾ (۴۰/المؤمن: ۳۱)

”اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے نہیں چاہتا۔“

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

﴿لَتُهْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا أَسْتَعْنَى﴾ (۲۰/طہ: ۱۵)

”کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدله دیا جائے گا۔“

اس لیے بہشت ہو یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا نتیجہ سیرابی، بھوک کا نتیجہ تکلیف، یہاری کا نتیجہ بے آرامی، گرنے کا نتیجہ چوت، زہر کا نتیجہ موت، شہد کا نتیجہ مٹھاں، غرض ہر اچھے یا بے فعل کا ایک لازمی

جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک اور رو حافنی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مر نے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں یکساں ہمارے اعمال کے لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرمادیا تھا ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشنا، عقل عنایت کی، خیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا راتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

«رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرَّسُولِ»

(النساء: ٤/ ١٦٥)

”یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بد کاروں کو هشیار کرنے والے، تاکہ خدا پر انسان کی جست باقی نہ رہے۔“

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

«وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ» (الانبیاء: ٢١/ ١٠٧)

”ہم نے تجھ کو (ای پیغمبر) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔“

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کیا اور طرح طرح کی بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں سے اپنے کو بر باد کیا اور حس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت و بر بادی میں بٹلا کیا:

«وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُفْلِكَ الْقُرْبَىٰ يُظْلَمُ وَآهَلُهُمْ مُضْلَمُوْنَ وَكُوْشَأَرَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ

أَنَّهُمْ وَاحِدَةٌ وَلَا يَرَوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَّجَمَ رَبُّكَ وَلَدَلِكَ خَلَقْتُهُمْ»

(١١/ هود: ١١٧- ١١٩)

”اور نہ تھا تیراب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و بر باد کرتا اور در آئیا تھا ان کے رہنے والے نیکوں کا رہتے اور اگر تیراب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی بیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جس پر تیرے رب کا رحم ہو اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا تھا۔“

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کی خاطر بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں، لیکن وہ

خود انسان ہے جو اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا اپنے کوسز اوار ٹھہر لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں:

لِلرَّحْمَةِ خَلَقُوهُمْ وَلَمْ يَخْلُقُوهُمْ لِلْعَذَابِ.

”خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا، عذاب کے لیے نہیں۔“

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے درپے رحمتوں کے باوجود اپنے کواس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدا یعنی رحمن و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

﴿كُتُبٌ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ﴾ (٦/الانعام:١٢)

”اس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اینے اوپر واچ کر لیا۔“

﴿سَلَّمَ عَلَيْكُمْ لَتَبْ رَبِّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ كُلًا﴾ (٦/الانعام:٥٤)

”تم پر سلامتی ہو، تم بارے رب نے رحمت کو ائے اور پر فرض ٹھہرالا ہے۔“

(وَرَحْمَةً وَسِعَةً كُلَّ شَيْءٍ) (الاعراف: ١٥٦) / ٧

”اور میری رحمت نے ہر چیز کو سماں لیا ہے۔“

﴿ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ﴾ (١٨) / الكهف: ٥٨)

”اور تیرا ایرو دگار بخشے والا رحمت والا ہے۔“

((رَحْمَتِي سَبَقَتْ عَصَبَيْ))

”اور میری رحمت میرے غصب پر سبقت لے گئی۔“

وہ اپنے گناہ گارو سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا، حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

﴿وَرَبِّكَ الْغَنِيُّ دُوَّلَ الرَّحْمَةِ﴾ (٦ / الانعام: ١٣٤) ”اور تیرارب بے نیاز رحمت والا ہے۔“

اور سلی دی ہے:

(لِيَعْبَادُ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْتُلُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ الرُّؤْبَ

جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

"اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو،

خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بلے شک وہی بخشے والا اور رحمت والا ہے۔^{۱۰}

اس کی رحمت کاظمہ جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا اور ماں اس کی رحمت کا سب

^١ طبرى، ج ١٢، ص: ٨١ مصر. ^٢ صحيح بخارى، كتاب التوحيد، باب قوله تعالى: ولقد سبق كل ماتـ..... ٧٤٥٣.

سے بڑا مظہر اس کے مقامِ اعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہے، فرمایا:

﴿مَنْ يُضْرِفْ عَنْهُ يَوْمَيْنَ فَقَدْ رَجَمَهُ طَوَّلَكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۶)

”جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا تو وہ وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔“

اللّٰہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ گناہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے گھلت لینے کے بعد بالآخر اپنی رحمت کے سایہ میں لے اور ان کو اپنی نخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزا میں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جوتائج بد انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے جسم انسانی جدو جہد کرتا ہے اور اس کی اس لڑائی کا نام بیماری ہے اور اس لڑائی کی تکمیل کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے، جن کو ہم در درس، در شکم، اعضاً لٹکنی، بے خوابی وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی رو جانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاح شرعی میں ”گناہ“ کہتے ہیں اور جن کے جوتائج بد کو عذاب کہتے ہیں اور یہ جوتائج جو آتش دوزخ اور اس کے شدانہ و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا فنا شایہ ہو گا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے جوتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدو جہد میں مصروف ہو گی اور جو نہیں وہ ان سے عہدہ برآ ہو گی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی سوروثی بہشت میں داخل ہو گی۔

اس تہبید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے، بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں درد، اعضاً لٹکنی، شدت تفتیگی، سوزش جسم، ان کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلاٹی جاتی ہے، بد مزہ سے بد مزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو شتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کا ناتا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایڈ ارسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے جوتائج بد سے اس کے جسم کو محظوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گوشفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں، بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ اخراج کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں بنتا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث صحیح سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

﴿وَلَيَعْجِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ امْتَأْنُوا وَلَيَتَعَقَّبَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (۲/آل عمران: ۱۴)

”اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو منٹائے۔“

یہی اصول عذاب اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گناہ کار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد: (﴾هَتَّىٰ إِذَا هُدِبُوْا وَنَقُوْا إِذْنَ لَهُمْ فِي دُخُولِ الْجَنَّةِ﴿) ۱

”یہاں تک کہ جب گناہ کار چھٹ جائیں گے اور پاک و صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔“

اس حدیث میں یہ دولفاظ (هُدِبُوْا وَنَقُوْا) ذرا تشرع طلب ہے۔ (هُدِبُوْا) کا مصدر تہذیب ہے، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شناخت اس لیے چھانت دی جائیں، تاکہ درخت میں سربرزی و شادابی پیدا ہو کر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور (نَقُوْا) کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے، تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشرع سے صاف کھل گیا کہ گناہ کاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو نہ آئے گی:

﴿طَبِّئُمْ فَإِذْخُوْهَا خَلِدِيْنَ ﴾ (۳۹/ الزمر)

”تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے آ جاؤ۔“

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گناہ کاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لیے ہر گناہ کار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو گرہ، بہر حال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

﴿لَيْلَيْنَ فِيهَا أَحْقَابًا﴾ (۷۸/ البقرہ)

”دوزخ میں وہ صد ہا سال تک پڑے رہیں گے۔“

لیکن بالآخر ان صد ہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہو گا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رویاۓ برزخ میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ بے کام کیے تھے، ان کا آدھا حصہ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بد صورت تھا، جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے، پھر نکل آئے تو ان کی بد صورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے۔“ ۲ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گناہ کاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

۱ صحیح بخاری، کتاب الرفق، باب الفصاص يوم القيمة: ۶۵۳۵۔

۲ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبير الرؤيا بعد الصبح: ۷۰۴۷۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے
اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزا میں بھی گناہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود پیاروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گناہگاروں کی پا کیزگی اور پا کوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اس رحمٰن و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارانہ کیا کہ ان بد نعمتوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے بزرخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بد اعمالیوں کے میل پھیل کوجلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری و راثت (جنت) پائیں اس نظریہ کو پیش نظر کہ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿يُؤْسَلُ عَلَيْهِمَا شُواظٌ مِّنْ تَأْرِةٍ وَّنَعَّاصٌ فَلَا تَنْتَهِي لَهُنَّ فَيَأْتِي الْأَعْرَيْكَمَا لَكَذِيلِينَ﴾ فَإِذَا
الشَّفَقَتِ الشَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرَدَةً كَالْيَهَانَ فَيَأْتِي الْأَعْرَيْكَمَا لَكَذِيلِينَ وَفِيْوَمَيْدَنِ لَا يُسْكَلُ
عَنْ ذَنْبِهِ إِنْ وَلَكَ جَانِ فَيَأْتِي الْأَعْرَيْكَمَا لَكَذِيلِينَ وَيُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَهُمْ فَيُؤْخَذُ
بِالْتَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ فَيَأْتِي الْأَعْرَيْكَمَا لَكَذِيلِينَ وَهَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُنَكِّبُ بِهَا
الْمُجْرِمُونَ يَطْلُوْنَ بَيْهَا وَبَيْنَ كَمْبُوْنَ فَيَأْتِي الْأَعْرَيْكَمَا لَكَذِيلِينَ﴾

(٤٥-٣٥) الرَّحْمَن: ٥٥)

”تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھلاؤ گے، پھر جب آسان پھٹ کر تپخت کی طرح گلبی ہو جائے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس و حن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھلاؤ گے، گناہگار اپنی نشانیوں سے بیچاپا لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھلاؤ گے یہ دوزخ ہے جس کو گناہگار جھلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے نیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھلاؤ گے۔“

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے سمجھتے یہ بات بہر حال مانی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ذر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہیں کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لاائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معرفت خواہ کسی قدر گمراہ اور گناہگار ہو، تاہم اس کے نامہ اعمال میں کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامتِ گواللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہو گا، جس میں ہر گناہگار کو اپنی گناہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس حسین و رحیم کی شانِ رحیمی کا ظہور ہو گا اور ((رحمتی سبقت غضبی)) ^۱ (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصدق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہو گا اور گناہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف کر کے پا کوں کو بہشت میں داخل کی اجازت ملے گی، فرمایا:

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُقْرَبُ إِلَيْهِ وَمَنْ يَرْدِدْ حَلْمَهُ﴾ (التغابن: ۹)

”او جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔“

﴿وَآخِرُونَ اغْتَرُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَّا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئَاتِهِمْ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْتَذِرَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبۃ: ۹)

”او دوسرے لوگ جنمیوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بے شک اللہ بخششے والا اور حرم والا ہے۔“

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا:

﴿وَكُنْ مِنَ الْمُكْمُلُمُ إِلَّا وَإِدْهَا، كَمَانْ عَلَى رِسَالَتِكَ حَثَمًا مَفْتُوحًا، ثُمَّ لُكْيَنِ الَّذِينَ أَكْوَأُوا وَلَدَدُوا الظَّلَمِيْمِ فِيهَا جِنِيَّا﴾ (مریم: ۱۹)

”او تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے، پھر ہم ان کو جو خدا سے ذرے، نجات دیں گے اور شرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل کرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔“

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں:

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”شفاعت“ کرنے والے لوگ دوزخ سے چھوٹی گکڑیوں کے مانند نکلیں گے۔ ^۲

^۱ صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۵۳۔

^۲ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۵۸۔

② حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔“ ❶

③ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئی ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ اس طرح اگئیں گے جس طرح سیلا ب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ آتا ہے۔“ ❷

④ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا تو آواز آئے گی اے محمد (علیہ السلام)! سراخنا، مانگ، دیا جائے گا تو میں سرماخداوں کا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیرسی پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا، جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔“ ❸

⑤ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ ”محمد علیہ السلام کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والوں میں ہوگا۔“ ❹

⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ”میری سفارش سے سفر فراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔“ ❺

⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جہنوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا، فرشتے ان توحید والوں کا اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلانہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جملے ہوں گے پھر ان پر آب حیات چھڑ کا جائے گا تو وہ اس طرح اگئیں گے جس طرح سیلا ب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ آتا ہے۔“ ❻

⑧ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ”جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو، جس کے دل میں ایک رائی کے برابر دانہ کے دانہ میں جنگلی دانہ آتا ہے۔“ ❼

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٥٩۔ ❷ ایضاً: ٦٥٦٠۔

❷ ایضاً: ٦٥٦٥۔ ❸ ایضاً: ٦٥٦٦۔ ❹ ایضاً: ٦٥٧٠۔ ❺ ایضاً: باب الصراط جسر جہنم: ٦٥٧٣۔

بھی ایمان ہواں کو دوزخ سے نکال تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر لکھیں گے پھر وہ نہ رہیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ ایسیں گے جس طرح میں آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔*

⑨ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وَهُوَ الْمُدْرِجُ بَعْدَ الْمُدْرِجَ" وہ ایں گے وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جیسیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بھض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دری کے لیے مر جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہو گی تو وہ تھوڑے قهوٹے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح ایسیں گے جیسے سیالب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔*

⑩ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم ہو گی۔"

⑪ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح میں روایت ہے کہ "خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہل ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہے گا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحم و رحیم دوزخ سے مٹی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلانی نہیں کی۔"

⑫ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "حکم ہو گا کہ جس نے لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَہا ہو اور اس کے دل میں برابر بھی نیکی رہی ہواں کو دوزخ سے باہر کرو جس نے لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَہا ہو اور گیہوں کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَہا ہو اور جوار کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اس کو دوزخ سے الگ کرو۔"

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

«إِنَّ اللَّهَ لَا يَعْفُرُ أَنْ يُشْرِكَ بِهِ وَيَعْنُّ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَكْتَأِطُ» (٤/ النساء: ١١٦)

"بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو لگا ہے وہ اس کو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔"

* صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال: ۲۲۔ * صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۶۔ * صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۷۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اخرا اهل النار: ۴۶۱۔ * صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله: وجوهه يومئذ ناضرة: ۷۴۳۹۔ * نرمذی، ابواب صفة جهنم، باب ما جاء ان للنار نسبین: ۲۵۹۳، حدیث حسن صحیح یہ روایت بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطے ہے مگر کسی قدیم فرقہ کے ساتھ اور اس میں صدی خرچ بھول آیا ہے۔ رکھیے: کتاب الایمان، باب زيادة الایمان ونقاصانہ: ۴۔ "ض"

اس آیت میں قصرِ حکم ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے براءت کی جاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے، جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک و کفر کی سخنان اکثر نہیں

احکامِ الٰہی اور شریعتِ رباني کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بہنzelہ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدہ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارج سے ہے اس کو ہم محقرِ عمل اور تفصیلِ عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جاسکتی ہے، مگر جس کا شانہ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نامیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ و جو درضوری ہے، البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا اللہ کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے، ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہو گا، اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی میں ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۲ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محسوس ہے تو رحم دل سے رحم دل مختین کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنی سے ادنی درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۳۰، ۲۹، ۳۱ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحم دل مختین ۳۲ تک اس کو پہنچا کر ادنی درجہ میں کامیاب بناسکتا ہے۔

الغرض ایمان و علم و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے، اپنے ناقابل تلافی نتیجے کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقد ان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک و کفر کے گناہ گاروں کے لیے شرک و کفر کے دورہ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے، اس کا جواب آئندہ طریقوں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عتابِ الہی کا گھر ہے، کیا یہ شدآباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائموں کے نزدیک اس کا جوابِ فتنی میں ہے * ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدیث دراز کے بعد ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگِ رحمتِ الہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میر اعذاب ہے۔“ * اسی کے ساتھ یہ بھی حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ((رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ)) * ”میری رحمت میرے غصب سے سبقت لے گئی ہے۔“ اب اگر دوزخ جو اس کے غصب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائی وابدی ہو تو اس کا غصب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے، یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخلیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصول میں سے

۱۰ ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل مل دل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو گھوڑ کراس پر تو بے شہر طفیعت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا دجود انکی اور ابادی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عالم میں تنست کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دو نوں کا دادگی وجود ہے لگانہ ہگار مومن ان پہنچانے کے بعد رعایا اخلا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرق و کافر کے گناہ کی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جیلسیں گے۔ فقہاء و محدثین کا ایک گروہ جو مریضہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہو گا وہ گناہ ہگار بھی ہو گا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہو گا اس کے برخلاف خوارج اور عزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کیبرہ کار مرتکب ہو گا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ میں ایسے رہے گا اور کیا اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام خلیفہ اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جن کے پر جوش حادی حافظ اہن قیم بحوثیہ میں نے پتچار کا مسلک اختیار کیا ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قاسم اور ایک زیدی یعنی عالم شیخ مقلوبی نے یہی اس کو قول کیا ہے، العلم الشامخ فی ایشار الحق علی الاء والمشائخ (صفحہ ۱۲۴) نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب گھنگارا پسے اپنے گناہوں کے بعد رعایا پا جھیں گے تو جنم کاردی جائے گی اور جنت کو بھائے دوام بخواجائے گا، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاعة العلیل اور حادی الارواح میں (دو نوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعين کے ساتھ چھپی ہے، میں قرآن اور احادیث اور آثار اور عقلى کی چھیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو بہرہ نیا ہے) (دیکھو شفاعة العلیل، ص: ۲۵۲-۲۶۳؛ حسینیہ مصر اور حادی الارواح ازص: ۷۴-۷۵) مطبط جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ بحوثیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فرقہ کا مسلک تسلیم کیا ہے، (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم، صفحہ ۱۶۷) صوفیہ میں شیخ الحدیث ابن عربی اور ان کے تبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک حق پر خلود نار کا حکم ہے، و بالآخر و درخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو ای دوزخ میں راحت اور لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیزے غلط اقوال ہی کو پسند کرتے ہیں اور انہیں میں لطف اٹھاتے ہیں، میں نے اس باب کو بہت ذرتے ذرتے لکھا ہے کہ اس میں انجام اللہ کی تصریح کا جرم حکم ہوتا ہے۔ اگر کہ اختار کردہ سبلوگ نہ ہوں اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور تو کی تو فیض بخش اور ای مرا دکار و راز و جھوکول دے۔

² صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب ما جاء في قول الله تعالى (إن رحمت الله قريب من المحسنين):

^{٧٤٤٩}: صحيح مسلم، كتاب الحجنة وصفة نعمها واهلها، باب الناز يدخلها العمارون، ٧١٧٣.

^٣ صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله ولقد سقت كلمتنا ... : ٧٤٥٣؛ صحيح مسلم، كتاب

الكتوبة، باب في سعة حمة الله: ٦٩٧.

صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں۔ * اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غصب پر اس کی رحمت غالب آجائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باتی نہ رہے گا اور یہ دن ہو گا جب گناہ گار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔ اسلام کی رو سے سب سے بڑے بھرم شرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے، جب تک دوزخ کے تور میں ایک گرم کونک بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

۱۔ ﴿لِيَشْتُرُونَ فِيهَا أَحْقَابًا﴾ (۷۸: النبی: ۲۳)

”وہ دوزخ میں صد ہزار سال ٹھہریں گے۔“

صد ہزارہا سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن ان کا خاتمہ ہو گا، دوسری آیت جو صریح کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

۲۔ ﴿الثَّاكَرُ مَثُولُكُمْ خَلِدِينَ فِيهَا إِلَامَا شَاءَ اللَّهُ أَلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ حَكِيمٌ عَلَيْمٌ﴾

(۶: الانعام: ۱۲۹)

”دوزخ ہے تمہاراٹھکانا، اس میں تم سدار بننے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا بحکیم و علیم ہے۔“

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانونا بھی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے، لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔ تیسرا آیت میں ہے:

۳۔ ﴿خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَأَمَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَامَا شَاءَ رَبُّكَ طَإِنَّ رَبَّكَ فَعَالَ لِمَا يُرِيدُ﴾

(۱۱: هود: ۱۰۷)

”وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرارب چاہے، بے شک تیرارب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔“

دوسری اور تیسرا دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو ”رب“ کے لفظ سے تغیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ فلتاتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضا ہے۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقاۓ دوام عدم انتہا اور تسلسل وجود پر بترتیب استدلال کیا جاسکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت

۱۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمة الله: ۶۹۷۳ - ۶۹۷۵

کی بیشگی و بقا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی بیانوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چنانچہ اس دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس اور پرواں آیت کو ہم تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں، فرمایا:

فَأَمَّا الَّذِينَ شَفَعُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّتَهِيقٌ ۖ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ إِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِمَا يُرِيدُ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فِي الْجَنَّةِ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْدُوذٍ ۝

(۱۰۸-۱۰۶: هود)

”تو لیکن جو بد جنت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور رینگنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرارب، بے شک تیرارب جو چاہے کرڈا تا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے، تو وہ جنت میں ہوں گے، بیشک اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرارب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔“

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لیے خلو دو دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استشاف فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ ”مگر جو چاہے تیرارب بے شک تیرارب جو چاہے کرڈا تا ہے“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہل جنت کے دوام کے ذکر میں بصرخ فرمایا: ”مگر جو چاہے تیرارب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر متناہی دوام و تسلسل کے ساتھ بیشک قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تغیریں میں متعدد ائمہ سلف مثلاً: ابن زید اور شعی وغیرہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ سلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہل دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے خفی رکھا ہے۔ *

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَلِدِينَ فِيهَا إِلَّا وَلِكَ هُمْ شَرُّ الْعَرْبَيَّةِ ۖ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ لَا وَلِكَ هُمْ خَيْرُ الْعَرْبَيَّةِ ۖ جَزَاءً وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝

”بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں، ان کی جزاں کے پروار دگار کے نزدیک بننے کے باعث ہیں، جن میں نہیں بہتی ہوں گی۔

۱۔ تفسیر طبری، ج ۱۲، ص ۶۶، ۶۷؛ درمثور سیوطی تفسیر آیات هود، ج ۲، ص ۳۵۰۔

وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔“
غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے،
پہلے عدن فرمایا، جس کے معنی قیام اور بنسنے کے ہیں، پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، بعد ازاں
آئدا ، فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔
اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

﴿وَيُدْخَلُهُ جَنَّتَ تَجْبِيرٍ مِنْ نَجْحَتِ الْأَنْهَارِ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَأَكْلُنُوا إِلَيْنَا أُولَئِكَ أَصْنَعُ الْأَثَارَ خَلِدِينَ فِيهَا طَوِيلَةً ۝ وَيُنَسِّ الْمَصِيرُ ۝﴾

(۱۰۰، ۹: التغابن)

”اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ
رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھلایا وہی
دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کرس گے اور وہ بری جگہ ہے۔“

دیکھو کہ مقابلہ دونوں میں 『خالدین』 (رہا کریں گے) اور 『خالدین فیها ابدا』 (ہمیشہ رہا کریں
گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی
برتی گئی ہے اور جنت میں خلوکی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً:

﴿يَوْمَ تَبَيَّضُ وُجُوهٌ وَسُودٌ وَجُوهٌ فَإِمَّا الَّذِينَ اسْوَدَتْ وُجُوهُهُمْ فَالْفَرْجُ بَعْدَ إِيمَانِهِمْ فَلَذُوقُوا الْعَذَابَ يَبَأُ الْنُّؤُمَّ تَكْفُرُونَ ۝ وَإِمَّا الَّذِينَ ابْيَضَتْ وُجُوهُهُمْ فَقِبْلَ رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝﴾

(۲/۳، ۱۰۶: آل عمران)

”جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے، تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے
تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے، تو وہ اللہ کی رحمت
میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدار ہیں گے۔“

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلوکی
تصریح تمام ہے۔

انہیں آجتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے
گا، جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہو گا اور کوئی ایک تنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ
① طبرانی میں حضرت ابو امامہ صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک
ایسا دن آئے گا جب وہ خزان رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گی اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔“

شیخۃ النبی ﷺ

- ② حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔“
- ③ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔“
- ④ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ”اہل دوزخ ریگستان عالم کے ذرات کے بعد رثما ربحی دوزخ میں رہیں بھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔“
- ⑤ عبد اللہ بن عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بھر بھرا کیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صد ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے۔“
- ⑥ عبد الرزاق، ابن منذر، طبرانی اور یہیقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ صحابی یا ابوسعید خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ ﴿الْأَمَاشَاءِ رَبُّكَ﴾ کا استناد پر قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں «حالدین فیها» (سد اس میں رہیں گے) وہاں یہ مشیت الہی کا استشاق قائم ہے۔

- ⑦ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا، جب اس کے خالی دروازے کھڑ کھڑا کیں گے۔

دفع شبه

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خلدین فیها ابدا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:

۱ - ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكُفَّارِينَ وَأَعَذَّ لَهُمْ سَعِيرًا خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(الاحزاب: ۶۴، ۶۵)

”بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

۲ - ﴿وَمَنْ يَفْعَلَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَإِنَّ لَهُ نَارًا جَهَنَّمَ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

۱ - حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء العلیل، (ص: ۲۰۸) میں ان روایات کو غیر مطبوع مكتب تفسیر و حدیث نے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ائم جری طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورہ ہود، جلد ۱۲، ص: ۲۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفسیر در منثور تفسیر سورہ ہود، جلد ۳، ص: ۲۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہو رذ کریا ہے اور کتاب الاسماء والصفات یہیقی، ص: ۱۲۳ مطبوع بالہ آہاد (جیدر آہاد) میں مختصر روایت ہے۔

(الجن: ۷۲)

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔“

۳۔ «إِنَّ الَّذِينَ لَفَرَوا وَكُلُّمَا كُمْ يُلْيُنَ اللَّهُ لِيُغْفِرَ لَهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ
جَهَنَّمَ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا» (النساء: ۱۶۸، ۱۶۹)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حسد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشنے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔“

ان تینوں آیتوں میں «خلدین فیہاً أَبَدًا» (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الہی دوزخ کے خاتمه کا دور نہیں آئے گا۔ باقی چند آیتوں میں «أَبَدًا» (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالد ہے، جیسے «هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ» وہ اس میں ”خالد“ رہیں گے۔ یا ایک جگہ ہے:

«وَدُوقُوا عَذَابَ الْخَلِدِ يَا مَا نَتَمُّ تَعْلَمُونَ ۝» (السجدة: ۱۴)

”اور ”خلود“ کے عذاب کا مزہ چکھو۔“

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص بقراءٰ کرنے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدوانہ چوڑھوں کے پتھروں کے لیے خوالدار خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تمہارا (خالدین) کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صرتھ نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو (خلدین) کہا گیا ہے کہ تقریباً ایسی آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے تابع ہے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف (خلدین) بھی ہے وہاں ہمیشہ اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ (خلدین) کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گناہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گناہگار اہل ایمان کی سزا میں بھی خالدین کے ساتھ (أَبَدًا) استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ گناہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بھایا ہو تو اس کے سامنے بھی خالدین کے ساتھ ابَدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا: «وَمَنْ يَقْتَلْ مُؤْمِنًا مُّنْعَيْدًا فَجُزَاءُهُ جَهَنَّمُ خَلِدًا فِيهَا» (النساء: ۹۳) ”اور جو کوئی کسی با ایمان کو

تصدیق کر دے گا تو اس کا بدل دوزخ ہے، جس میں وہ «الْخَالِدُ» (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔” یہی سبب ہے کہ معزز لہ اور خوارج کے سواتnam اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشش کے قاتل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آئیوں میں ”خلود“ سے مراد بھی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں بھی کامفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنابریں ان آئیوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں، ہم عام طور سے محروم کے لیے جس دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے محروم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی غفوہ امام کے سلسلہ میں قتل از مدت رہا جاتے ہیں۔ دو چار آسمیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گناہ گار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ آپیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ﴿وَإِنَّ الْفَجَارَ لَكُفَّيْ جَحِيمٌۚ يَصْلُوْهَا يَوْمَ الدِّينِۚ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَافِلِينَۚ﴾

(۱۶-۱۴/الأنفطار)

”بے شک گناہ گار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپنے نہیں رہ سکتے۔“

(۲) ﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَتَعْوَلُوا أَنَّ لَنَا كُرْتَةً فَنَتَبَرَّاً مِنْهُمْ كَمَا تَرَءُوا مِنَ الْأَمْمَاتِ كُلُّ ذَلِكَ بِرِبِّهِمُ اللَّهُ أَعْظَمُهُمْ حَسَرَتْ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِطَرِيجِينَ مِنَ النَّارِ﴾ (۲/البقرة: ۱۶۷)

”اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم نے یہاں الگ ہو گئے، اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حرمتیں بنا کر ان کو رکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔“

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ حَمِيمًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيُفَتَّدُوا إِنَّهُ عَذَابٌ يَوْمٌ الْقِيَمَةُ مَا تُقْسِيْنَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌۚ يُرِيدُونَ أَنْ يَجْرِجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِطَرِيجِينَ مِنْهَا وَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ﴾ (۵/المائدۃ: ۳۶، ۳۷)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہو، تاکہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں، تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے

نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے قائم عذاب ہے۔“

(۴) ﴿كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَجْرِجُوا مِنْهَا مِنْ عَيْنٍ أُعِيدُوا فِيهَا وَدُوْقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾

(۲۲/الحج: ۲۲)

”وہ جب چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔“

(۵) ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فِي أَوْهُمُ الظَّالِمُونَ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَجْرِجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوْقُ عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (۲۰/السجدۃ: ۳۲)

”اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو، جس کو تم جھلاتے تھے۔“

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بنتا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشاء اسی قدر ہے کہ کوئی گناہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے فتح جائے گا تو یہ محال ہے کہ خدا سے چھپ کر فتح جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ کی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی بارہم تکی کے کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسرا آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جاسکتی اور نہ دہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گناہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشنا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گناہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکلا جاسکتا ہے، مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام، بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے؟ حالانکہ اس کے بالقابل جنت کی بقاے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور پتکار ہے۔ ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گناہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور

دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا، یقیناً برائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ «إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْبِيْعَادَ» (۳/آل عمران: ۹) ”تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“ (إِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا) (۱۹/مریم: ۶۱) ”اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا۔“ لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہذید، سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو یہ حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اس رحمٰن و رحیم اور عفو اور غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گناہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مندابولیٰ میں حضرت انس بن مالک رض سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”خدانے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔“ *

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گناہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک و صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گناہگاروں کے حق میں اچھا ہے، وہ تاکہ اس سے ان کے نادم و تائب ہونے کے بجائے ان میں اور خود سری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ازالہ۔ آیتہ کے متأجّب بدے مثُرپن اور بے خوبی آ جاتی اور ایسا ہوتا تنبیہ و اصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لیے ان کی قانونی سزا تو داگی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخر ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے پر در فرمائیں کو ایک گونہ اپنے سے نا امید بھی نہیں ہونے دیا اور امید و نیتم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے چھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے، جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعہ معااف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز بھرا دیا تھا اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے تو خدا کو اتنا بے اختیار نہیں کیا کہ اعمال بد کے متأجّب جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معااف نہیں ہو سکتے لیکن اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا ایک طرف فرمایا: (مُكْلِّفُ لَكُمْ يَهُا أَكْسَبَتْ رَهْبَةَ)

(۷۴/المدثر: ۳۸) ”ہر فس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔“ اور دوسری طرف فرمایا: (يَعْذِبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ) (۵/المساٰدۃ: ۴۰) ”خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔“

* بحوالہ حادی الارواح ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ص: ۲۲۲ ، مصیر۔

یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانون فطرت کہتے ہیں مگر با ایسے جسم اس حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا اور دوسری طرف خدا کی قدرت تام اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذاب طویل کا سبب

بعض کم فہم یا اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لمحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے، اسی طرح سال یا عمر بھر کے گناہ کی مزاصدہ اور ہزار ہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تکمیل کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے لئے دیگر لگتے ہے مگر اس کے معاوضہ میں سال ہا سال کی قید، خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلاف عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پر بیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ بکھی ہفتون مہینوں بلکہ سال ہا سال یا بارہ تاہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بد ولت عمر بھراں کے روگ میں بٹلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یہاں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہ اور ہزار ہا گناہ زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر کی جاسکتی ہے اسی لیے عقاب طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گناہ ہگار کے لیے یہاں نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ الْحَالِ۔

مشرک و کافر کا آخراجام؟

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی، تو کیا اہل کفر و مشرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر حرم و کرم کے مزاوار ہو جائیں گے، جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ مشرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا، یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مشرک و کفر کی جزا دوام عذاب اور خلود نار (خالدینَ لِفِيهَا أَكْدًا) ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسب مشیت الہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدت حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

﴿قَالَ النَّارُ مَنْفَوِكُمْ خَلِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾

(۱۲۸: ۶) (الانعام)

”فرمائے گا، دوزخ کی آگ تمہاراٹھ کانا ہے، اس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردہ کار حکمت اور علم والا ہے۔“

اس آیت کا آخری لکھڑا خاص طور سے قبل ذکر ہے تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔ اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور پر رب کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شان رو بیت اگر چاہے گی تو اس کے غیر محمد و علم و حکمت کا اقتضا ہو گا تو دوزخ کے خاتمه پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے، یونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح الٰہی ہے:

﴿إِنَّمَنْ يُئْنِرُكَ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا أَوْلَهُ الْكَوَافِرُ﴾ (۵: ۷۲) (المائدہ)

”یہ کہ بے شبه اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا لٹھکنا دوزخ ہے۔“

نیز ایک اور آیت میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَتِنَا وَأَسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تَفْتَأِرُوهُمْ أَبُوابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَكُلِّمُهُمْ فِي سَمَاءِ الْخِيَاطِ﴾ (۴۰: ۷۲) (الاعراف)

”بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹالایا اور ان کے ماننے سے غور کیا تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں۔ گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، تا آنکہ اوپر سوئی کے نا کہ میں داخل ہو جائے۔“

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گواں کے لیے کبھی دوزخ کا خاتمه بھی ہو جائے مگر پھر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گزرنا ہو یعنی اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

﴿إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ طَإِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لَّمَا يُؤْدِدُ﴾ (۱۱: ۱۰۷) (ہود)

”وہ سدا دوزخ میں رہیں گے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔“

لدارہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿وَرَحْمَقَنِي وَيَعْتَلُ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۷: ۱۵۶) (الاعراف)

”اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے۔“
اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان وزمین کا کون سا گوشہ محروم ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبِّكُمْ دُورٌ حَمَّةٌ وَّاسِعَةٌ وَّلَا يُؤْدِي بِأَسْأَهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۱۴۷)

(۶/الانعام: ۱۴۷)

”اے پیغمبر! اگر وہ تجھے جھلانے کیس تو کہہ دے کہ تمہارا پروار دگار و سمع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گناہکاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔“

یعنی کسی دوسرے میں یہ ملاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گناہکاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت فھیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگز رکر دے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

﴿مَنْ يُضْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِنْ فَقَدْ رَجَمَهُ ط﴾ (۶/الانعام: ۱۶)

”جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا، تو خدا نے اس پر حرم کیا۔“

صحیح بخاری و مسلم، ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اگر موسیٰ کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے گا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناممیدنہ ہو گا۔“ * مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بے تهدید اگر بر کشد دیغ حکم به مانند کر و بیان صم و بکم

و دگر درد هدیث صلاحیت کرم عزا زیل گوید نصیبے بر م

خود اس رحلی و رحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان وزمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے:

﴿يَعْفُرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعْلِمُ مَنْ يَكْنَأُهُ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بِهِمَا وَإِلَيْهِ
الْمُحِبِّيُّ﴾ (۵/المائدۃ: ۱۸)

”جس کو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور اسی اللہ کی آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے پیچ کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

لیکن یہ اس کی مشتیت جیسا کہ اس نے (۲/النعام: ۱۲۸) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع رحمت مصلحت

* صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الرداء مع الخوف: ۶۴۶۹؛ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعة رحمة الله: ۶۹۷۹؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۲؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۴۸۴، ۳۳۴۔

* بوستان، ص: ۵۔

پرمنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہے۔ اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا نے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے۔ اس لیے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿النَّارُ مَقْوِلُكُمْ حَلِيلُنَّ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَلِيمٌ عَلَيْهِمْ﴾

(۱۲۸/الانعام)

”دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدار ہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔“

جمہور کا مسلک خلوٰونار

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے، اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک اور کفر کے مرتكب ہوں گے، کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔ اس عقیدہ کے مطابق گناہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہ گار تھے مگر ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے غفوو کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرا وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں بیٹھا رہے اور اس سے تو بہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش بھی نہ ہو گی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے، ان کی گناہ گاری اس درجہ ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کی طرح جذب نہ کر سکیں گے، وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔ رحمت عمومی کے معتقدین گزشتہ آئیوں سے جو معنی نکلتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کوتا ویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:

۱۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعْنَ الظَّفَرِينَ وَأَعْذَلَ لَهُمْ سَوْيِرًا حَلِيلُنَّ فِيهَا أَبْدَأً﴾

(۶۵، ۶۴/الاحزاب)

”بے شک خدا نے کافر اس پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔“

۲۔ ﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ حَلِيلُنَّ فِيهَا أَبْدَأً﴾

(۷۲/الجن)

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

۳۔ «إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنْ اللَّهُ لِيغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيهِمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقٌ
جَهَنَّمَ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا» (٤/ النساء: ١٦٨، ١٦٩) (٤)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھنے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشنے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔“

ان آئیوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہو گا اور جب عذاب ہمیشہ ہو گا، تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آئیوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کافر سے کبھی دور نہ ہو گا:

۱۔ «إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَوْلَئِنَّ لَهُمْ مَقَاتِلُ فِي الْأَرْضِ حَتَّىٰ مَنْ يَعْلَمَ مَعَةً لِيَفْتَلُ وَإِلَيْهِ هُنْ عَذَابٌ يَوْمَ
الْقِيَمَةِ مَا تُقْرِنُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ يُبَيْدُونَ أَنْ يَحْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ
يُحْرِجُونَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقْبِلٌ» (٥/ المائدۃ: ٣٦، ٣٧) (٥)

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور کہ وہ اس کو فرد یہ دے کر قیامت کے دن اس عذاب سے چھٹ جائیں تو ان سے یہ فرمایہ قول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔“

۲۔ «وَمَا هُمْ بِمُحِيطِينَ مِنَ النَّارِ» (٢/ البقرۃ: ١٦٧) (٦)

”وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔“

قیامت کے مکروہ کی نسبت فرمایا:

۳۔ «فَالَّذِيْمُ لَا يُحِرِّجُونَ مِنْهَا وَلَهُمْ يُسْتَعْبَدُونَ» (٤٥/ الجاثیۃ: ٥) (٧)

”تو آج اس دوزخ سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔“

۴۔ «الْأَكْرَانَ الظَّلِيلِينَ فِي عَذَابٍ مُّقْبِلٍ» (٤٢/ الشوری: ٤٥) (٨)

”ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔“

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہے گا:

۵۔ «إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَا نُؤْتُهُمْ كُفَّارًا أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ مَعْنَةُ اللَّهُ وَالْمَلَكَةُ وَالنَّاسُ

آئُمُّعِینَ لَا خَلِدُونَ فِيهَا لَا يُخْفَى عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝

(البقرة: ۱۶۲، ۱۶۳)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدار ہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور ان کو مہلت دی جائے گی۔“

۶ - ﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارٌ جَهَنَّمُ لَا يُغْضِي عَيْنَهُمْ فَيَسْوَطُونَ وَلَا يُخْفَى عَنْهُمْ قِنْ عَذَابُهَا مَاطِ﴾ (فاطر: ۳۶)

”اور ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا، جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مرجائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔“

شرک و کفر والوں کی مفترضت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:

۷ - ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرِكَ بِهِ ۝﴾ (النساء: ۱۱۶)

”بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔“

۸ - ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ تُمَّمُوا وَهُمْ كُفَارٌ فَلَئِنْ يَعْتَرِفُوا اللَّهُ أَعْلَمُ ۝﴾

(محمد: ۳۴)

”بے شبه جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔“

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

۹ - ﴿ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكُ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا أُولَئِكَ إِلَّا زَانُوا ۝﴾

(المائدہ: ۷۲)

”یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دو زخم ہے۔“

۱۰ - ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَلَّبُوا أَبْيَانًا وَاسْتَدْبَرُوا عَنْهَا لَا يُفْتَمِهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَكُمِ الْجَمْلُ فِي سَبِيلِ النَّبِيِّ ۝﴾ (الاعراف: ۴۰)

”بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھلا کیا اور ان کے مانے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔“

۱۱۔ (وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَكُنْ يَضْرُوا اللَّهَ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ لَأَكْبَرُ
يَعْلَمُ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ) ^{۵۰}

(آل عمران: ۱۷۶)

”اور اے پیغمبر! تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ
نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصد نہ بنائے اور ان کے لیے برا
عذاب ہے۔“

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتبے دم تک شرک و کفر میں مبتلا
رہے اور توہینیں کی ان کا گناہ بخشنانہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے
عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہو گی اور نہ ان کو موت آئے گی۔ تصویر
کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے۔

بیا کا ایں دا ور یہا رابہ پیش دا ور اندازیم

بہشت دوزخ کی جزا اوسرا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالم ہر زخ کے ذکر میں ہم پہ تفصیل بتا کرے یہیں کہ آخرت میں جزا اوسرا تمام تمثیلی ہو گی۔ اس
تمثیلی کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جیسا ایل ہو گا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہو گی، مثلاً: قرآن میں
ہے کہ جوز کو ۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل ^{۵۱} مستحقین کو حانے کے لیے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا
دھون کھانے کو ملے گا۔ (۲۹/الحاقة: ۳۲-۳۲) یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو
جان تازہ اور حیات نوجوشی جائے گی۔ (۳/آل عمران: ۱۶۹) وہ دولت مند جس کو دھوپ کی پیش سے پھنے کے
لیے قصر محل اور پینے کے لیے مٹھنے سے مٹھندا اپنی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان
نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسرا دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا:

﴿فِي سَمُومٍ وَّكَحْمِينٍ وَّكَظِيلٍ مِنْ يَعْمُومٍ لَا يَأْبُدُ وَلَا كَرِيمٍ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ
مُتَرْكِفِينَ﴾ ^{۵۲} (۴۲/الواقعة)

”وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوکیں کے سایہ میں، نہ مٹھندا، نہ باعزت، بے شک وہ پہلے نازو
نعمت میں تھے۔“

روایاتے بر زخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور

^{۵۰} حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا ایل ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترك استعمال آل
النبی ﷺ علی الصدقۃ: ۲۴۸۲؛ ابو داود، کتاب الامارة، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۵۔

آدھا بد صورت تھا، یہ تھے جن کے کچھ کام ابھی اور کچھ بरے تھے ① اس لیے بد اعمالی بد صورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نہیاں ہوئی، صرتھ طور سے یہ اصول ان حدیثوں میں مستحب ہوتا ہے:

① حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جو مومن خود بھوکارہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلاۓ گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلاۓ گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر شنگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے بزر جوڑے پہنائے گا۔“ ②

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی کوئی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں بٹلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔“ ③

③ ”جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا۔“ ④ تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جو امور معنوی اور غیر جسمی ہیں وہ اینی مشائی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً:

① قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے انداھا ہوگا وہ آخرت میں بھی انداھا ہو گا۔ (۱۷/الاسراء: ۲۷) دیکھو کہ دنیا کی معنوی و قلبی نایبیاں دوسرے عالم میں ظاہری و جسمانی نایبیاں کی شکل میں ظاہر ہو گی۔

② حدیث میں ہے کہ اہل تکبیر قیامت کے دن چیزوں میں بنا کر اٹھانے جانیں گے جس پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی۔ ⑤ دیکھو کہ تکبیر کی جزا ذلت و خواری سے ملگی اور چونیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لیے ان کی بڑائی اور تکبیر کا معاوضہ یہ ہو گا کہ وہ چیزوں بن کر اٹھیں۔

③ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے

① صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعییر الرؤیا بعد صلاة الصبح: ۷۰۴۷۔

② ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب في ثواب الاطعام: ۲۴۴۹۔

③ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في الستر على المسلمين: ۱۹۳۰۔

④ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في رحمة الناس: ۱۹۲۴۔

⑤ ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء في شدة الوعيد للمتكبرين: ۲۴۹۲۔

گا۔ * صفت بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہو گی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ”جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہو گا۔“ * دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہو گی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ ”دو بیسوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسرا سے غفلت بر تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلون ہو کر) جھک گیا ہو گا۔“ * ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہو گا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہیں پر جزو اوزار کے اور دوسرا جز نیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے سے حسب ذیل آئیوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِ ذِكْرِي فَأَلَّا مَعِيشَةً ضَنِّكَا وَخَسْرَةً يُؤْمِنُ الْقَمَةُ أَعْغَىٰ﴾ قَالَ رَبُّ لَهُ
حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ لَذْتُ بِصِيرَاهُ قَالَ كَذَلِكَ أَتَنْكَ أَيْمَنًا فَنَسِيَتَكَ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ
لُّسْلَىٰ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۴، ۱۲۶)

”جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تگلگ گزارا ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندرھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندرھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا، فرمائے گا اسی طرح میری آئیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلا یا جائے گا۔“

دیکھو کہ دل کی نایبیاں قیامت میں ظاہری نایبیاں اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمت الہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہو گا۔

دوزخ کی جسمانی سزا میں

دوزخ میں جسمانی اور دھانی دونوں سزا کیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاوں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

① آتش دوزخ اور اس کی سوژش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ الْسَّارُ یعنی آگ کو یاد دوزخ کا دوسرا نام ہے، انہیں معنوں میں السَّعِيرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابُ الْحَرِيقِ جلن کا عذاب بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

* صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ((مثل له ماله شجاعا اقرع)) کتاب الزکوة، باب ائم مانع الزکوة: ۱۴۰۳ و کتاب التفسیر: ۴۵۶۵۔ * ترمذی، ابواب الزکوة، باب ما جاء من نخل الزکوة: ۱۵۰۳، بخاری، کتاب

الزکوة، باب من سال الناس تکثرا: ۱۴۷۴، پروایت سنن نسائی، کتاب الزکوة، باب المسالۃ: ۲۵۸۶ و باب حد الغنی: ۲۵۹۳، مسند احمد، ج ۲، ص: ۱۵ میں بھی ہے اور سب میں یہ الفاظ ملتے ہیں ”لیس فی وجهه مزعة“ لیکن ترمذی جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے اس میں ”ومنستله فی وجہه خموش او خروش او کدوخ“ غیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ”ض“

* ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی التسویۃ بین الضرائر: ۱۱۴۱۔

﴿تَفَهُّمٌ وَجُوْهِهِمُ الْنَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالْيَوْنَ﴾ (۲۳/المؤمنون: ۱۰)

”ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جلس دے گی اور ان کی صورتیں بگر جائیں گی۔“
دوزخ کا ایک اور نام ستر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

﴿وَمَا أَذِلُّكَ مَا سَقَرُ﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تُذْرِي لَوْحَةً لِلْبَتْرِ﴾ (۷۴/المدثر: ۲۹-۲۷)

”اور تمہیں کیا معلوم، ستر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جلس دیئے والی۔“

﴿كَلَّا إِلَهًا لَطِيفٌ ۝ نَزَاعَةً لِلشَّوَىٖ ۝﴾ (۷۰/المعارج: ۱۶، ۱۵)

”ہرگز نہیں، وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیرنے والی۔“

﴿إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرِ كَالْفَصْرِ ۝ كَاتِهُ جِلَّتْ صُفْرُهُ ۝﴾ (۷۷/المرسلات: ۳۳، ۳۲)

”دوزخ جمل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکنے کی جیسے زر در تگ کے اونٹ۔“

② وہاں سایہ نہ ہو گا، بلکہ یہ حکم ہو گا:

﴿إِنْطَلَقُوا إِلَى ظِلِّ ذِي ثَلَاثَ شَعَبٍ ۝ لَا ظَلَيلٌ وَلَا يُغْنِي مِنَ الْهَمِ ۝﴾

(۳۱، ۳۰/المرسلات: ۷۷)

”چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانگیں ہوں گی، نہ گھنی کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔“

③ وہاں خندک نہ ہو گی:

﴿لَا يَدُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝﴾ (۷۸/النیا: ۲۴)

”اس میں وہ نہ خندک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔“

④ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ جیسیں آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہو گی جس میں کوئی سرست ہو، وہ جگہ فرمایا:

﴿لَا يَوْمٌ فِيهَا وَلَا يَمْحُى ۝﴾ (۲۰/طہ: ۷۴، ۸۷، اعلیٰ: ۱۳)

”وہاں وہ نہ مرے گا نہ بیجے گا۔“

⑤ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

﴿وَسُقُونَا تَأْمَعَ حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاصَهُمْ ۝﴾ (۱۵/محمد: ۴۷)

”اور وہ گرم پانی پلاۓ جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو نکڑے کر دے گا۔“

⑥ اور پیپ پتیں گے:

﴿الْأَحَمِيمًا وَغَسَاقًا ۝﴾ (۷۸/النیا: ۲۵) ”لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔“

⑦ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

﴿يَصُبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْجَيْمُ﴾ (۱۹/الحج: ۲۲)

”ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔“

⑧ کھانے کو سیندھے کا پھل ملے گا:

﴿أَمْ شَجَرَةُ الرَّقْوِمِ إِنَّا جَعَلْنَا فِتْنَةَ الظَّالِمِينَ إِلَهًا شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ أَصْلِ الْجَيْمِ طَلَعْهَا كَاهِنٌ رُؤُسُ الشَّيْطَنِينِ فَإِنَّهُمْ لَا يَكُونُونَ مِنْهَا فَإِنَّهُمْ مِنْهَا بُطُونٌ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا الشَّوْبَا مِنْ حَمِيمٍ﴾ (۳۷/والصفت: ۶۲-۶۷)

”سیندھے کا پھل وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جز میں، اس کے شاخوں پر جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملوثی ہوگی۔“

﴿إِنْ شَجَرَةُ الرَّقْوِمِ طَعَامُ الْآئِيْمِ كَالْمُهْلِ يَعْلُى فِي الْبُطُونِ كَفَلُ الْجَيْمِ﴾

(۴۴/الدخان: ۴۲-۴۶)

”سیندھے کا درخت گناہ کار کی غذا ہے، جیسے پکھلا ہوا تابا، وہ پیشوں میں کھوتا ہے، جیسے کھوتا پانی۔“

⑨ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ لِلَّاهِ مِنْ ضَرِيعَةٍ لَا يَسِّعُنَ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾

(۸۸/الغاشیہ: ۶، ۷)

”اور ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی، جو نہ مونا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔“

⑩ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

﴿وَلَا طَعَامٌ لِلَّاهِ مِنْ غُسْلِينِ﴾ (۳۶/الحقة: ۶۹)

”اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون۔“

⑪ کھانا لگانا جائے گا:

﴿وَطَعَاماً ذَاغْصَةً﴾ (۱۳/المزمول: ۷۳) ”اور گلگل میں اٹکنے والا کھانا۔“

⑫ آگ کے کپڑوں کا الباس ہوگا:

﴿فَالَّذِينَ لَكَرُوا وَاقْطَعْتَ لَهُمْ ثِيَابٍ مِنْ نَارٍ﴾ (۱۹/الحج: ۲۲)

”کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔“

⑬ لوہے کے تھوڑے پڑیں گے:

﴿وَلَهُمْ مَقَاتِلُهُمْ مِنْ حَدِيدٍ﴾ (۲۱ / الحج: ۲۲)

”اور ان کے لیے لوہے کے تھوڑے ہیں۔“

⑭ گلے میں طوق اور زنجیریں:

﴿إِذَا الْأَغْلُلُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلِيلُ طِينٌ سَبُونٌ﴾ (۴۰ / المؤمن: ۷۱)

”جب انکی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچ جائیں گے۔“

﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكُفَّارِ سَلَلِسًا وَأَغْلَلًا وَسَعِيرًا﴾ (۷۶ / الدھر: ۴)

”ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار کر کی ہے۔“

﴿مُقْرَبَيْنَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ (۴۹ / ابراہیم: ۱۴)

”وہ زنجروں میں جکڑے ہوئے۔“

دوزخ میں روحانی سزا میں

ان جسمانی سزاویں کے ساتھ روحانی سزا میں بھی ہوں گی، جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گری اور سورش کا حال اوپر گزرا چکا ہے، وہ دل کو جا کر جھانکئے گی، فرمایا:

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِي تَطَلَّعُ عَلَى الْأَفْرَادِ﴾ (۱۰۴ / الهمزة: ۶)

”سلکی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکئی گی۔“

﴿وَأَسْرُوا التَّدَامَةَ لَكَارًا وَالْعَذَابَ﴾ (۱۰ / یونس: ۵۴)

”اور جب عذاب کو دیکھیں گے، تو اپنی پیشانی کو چھپا کیں گے۔“

﴿يَحْسَنُ عَلَى مَا فَرَّطَ فِي جَنَّتِ اللَّهِ﴾ (۳۹ / الزمر: ۵۶)

”اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کی کی۔“

﴿كُلُّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ غَيْرَهُ﴾ (۲۲ / الحج: ۲۲)

”وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلا چاہیں گے۔“

ذلت کا عذاب

﴿فَالْيَوْمَ مُجْزَوُنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ (۴۶ / الاسحاق: ۲۰)

”تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔“

اس افسوس و حسرت و ندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو مغدرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

﴿لَا تَعْتَذِرُوَا الْيَوْمَ ﴾ (٦٦ / التحریم: ٧) ”آن معدرت نہ پیش کرو۔“

اللہ عز وجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا، جب وہ بات کرنا چاہیں گے، تو وہ فرمائے گا:

﴿اَخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكْلِمُونَ ﴿٥﴾ (٢٣ / المؤمنون: ١٠٨)

”ذیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے:

﴿كَلَّا لِهِمْ عَنْ زَيْمَمْ يَوْمَ مَبْدِئِ الْمَجْوُونَ ﴿٦﴾ (٨٣ / التطعیف: ١٥)

”ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔“

اُن میں سے وہ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:

﴿كَذَلِكَ أَنْتَكَ أَيْتَنَا فَنِيْتَكَ وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْلَى ﴿٧﴾ (٢٠ / طہ: ١٢٦)

”اسی طرح ہماری آئینیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی بھلا دے گا۔“

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور نہ ان سے کچھ بات کرے گا اور نہ ان کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یقینت میں شفیق و مہربان رب کی انجمنی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق و محبت کے خزم خورده ہیں، فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفِرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثُمَّا قَبِيلًا أُولَئِكَ لَا خَلَقَ اللَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُحَكِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُنَزِّلُهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٨﴾

(آل عمران: ٧٧)

”جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے ہوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں، وہ یہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

جنت

جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیکو کارنا نہیں کا دائی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً **الْجَنَّةُ** (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا، مثلاً: **جَنَّةُ النَّعِيمِ** (نعمت کا باغ) **جَنَّةُ الْخَلْدِ** (بقائے دوام کا باغ) **جَنَّةُ عَدْنٍ** (دائی سکونت کے باغ) **جَنَّةُ الْمَأْوَى** (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً: **فِرْدُوسٌ** (باغ) **رَوْضَةٌ** (چمن) **دَارُ الْخَلْدِ** (بیشگی کا گھر) **دَارُ الْمُقَامَةِ** (قیام کا گھر) **دَارُ السَّلَامِ** (امن و سلامتی کا گھر)

جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں بھی گولڈنیں اور سرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقاءے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر سرت فانی ہے یہاں خوشی کا کوئی تراہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کا نئے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صد مسہنے کے بعد ایک سرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمه ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آئی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جادو ای اور جہاں کی سرتیں غیر فانی ہیں، جہاں دنیا کی موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، سرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا: اے آدم!

﴿هَلْ أَدْلُكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخَلْدِ وَمَلِكِ الْأَيْمَلِ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰)

”کیا میں تجھے سدا جیسے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤ جس کو فنا نہیں۔“

مگر جنت کا یہ وصف سن کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا وہ موت کے درخت اور فا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنگی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جوان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنتہ اللہد اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال کا صلے قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

﴿أَمْرَجَتَهُ الْخَلْدِ الْقِيُّ وَعَدَ الْمُتَّقُونَ طَ كَانُتْ لَهُمْ جَرَاءٌ وَّمَصِيرًا﴾

(۱۵) الفرقان / ۲۵

”یا ہمیشی کابغ نہ بس کا وعدہ پر ہیزگاروں سے کیا گیا، جو ان کا صلہ ہو گا اور واپسی کی جگہ۔“
یہ ہمیشی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ہمیشہ، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

۱۔ ﴿وَالَّذِينَ أَمْتُوا وَعَيْلُوا الصَّلِحَاتِ سَنْدِخْلُهُمْ جَنَّتٌ تَكْبِرُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلَادًا﴾ (۴/ النساء: ۱۲۲)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں ہتھی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات تجھی ہو گی۔“

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقہ تعبیر پر نظر رکھیں کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھی آبدا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ تجھی بات کس کی ہو سکتی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے:

۲۔ ﴿وَالَّذِينَ أَمْتُوا وَعَيْلُوا الصَّلِحَاتِ سَنْدِخْلُهُمْ جَنَّتٌ تَكْبِرُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (۴/ النساء: ۵۷)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں ہتھی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۳۔ ﴿لَهُمْ جَنَّتٌ تَكْبِرُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(۵/ المائدۃ: ۱۱۹)

”ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں ہتھی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۴۔ ﴿وَجَنَّتٌ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (۲۲، ۲۱/ التوبۃ: ۹)

”اور (اللہ ان کو خوب خبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

۵۔ ﴿أَعَدَ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّتٌ تَكْبِرُ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(۹/ التوبۃ: ۸۹)

”اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں روں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔“

٦۔ «وَيَدْخُلُهُ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا» (٩٤/ التغابن)

”اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں ہوتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

٧۔ «وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخَلُهُ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا طَقْدَ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ بِرْ قَاتِلًا» (٦٥/ الطلاق)

”اور جو اللہ پر ایمان لائے اور یہ کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں ہوتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔“

٨۔ «جَزَاؤهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ كَذَّلِكَ عَدُنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا»

(٨/ البینة)

”ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بننے کے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں ہوتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں، جن میں جنت کی راحتیں اور لذتوں کی ابديت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

٩۔ «وَبَيْتُرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا مَا كَيْفَيْنَ فِيهَا أَبَدًا»

(١٨/ الكهف)

”اور ان مومنوں کو بشارت دوں گا، جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے اچھی مزدوری ہے، جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر ہیں گے۔“

سورہ حس میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

١٠۔ «هَذَا مَا تُوعَدُونَ لَيَوْمِ الْحُسَابَ إِنَّ هَذَا لَيَوْمَ قِنَاطِيلَةٍ مِنْ نَّقَادِيَّةٍ»

(٣٨/ ص: ٥٣، ٥٤)

”یہ وہ ہے، جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شہر یہ ہماری وہ روزی ہوگی، جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔“

١١۔ «وَأَمَّا الَّذِينَ سُعدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ الشَّمْوَتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ طَعَاءً عَيْرَ مَجْدُوذَةً»

(١١/ هود: ١٠٨)

”اور یہیں جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں،

لیکن جو تیر ارب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔“
یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیوں نہ ہوگی:

۱۲۔ ﴿وَجَنَّتٌ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّفْتَنٌ﴾ (۹ / التوبۃ: ۲۱)

”اور وہ باغ، جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔“

۱۳۔ ﴿أَكُلُّهَا دَآءِدٌ وَّظَاهِرٌ﴾ (۳۵ / الرعد: ۱۳)

”جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائی ہے۔“

۱۴۔ ﴿وَفَكِهَتٌ كَثِيرٌ لَا مَقْطُونَ عَنِّهَا وَلَا هُمْ نُوْعَتُ﴾ (۵۶ / الواقعة: ۳۲، ۳۳)

”اور بہت سے میوے، جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔“

۱۵۔ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ قَلَّهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ هُمْ نُوْنٌ﴾ (۹۵ / التین: ۶)

”لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے، جس کا سلسلہ کسی ختم نہ ہوگا۔“

فائدے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمه ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمه ہو جائے، پہلی صورت کی نفع تو گزشتہ آجیوں میں کردی گئی ہے کہ راحت و مسرت کے اسباب کا دہاں خاتمه نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو ﴿حال دین ابد ا﴾ کہہ کر اس کی نفعی بار بار کی جا پچکی ہے مگر ایک جگہ تصریح یہ کہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گزرنہ ہوگا، فرمایا:

۱۶۔ ﴿لَا يَدْرُوْنَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمُوْتَةُ الْأُوْلَى﴾ (۴۴ / الدخان: ۵۶)

”جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مارہ نہیں چکھیں گے۔“

لیکن ایک تیری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی داہم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو دہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرمادی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

﴿لَا يَسْتَهِمُ فِيهَا نَصْبٌ وَّمَا هُمْ مِنْهَا بِخَرِّجِينَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۸)

”دہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔“

یہ بھی ممکن ہے، کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں، تو فرمایا کہ ان کی جبلت و نظرت ایسی ہوگی

کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الہی سے لفڑا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

﴿خَلِيلُهُنَّ فِيهَا لَا يَعْقُونَ عَهْنَاكَ جَوَلَ﴾ (۱۸ / الکھف: ۱۰۸)

”سدار ہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔“

دواام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس توبرتوتا کیدا اور اصرار سے اندازہ ہوا کہ اس باب مسرت کی بقا راحت دواام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہو گئی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لائج شیطان نے ﴿وَمُلْكٌ لَا يَتَيَّنُ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰) ”اور غیر فانی سلطنت۔“

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالم بنا سے ان کو اس عالم فنا میں بخواہیا، آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہو گی۔

غیر فانی بادشاہی

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخلیل، ایک لفظ ”بادشاہی“ کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوبی کے دینے کے لیے کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کا میابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اس باب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شاہینہ نہ ہو۔ اوپرے اوپرے محل، ہرے ہرے باغ، ہتھی نہریں، سر بزر و شاداب تختے، سونے چاندی کے اس باب، زرد جواہر کے برتن، زرین کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلاقی تخت، موتویوں کے ہار، سونے کے گلگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لواز ہے ہیں۔ جنت کی محضرتین لیکن پچی تعریف آدم کے دشمن نے، آدم کے سامنے کی تھی:

﴿وَمُلْكٌ لَا يَتَيَّنُ﴾ (۲۰ / طہ: ۱۲۰) ”اور غیر فانی بادشاہی۔“

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اس لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھٹلے پھولے ہیں، کسی خالص روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو انہیں لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت

سنتیۃ الرسول ﷺ

عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی اطف و سرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

”میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھرنے پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیو۔“ (متی ۲۶-۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ”باپ“ کی ”آسمانی بادشاہی“ میں بھی انگور کا شیرہ پینے کو ملے گا، اور یوختا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا، تو وہ اس کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی۔ (مکاشفات یوختا باب ۲۲۲) اور پھر ”وہاں رات نہ ہوگی اور وہ چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوندان کو روشن کرتا ہے اور وہ ابد الآباد بادشاہی کریں گے۔“ (۵-۲۲)

لیکن یہ ”بادشاہی“ عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

﴿فَوَقَّهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذِلْكَ الْيَوْمِ وَكَلَّهُمْ نَصْرَةً وَسُبُورًا وَجَزِيلُهُمْ يَمَّا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرَيْثًا
مُشَكِّرَنَ فِيهَا عَلَى الْأَرْأَبِكَ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمَسًا وَلَا رَأْمَهْرِيًّا وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظَلَّلَهَا
وَذَلِكَ قُطُوفُهَا تَذَلِّلًا وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِأَيْمَةٍ مِنْ فَضَّةٍ وَأَكْوَابٌ كَانَتْ قَوَارِيزًا
قَوَارِيزًا مِنْ فَضَّةٍ قَدْ رُوَاهَا تَقْدِيرِيًّا وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَلْسَا كَانَ مِزاجُهَا زَجْبِيلًا عَيْنًا
فِيهَا نُسْتِي سَلْسِيلًا وَيُطَوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخْلَدُونَ إِذَا رَأَيْتُمْ حَسِيبَهُمْ لُؤْلُؤًا
مَنْتُورًا وَإِذَا رَأَيْتَ لَهُ رَأْيَتْ نَفِيَّا وَمُلْكًا كَبِيرًا عَلَيْهِمْ ثَيَابٌ سُندُسٌ خُضْرٌ
وَإِسْتَبْرَقٌ وَحَلُوًا أَسَاوِرٌ مِنْ فَضَّةٍ وَسَقَمُهُمْ رَبِيعٌ شَرَابًا طَهُورًا إِنَّ هَذَا كَانَ لَهُمْ
جَزَاءً وَكَانَ سَعِيَّمْ مَشْكُورًا﴾ (۱۱-۲۲ / الدھر)

”تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا اور ان کو تروتازگی اور شادکامی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدله میں ان کو رہنے کے لیے باغ اور پہنچے کے لیے ریشمی کپڑے دیے، وہ ان باغوں میں تختوں پر سیکے لگائے ہوں گے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈا اور ان کے سایہ ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لکھے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرتی ای شیشوں کے آنحضرے جواناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونھلی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام، سلسیل ہے اور سدار ہنے والے کمرن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے

کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھتے تو وہاں نعمت دعیش اور بڑی پادشاہی دیکھے، انکی پوشش سبز زم ریشم اور دیز ریشم ہوا اور ان کو نظری لئگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پرو رڈگار ان کو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہو گی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔“
یہ پورا نقشہ اس عیش و سرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ مخلوقوں کے متعلق تخلیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہو گی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ شیخ صاحبی سے مردی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”موسیٰ غایلہ^{علیہ السلام} نے اپنے پرو رڈگار سے پوچھا کہ اے پرو رڈگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہو گا، فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا، عرض کرے گا خداوند امیں راضی ہوں، فرمائے گا: تیرے لیے اتنا اور اس سے دو گنا اور اس سے تین گنا اور چو گنا ہے، کہے گا: خداوند امیں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا: تیرے لیے وہ اور اس کا دس گنا ہے۔ عرض کرے گا، میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا: اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیر اول آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لندت بنجست۔“

باغ کا استعارہ

آخرت کے خانہ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روپہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحراء کے لئے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سر بزرو شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں، بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سر بزرو شاداب ملکوں کے بنے والوں کے تخلیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ بیهاب بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرت انسانی کی تصوری ہے، انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو، مگر وہ سر بزرو شاداب قطعات، باغ و بہار اور کنار آب و نہر کو عیش و سرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجود کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھروہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دری کے لیے

جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، ومن سورة المسجدة: ۳۱۹۸ (حدیث حسن صحيح)

وہ ہر غم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحی محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے، تاک کہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھج جائے گی۔

سامانی جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصد بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اخروی حقیقتیں بدر جہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

﴿وَيَقِنُ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَلِمُوا الصَّلِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ تَكْبُرُهُ مِنْ تَعْجِلَةِ الْأَنْهَارِ تُكَلِّمُ كَلَمًا أَرْزُقُوا مِنْهَا مِنْ كُثْرَةِ رِزْقِنَا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ لَا وَمُؤْمِنُوْهُ مُتَشَابِهًاتٌ وَّلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطْكَرَّةٌ وَّهُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحِي أَنْ يَضَرِّبَ مَثَلًا مَا بَعْوَذَةً فَنِعْمَةٌ ۝﴾ (۲۶، ۲۵ / البقرة)

”اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوبخبری سنائے کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہیں بہتی ہوں گی، وہ، جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے، کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں اکلی صاف تحری بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں رہا کریں گے بے شبه خدا اس سے شرمندہ نہیں کرو، ایک چھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔“

ان آیتوں کے سیاق و سبق اور لظم و ترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی و لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو چھر اور کسی عظیم الجثثے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور فعمتوں کی نسبت قرآن نے یہی کہا ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أَخْبَقَ لَهُمْ مِنْ قُرْبَةٍ أَعْيُنٌ ۝ جَرَاءٌ إِيمَانُهُمْ ۝ كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾

(۳۲ / السجدة)

”تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدله میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔“

اس آنکھوں کی ٹھنڈک ”یعنی لذت و راحت“ کی کیفیت دنیاوی تجھیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس

لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا:

((قال اللہ اعددت لعبادی الصلحین مala عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر

علی قلب بشر))

”خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے، جس کونہ کسی آنکھ نے دیکھا، کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔“

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور سرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے خیال میں اگز رہیں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

((بله ما اطلعتم علیه)) جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑو۔

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((بله ما اطلعکم اللہ علیه)) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ”بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔“ دوسرے یہ ”خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو۔“

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الا عمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا يشبه
شیء مما في الجنة ما في الدنيا الا في الأسماء.

”سفیان ثوری الحمش سے اور وہ ابوظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔“
دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((ليس في الدنيا مما في الجنة الا الأسماء))

صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۹۸ و کتاب التفسیر: ۴۷۷۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ: ۷۱۳۴

وترمذی ابواب التفسیر: ۳۱۹۷۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ السجدة: ۴۷۸۰۔

صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفة نعیمها: ۷۱۳۳۔ تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۱۳۲۔

ویہقی فی البعث کما فی الدر المنشور للسوطی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۳۸۔

”جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سواد نیا میں نہیں۔“

غرض ان الفاظ سے انہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدر جہا بلند لذائذ اور سرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی وہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور درول ناخلیدہ مفہوم کے لیے ان کی زبان و لغت میں کوئی لفظی نہیں۔

جنت کی مرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بارہاپیان میں آپ کا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مرتیں، دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لیے قرآن پاک نے بصرخ تمام یہ کہا ہے:

﴿إِنَّمَا تُبَغْزُونَ مَا أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝﴾ (الطور: ۱۶)

”وہی بدلہ پاؤ گے، جو تم کرتے تھے۔“

حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت میں خدا فرمائے گا: اے میرے بندوایہ تھارے ہی عمل ہیں، جو تم کو واپس مل رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکردار کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔“ * مثلاً: وہ یکو کار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے بہیشہ تر ساں ولزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں اسکے ساتھ دہاں کی تمام راحیں ملیں گی تو:

﴿فَالْوَارِثَاتُ كُلَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝ فَعَنِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَوَقْتَنَا عَذَابُ الشَّمْوُرِ ۝﴾

(الطور: ۲۶، ۲۷)

”کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھروں میں ڈرتے تھے، تو خدا نے ہم پر محربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لوکے عذاب سے بچالیا۔“

اس آیت سے صاف نہیاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غصب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لوکے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر و غصب کی تمثیل شعلہ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غصب سے تراسان تھے وہ کیھو کہ قیامت میں ان کو باہموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولتمند و قوی دست مترکین، کمر و اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحریر ادا ہوتے تھے۔ قیامت میں اس کا الٹا ہو گا یہ ان پر نہیں گے۔ فرمایا:

* صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۲۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الظَّالِمِينَ أَمْنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُوا إِلَيْهِمْ يَغَامِزُونَ ۝ وَإِذَا
انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَهُمْ نَاجِحُونَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَاتِلُوا إِنَّ هُوَ لَعْنَ أَصْنَافُ الْأَوْنَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ حِفْظِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ أَمْنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝﴾

(٢٩-٣٤/ التطفيف)

”بے شک گناہگار، ایمان والوں پر ہستے تھے تو آج ایمان والے کا فروں پر ہنسیں گے۔“
نیکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں قبسم اور خندہ سرت میں بدل گئے اور گناہگاروں کی وہاں کی بُٹی
یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گناہگار جو دنیا میں اپنی دولت و قوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش اور مسرور
رہتے تھے، وہ یہاں غلکیں ہوں گے اور جو وہاں غلکیں تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے:
﴿فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَيَأْصْلِي سَعِيرًا ۝ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝﴾

(١١-١٢/ الانشقاق)

”تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہو گا کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مغروانہ)
خوش تھا۔“

اور غریب و مسکین جو وہاں اہل و عیال میں بیٹھ کر بھی سرت سے نا آشنا تھے، ان کا یہ حال ہو گا کہ
﴿فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝ وَيُنَقِّلُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝﴾

(٨٤/ الانشقاق)

”تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔“
قرآن پاک میں بارہایہ آیتیں یا یعنیہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

﴿وَكَيْثِرُ الَّذِينَ أَمْنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَاحَتِيْنِ كَجْرِيْنِ مِنْ تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ ۝﴾

(٢/ البقرة)

”اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باعث کی خوش خبری سنائیں گے کیونکہ ہمیں ہیں۔“
ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بال مقابل صالح اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے،
اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں
جن کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے یعنیہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی
آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہو گا جس کی ترقی اور نشوونما کی
امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں، تو ریگ میں پانی کی روائی ہے جس کا وجود عدم یکساں
ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

﴿وَأَدْخِلُ الَّذِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ جَنَّتٍ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِيلِنَّ فِيهَا يَأْذِنُ
رَبِّهِمْ مَا يَحْتَمِلُونَ فِيهَا سَلَمٌ﴾ الْكُرْتَرْ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيْبَةً لَشَجَرَةً طَيْبَةً
أَصْلُهَا نَافِتٌ وَكَرْعَهَا فِي السَّمَاءِ لَتُؤْتَى أَكْلَهَا كُلَّ حِينٍ يَأْذِنُ رَبِّهِمْ وَيَضْرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾ (۲۳-۲۵ / ابراهیم)

”اور جو ایمان لائے اور اپنے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے، جن کے نیچے نہریں بہتی
ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدار ہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو
نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک سترے درخت کی طرح
ہے، جس کی جز مضبوط ہوا رہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا
کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔“

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب
یہ کہا گیا کہ ”اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدار ہیں گے۔“ تو دوسرے میں ہے کہ ”وَهَدْرَخْتَ
اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا ہے گا۔“ کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے، جس کی جز مضبوط
و متمکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہ رضی اللہ عنہا
نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہرہ ہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی کی ہے،
انھوں نے آکر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے اسکی تحریر میں فرمایا: ((ذلک عملہ یعنی
لہ)) ”یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہرہ ہی ہے۔“

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہو یدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر
روال سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت
میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان خوشما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال
صالح صاف و شفاف نہر کی صورت میں نہایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف ولذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریع کی جاسکتی ہے، علوم نبوی کے
ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغ
میں لکھتے ہیں:

واکثر الواقع الحشرية من هذا القبيل وبالجملة فتشبيحات

* تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱۳، ص ۱۲۰۔

* صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب العین الجاریة فی المنام: ۷۰۱۸۔

و تمثيلات لاما عندها و تشبيع النعمة بمطعم هنئي و مشرب مريئي
و منكح شهی و ملبس رضی و مسكن بھی۔ *

”حرث کے واقعات از قبل تمثیل ہیں حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں
میں اور مشائی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے،
خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت الگیز لذتِ نکاح، دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں
نمایاں ہوگی۔“

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشییہ کے کیا معنی ہیں
اور کیونکہ غیر جسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں جسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحی کی
اگر تخلیل کی جائے تو ان کی اولاد و قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اس کی اطاعت، جس کو حقوق
اللہ کہتے ہیں اور دوسرا بندگانِ الہی کے ساتھ حسن سلوک، بندگانِ الہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے
وہ بھی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی
کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی بیکی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں انہیں کی نسبت ہم ان
کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہو سیں، جنت کی نعمتیں انہیں پانچ قسموں میں مختصر ہیں۔
ایمان و اخلاص و اطاعت کی جزا وہ خود تبارک و تعالیٰ ہے، وہ اپنے دیدار سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا
حسین و مدد جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم
قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراہمانی ہے،
پہنانے کی جزارِ شم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوشنام لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں حسن سلوک کی
جزا، خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿إِنَّ لَكُمْ أَلَا تَجِدُونَ فِيهَا وَلَا تَعْرِي ۝ وَأَنَّكُمْ لَا تَقْلُمُونَ فِيهَا وَلَا تَنْظُلُونَ ۝﴾

(۱۱۹، ۱۱۸: طہ)

”بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ ننگا اور پیاسا ہونا، نہ دھوپ
میں رہنا۔“

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحی کی
بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے، جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا ہے، نہ ننگا ہونا،
نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر و طرح سے کی جاسکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت

* حجۃ اللہ البالغة، ص: ۳۶

میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے بکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہو گا نہ پیاسا ہو گا اور نہ تگا ہو گا اور نہ دھوپ اور لوکی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہو گا اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہو گا اور پینے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھرنے میں ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر بچھیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باع اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزرنا ہو گا۔ یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف ولذت ہے، وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے۔ انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارہ کرتا ہے اور بڑی سرست پر چھوٹی سرست کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بناء ہے، اعمال صالحہ کے جعلانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صحیح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باذہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، خود بھوکارہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مکار بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اسی طرح پاکیزہ زندگی گزارنے پر اس کو آخوند کی غیر فانی دولت اور بادی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام، کھانا، پینا، پہننا، رہنا ہے اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں جو ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوان طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَقْتَامُنَ طَغَىٰ وَأَتَرَ الحَيَاةَ الدُّنْيَا لَهُ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هُنَ الْمَأْوَىٰ وَأَقْتَامُنَ خَافَ مَقَامَهُ

رَبِّهِ وَتَهَى النَّفْسُ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هُنَ الْمَأْوَىٰ﴾ (۷۹/ النازعات: ۴۱-۳۷)

”پس جس نے خدا سے کرشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے، لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔“

گواں کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وفات اور قیامت دنیا میں تھوڑی تھوڑی کو کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿وَإِنَّمَا يُوقَنُ أَجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيْمَةِ﴾ (۲/ آل عمران: ۱۸۵)

”اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔“

لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تخلیل کرو، تو بالآخر ان کی انتہا انہیں با توں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر دویعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں، وہ یہیں ہیں باغ و بہار، بس و طعام، جو رو قصور، خدم و خشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخلیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ سمجھنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسروتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گناہ گاری کی مرکب ہوتی ہے اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو ملیں گی، وہ ہمارے انہیں عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوڑ ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخلیل

اس دنیا کے کون دفادر میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں بٹلا ہیں ہم کو تخلیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی دسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملًا اپنی اپنی خواہشوں اور تمباوں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخلیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آفرت کی اس دنیا کا نام ہے، جو ہمارے اعلیٰ ترین تخلیل اور ہماری تمباوں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی:

﴿جَنَّتُ عَدِّيْنَ يَدْخُولُهَا تَجْرِيْ مِنْ يَمِّيْنَ الْأَنْهَارُ هُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُوْنَ مَكْذِلَكَ يَمِّيْزِيْ
اللهُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱۶ / النحل) (۳۱)

”رہنے کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں ان کے لیے ان باغوں میں وہ ہے، جو وہ
چاہیں، اللہ اسی طرح پر ہیزگاروں کو بدل دے گا۔“

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا شَتَّهِيَ أَفْسُلُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ۖ﴾ (۴۱ / حُمَّ السَّجْدَة: ۳۱)

”اور تمہارے لیے جنت میں وہی ہے، جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لیے اس میں وہ
ہے، جو تم مانگو۔“

﴿لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ فِيهَا وَكَذِيلَاتِ مَزِيدَوْ﴾ (۵۰ / ق: ۳۵)

”ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔“

﴿وَفِيهَا مَا لَتَهْيَهُ إِلَّا قُفْسٌ وَنَكَدٌ الْأَعْيُنُ﴾ (٤٣ / الزخرف: ٧١)

”اور جنت میں وہ ہے، جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔“

﴿لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَلِدِينَ طَحَانَ عَلَى رَيْكَ وَعِدًا مَقْتُولًا﴾ (٢٥ / الفرقان: ١٦)

”ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔“

﴿لَهُمْ قَاتَلُوكُمْ عِنْدَ رَبِيعِهِمْ﴾ (٣٩ / الزمر: ٣٤)

”ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں گے۔“

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغ خیال از کر پہنچ سکتا ہے، لطف و سرست کا وہ بلند سے بلند تخلیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لیے مہیا ہو گا۔ صحابہ ؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان سرست کے متعلق وہ اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہو گا اس کی کیفیت بھی یہ ہو گی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کرو ہ کرے گا تو اللہ فرمائے گا کہ تمھارا کوہ و سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر ۲ یہاں تک کہ بازار کا شوق ہو گا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہو گی کہ ہاں کسی چیز کی کمی ہو گی بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہو گی۔ (الا الصور من الرجال)

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہو گا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منہوں میں انجام پا جائے گا، ۱ ایک بدوسی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ اور ہاں گھوڑے بھی ہوں گے؟ فرمایا کہ ”اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یا قوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہو گا۔“ دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اونٹ بھی ہو گا؟ فرمایا: ”اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو تمہارا دل چاہیے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔“ ۲

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے۔ اس لیے اعلیٰ کے بس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کی کا خیال ہو گا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حتیٰ بتخلیل الیہ) ۳ کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہو گا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ ۴

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب آخر اہل النار: ۴۶۲۔ ۲ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في سوق الجنۃ: ۲۵۵۰۔ ۳ صحیح بخاری، کتاب الحرج والمزارعة: ۲۳۴۸۔

۴ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في صفة خیل الجنۃ: ۲۵۴۳۔ ۵ ترمذی، میں ”الیہ“ کے بجائے ”علیہ“ کے الفاظ ہیں۔ ۶ ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء في سوق الجنۃ: ۲۵۴۹۔

ع بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسروزندگی بھی اسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں سرت کے پھول کے
ساتھ غم کا کوئی کائنات چھرہا ہو یا تو موجودہ سرت کے آیندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گزشتہ ناکای کا
افسوں ہے، اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ
مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

﴿لَاخُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ﴾ (۱۰ / یونس: ۶۲)

”نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔
دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیزہا بدن پر رکھ سکتا ہے
جب تک اس کے سر کا پسینا اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوشش کافی نتیجہ
ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بغم و تکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و
کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسانی کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میر آئے گا
جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی
ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ ترک و احتشام اور لباس و زیور سے آ راستہ ہو کر خدا کی حمد
و تعریف کا تراناں لفظوں میں گائیں گے:

﴿جَنَّتُ عَدُونَ يَدُ خُلُونَاهَا يَكُونُ فِيهَا مِنْ أَسَاوِدَ مِنْ ذَهَبٍ وَأَوْلَوْا وَلِيَاسِهِمْ فِيهَا حَرَبٌ
وَقَالُوا إِنَّمَا الْمُحْمَدُ بِلِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ إِلَيْهِ الَّذِي أَحْلَنَا دَارَ
الْمُقَامَةَ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمْسَأُ فِيهَا نَصْبٌ وَلَا يَمْسَأُ فِيهَا الْغُوبُ﴾

(۳۵-۳۲ / فاطر: ۲۵)

”رہنے کے باع جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے لگن اور موٹی پہنائے جائیں
گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم
دور کر دیا ہے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے،
وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس
میں ہم کو تھکنا ہے۔“

﴿لَا يَسْهُمُ فِيهَا نَصْبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِغَرِّ جِينٍ﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۸)

”اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔“

جنت جہاں رشک و حسد نہیں

موجودہ دنیا خیر و شر کے مقابلہ عناصر سے بی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم دلی کے ساتھ سنگدی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بعض وحدت، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا کر ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلا ب کا وجود نہ ہو گا ہر قسم کے گناہ، سنگدی، عداوت اور بعض وحدت کا خاتمہ ہو گا اور خالص محبت والفت کے دریا موجز نہ ہوں گے۔ فرمایا:

﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا الْغُواْلُ الْأَسْلَمُ﴾ (۱۹ / مریم: ۶۲)

”اس میں امن و سلامتی کے سوا کوئی بیرونہ بات نہیں نہیں گے۔“

﴿وَنَزَّلْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَيْرِ تَحْرِيرٍ مِنْ تَحْقِيمِ الْأَهْرَافِ﴾ (۷ / الاعراف: ۴۳)

”اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا، ان کے یونچ نہیں بھتی ہیں۔“

﴿وَنَزَّلْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَيْرِ إِنْوَانٍ أَعْلَى سُرُورٍ مُتَكَبِّلِينَ﴾ (۱۵ / الحجر: ۴۷)

”اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کرتتوں پر آ منے سامنے بیٹھے ہوں گے۔“

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہو گا نہ باہم بعض و کینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متعدد ہوں گے۔“

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟

بہشت میں زندگی کی جولنڈیں ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت و شراب اور دوسراے مادی لذائز سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ و صرفت اور اطمینان و سکون و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آسودہ نہ ہوگی یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوئے ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہو گا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اہل جنت کھائیں گے اور پیشیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور لکھکھار جیسی گھاؤنی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈاکار میں ہضم ہو گا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوبصورتی ہوگی، جو بہشت میں داخل ہو گا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ یہاں پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آتے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوزھے نہ ہو گے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی

• صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنۃ و اهلہہا:- ۷۱۵۱

چودھویں کے چاند کی طرح۔ ۴۰

غور کر کوہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہو گی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آماڈہ انکار ہونا انشدیدی نہ ہو گی، ایسے ہی اس ماڈی زندگی کے خواگر اور اس عالم آب و گل کے باشندے اس دوسرا زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آماڈہ انکار ہوں تو ان کا بھی یہ فعل داشمندی کے خلاف ہو گا۔

جنت ارتقاء روحانی ہے

ماڈی وجسمانی خلقت و نظرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ ہے کہ ماڈہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر ببات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں محمودار ہوا اور یہ ماڈیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر بنا تیت پیدا ہوئی اور بنا تیت فا ہو کر حیوانیت محمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقاء انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا راخ جو روحاںیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک ماڈہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بننے پڑنے کو ٹھہر جاتا ہے، لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اذکر سقف آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آئینوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يَرْثُونَ الْفَرِدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلَّةٍ ۝
طَيْبٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرْأَمَّ مَكَنْبِنَ ۝ ثُمَّ حَكَلْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ۝ خَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْعَةً
خَلَقْنَا الْمُضْعَةَ عَظِيمًا فَلَكُونَا الْعَظِيمَ لَهُمَا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا أُخْرَ ۝ فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَخْسَنُ
الْخَلِيقَيْنَ ۝﴾ (۲۳) / المؤمنون: ۱۱-۱۴)

”جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں صدارتیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو منی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو اٹھرا بنایا، پھر بڑیوں کو گوشہ پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔“

* بایہادیث صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنۃ و اهلہہ: ۷۱۵۶ تا ۷۱۵۲ میں ہیں۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رُزگار نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی ٹنگ دتاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اس طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد فرمایا:

﴿تُمْ إِنَّمَا بَعْدَ ذَلِكَ لَمْ يَتَّخِذُونَ شَيْئًا إِنَّمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبَعَّثُونَ﴾ (۱۵)

(۲۳/ المؤمنون: ۱۵، ۱۶)

”پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہوا اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔“

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مت کرو دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوئے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مت کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہاڑا رہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہو گا۔ یہاں مسئلہ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقاءِ اصلاح کہتے ہیں، ان مدارج ترقی کے اثنامیں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح بھی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد انہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی بھی بھی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو جکی تھی دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی و بنیاتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔ بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہو گا، بلکہ وہ بقدر استعداد و تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٌ﴾ (۹۵/ التین: ۶)

”ان بہشتیوں کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔“

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشأۃ ثانیۃ میں اہل ایمان کے آگے پہنچے، داہنے باہیں نور ہو گا پھر بھی دعا کریں گے:

﴿نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَنْهَمْ لَنَا نُورًا وَأَغْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۶۶/ التحریر: ۸)

”ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں دوڑے گا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے

نور کو کامل کراو، ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے۔“

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تمجیل اور اتہام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی رو بیت کا منشائے۔
امن وسلامتی کا گھر

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں ٹلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی وہ پرندہ جو عمر ہر چار عنصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ النبی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدی ﷺ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا، جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر ہیں۔
اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۶/الانعام: ۱۲۷)

”ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر ﷺ کو مبوعث فرمایا، وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید بشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ يَدْعُوكُمْ إِلَى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰/یونس: ۲۵)

”اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔“

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبد اللہ بن سلام ﷺ جو ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا دہ تھی ”لوگو! اسلامتی پھیلاو، بھوکوں کو کھلاو، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہو گا۔“ جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درود یوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

﴿وَالْمَلِكَةُ يُدْعُونَ عَلَيْهِمْ قِنْ مُلْقٌ بَأَپٌ سَلَمٌ عَلَيْهِمْ بِمَا صَبَرُتُمْ فَيُعَمَّرُ عَقَائِي الدَّارِ﴾

(۲۴، ۲۳/ الرعد: ۱۳)

”اوفر شتہ ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے

* مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۲۳، ۴۹۳۔

صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔“

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

﴿إِلَّا قِيلَ لَهَا سَلَامًا﴾ (۵۶/الواقعة: ۲۶) ”لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔“

فرشتہ اہل جنت کو یوں کہیں گے:

﴿إِذْ خَلَقْنَا إِلَيْكُم مُّلْكَ يَوْمَ الْخُلُودِ﴾ (۵۰/ق: ۳۴)

”اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔“

﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا الْغَوَّ إِلَّا سَلَامًا﴾ (۱۹/مریم: ۶۲)

”اس میں سلامتی کے سوا اور کوئی بے ہودہ بات نہیں گے۔“

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام ایمن (امن والا مقام) بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامِ أَمِينٍ﴾ (۴۴/الدخان: ۵۱)

”بے شک پر ہیز گار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔“

مقامِ رحمت

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بوجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قبر الہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقع ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں بٹنا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غصب کا نام و نشان نہ ہوگا، اس کی رحمت اور فیض و کرم کی وہاں باہر ہو گی اور اس کی رحمت کے سوا کوئی اور منظر کہیں اور کوئی دکھائی نہ دے گا:

﴿لَيُبَشِّرُهُمْ رَبِّهِمْ بِرَحْمَةِ مِنْهُ وَرِضْوَانِ وَجْهَتِ لَهُمْ فِيهَا أَعْيُمْ مُّقِيمُمْ﴾

(۲۱/التوبہ: ۹)

”ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔“

اہل جنت کے چہرے خوشی سے دستے ہوں گے، یہ آوازنائی دے گی:

﴿وَآمَّا الَّذِينَ ابْيَضُتُ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ﴾

(۱۰۷/آل عمران: ۲۳)

”لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اس میں وہ سدار ہیں گے۔“

مقامِ نور

جنت کا نور وہ مقام ہے، جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے،

کوئی ستاروں کی طرح چکے گا اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہو گی، آگے پیچے، داہنے باسیں ہر سمت سے نور درختاں ہو گا، فرمایا:

﴿تُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبَيْنَ أَيْمَانِهِمْ﴾ (٦٦ / التحریم: ٨)

”ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔“

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کو نہیں گی:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى تُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبَيْنَ أَيْمَانِهِمْ بُشْرِكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

(١٢ / الحدید: ٥٧)

”جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں ہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کر دے گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

اس دن اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذراٹھبر جائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لیے روشنی ہو جائے:

﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفَقُونَ وَالْمُنْفَقْتُ لِلَّذِينَ أَمْنَوْا النُّظُرُ وَأَنْقَطُوا مِنْ تُورُكُمْ﴾

(١٣ / الحدید: ٥٧)

”جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذراٹھبر وہ کہم بھی تمہارے نور سے روشنی کر لیں۔“

مقامِ رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہو گا، بلکہ اس کا پی رضا مندی اور خوشنودی کی لازماں دولت عطا فرمائے گا، متقویوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک یوں یاں اور ان سب کے بعد روح کی سرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضا مندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورہ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دے گئی ہے:

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةِ قِنْهٖ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتٍ لَهُمْ فِيهَا لَعِيمٌ مُّقِيمٌ﴾

(٢١ / التوبہ: ٩)

”انکا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رسوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کو جن میں سخت الہی قائم رہے گی۔“

سورہ حیدر میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضاۓ الہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

﴿وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ
الْخَرُورُونَ سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَجَنَاحَةُ عَرْضَهَا لَعْرُضُ السَّمَاوَاتِ الْأَرْضِ أَعْدَتُ
لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ طَلِيلًا فَصَلُّ اللَّهُ عَلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ مَا وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمُ﴾ (۲۱، ۲۰)

”اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کا پھیلاو آسمان اور زمین کے پھیلاو کے برابر ہے، یہاں کے لیے بنائی گئی ہے، جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ برا مہربانی والا ہے۔“

سورہ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گناہ کران کا خاتمہ رسوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ آتَيْنَا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَاحَتٍ تَجْبِيْنِ مِنْ تَعْيِّهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِيْنَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطْكَفِّرَةٌ
وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ﴾ (۱۵/آل عمران: ۳/۲)

”جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں ہتی ہیں، ان میں وہ سدار ہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔“

سورہ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر سخت رضوان الہی کو فرار یا ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَاحَتٍ تَجْبِيْنِ مِنْ تَعْيِّهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِيْنَ فِيهَا وَمَسِكَنَ
طَيْبَاتٍ فِي جَنَاحَتِ عَذَابٍ طَرِيقَاتٍ مِّنَ اللَّهِ الْأَكْبَرِ طَلِيلًا هُوَ الْغَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

(۹/التوبہ: ۷۲)

”اللہ نے با ایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں ہتی ہیں، ان میں سدار ہیں گے اور رہنے کے سترے گھر اور اللہ کی رضامندی، سب سے بڑی ہے وہی بڑی کامیابی ہے۔“

بہشت کی مطمئن روحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ نوید سرت سنائی جاتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفَسُ الْمُطَبَّعَةُ ارْجِعْ إِلَى رَبِّكَ رَاضِيَةً مَرْضِيَةً﴾

(۸۹/الفجر: ۲۷-۲۸)

”اے اطہینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کر تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔“
اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ﴾ (۵ / المائدۃ: ۱۱۹)

”خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔“

انہیں آئیوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ ”خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والا وہ جواب دیں گے اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے۔ عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تم نے ہم کو وہ سچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گز شریعت متوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کون نہ دوں؟ کہیں گے، اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضا مندی و خوشی تم پر اتا رہوں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔“ *

مقامِ طیب و ظاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آسودگیوں اور تجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پا کی، سترائی، لاطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

﴿طَيِّبُهُمْ فَأُدْخِلُوهَا خَلِيلِينَ﴾ (۳۹ / الزمر: ۷۳)

”تم پاک ہو چکے تو جنت میں بھیش کے لیے داخل ہو جاؤ۔“

جوز ندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک و صاف ستری اور ہر جسمانی اور وہ جانی آلات سے بری ہو گی، فرمایا:

﴿مَنْ عَمَلَ صَالِحًا قِنْ ذَكْرًا أَوْ أُثْنَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُخُبِّئَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنُعَذِّبَنَّهُمْ أَجْرُهُمْ يَا أَخْسَنَ مَا كَانُوا لِيَعْمَلُونَ﴾ (۱۶ / النحل: ۹۷)

”مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کرائجھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدل دیں گے۔“

جو گھروہاں ملیں گے، وہ بھی پاک و صاف اور سترے ہوں گے:

﴿وَمَسِكَنَ طَيِّبَةً﴾ (۶۱ / الصف: ۱۲) ”اور پاک گھر۔“

جو بیویاں ملیں گی، وہ بھی پاک ہوں گی:

* صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعمتها واهلها، باب احلال الرضوان: ۷۱۴۰۔

﴿وَأَنْوَجْ مُطْهَرَةً﴾ (۳/آل عمران: ۱۵) ”اور پاک بیویاں۔“

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿وَهُدُّوا إِلَى التَّقِيَّٰ مِنَ الْقُوْلِ﴾ (۲۲/الحج: ۲۴)

”او راہیں جنت کو پا کیزہ گتگلوکی طرف را ہمنائی کی جائے گی۔“

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہو گی:

﴿شَرَابًا طَهُورًا﴾ (۷۶/الدھر: ۲۱) ”پینے کی پاک چیز۔“

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک و صاف، طیب و طاہر اور تمام روحاںی و جسمانی آلوگیوں سے مبراہوگی۔

مقامِ تسبیح و تہلیل

اس آرام و لطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد و شا اور تسبیح و تہلیل ہو گی، یہ ان کی روحانی غذا ہو گی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الہی برستے ہیں، جہاں صفائی اور سحرانی کے سوا کوئی اور منظر نہیں، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد و شنا کے روح افزاتا نے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

﴿دَعُوْبِهِ فِيهَا سُبْعَنَكَ اللَّهُمَّ وَسَخِيْتُهُمْ فِيهَا سَلَّمَ وَأَخْرُدَعُوْبِهِمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ

الْعَلَمِيْنَ﴾ (۱۰/یونس: ۱۰)

”جنت میں ان کی ندا یہ ہو گی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی

ہو گی اور ان کی آخری پکار یہ ہو گی کہ دنیا کے پرو درگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔“

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد یہی نعمت یہ ہو گی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی ختنی پر لطف را ہیں وہاں

ان پر کھلیں گی، فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّلَاحِيْتَ جَنَّتَ تَحْرِيْيَنِ مِنْ تَحْقِيْمَا الْكَاهِرِ مُحَلَّوْنَ فِيهَا

مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِيَاسِهِمْ فِيهَا حَرَيْرٌ وَهُدُّوا إِلَى التَّقِيَّٰ مِنَ الْقُوْلِ﴾

﴿وَهُدُّوا إِلَى صِرَاطِ الْعَجَيْبِ﴾ (۲۲/الحج: ۲۴، ۲۳)

”بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے

نیچے نہیں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے لگن اور موٹی پہنائے جائیں گے اور ان کی

پوشک ان میں ریشم کی ہو گی اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں

گے اس سرپاہم (ذات) کی راہ۔“

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الہی کا سرود و سردمی گائیں گے اور یہ

وہ وقت ہوگا، جب عالم وجود کے ہر گوشے سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتِهَا سَلَمٌ عَلَيْكُمْ طَبِيعُمْ فَادْخُلُوهَا خَلِيلِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي
صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَيَعْمَلُ أَجْرُ الْعَلِيِّينَ ۝
وَتَرَى الْمَلَكَةَ حَافِيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَيْحُونَ بِمُحَمَّدٍ رَّبِّهِمْ ۝ وَقُطْبَيَ بَيْنَهُمْ يَالْحَقِّ
وَقَيْلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝﴾ (٣٩/ الزمر: ٧٣-٧٥)

”جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہوتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرز میں کامال کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور یہ دیکھئے گا کہ فرشتے عرش الہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔“

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

﴿لَا يَسْعُونَ فِيهَا الْغُواصِ الْأَسْلَمُوا وَلَهُمْ ذُفْهُمْ فِيهَا بَكْرَةً وَعَشِيَّاً ۝﴾ (١٩/ مریم: ٦٢)

”وہ نہیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔“

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تبلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا امراء ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر سے جانتا ہوں، صبح سلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

﴿يُسَيْحُونَ اللَّهُ بُكْرَةً وَعَشِيَّاً ۝﴾

”وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اہل جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا۔“ اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

﴿وَهُدُوا إِلَى التَّقْبِيْرِ مِنَ الْقُولِ ۝ وَهُدُوا إِلَى صِرَاطِ الْحَمَيْدِ ۝﴾ (٢٢/ الحج: ٢٤)

”اور اچھی بات کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے گی اور اس سرپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔“

مقامِ قرب

اہل جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان سب کے سواب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے

* صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنۃ: ٧١٥١۔ * صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنۃ: ٧١٥٥؛ سنن دارمی، کتاب الرفق، باب فی اهل الجنۃ و نعمتها: ٢٨٢٨۔

اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جا بجا ان کے لیے یہ آتا ہے کہ «جَزَاءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ» ”ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے۔“ یہ ترب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس نصرت کے بعد جاتا ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَّنَهَرٍ فِي مَقْعَدٍ صَدِيقٍ عِنْدَ مَلِيلٍ كُفَّارٍ﴾

(۵۴/القرآن: ۵۵)

”بے شک پہیزگار، باغوں میں اور نہروں میں، چوائی کی نشت گاہ میں، اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔“

دیدار

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی یا وہ نور مطلق کی خاص شان میں نمایاں ہو گا، اس وقت یہ عالم ہو گا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نبودار ہو گا اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی:

﴿وَجْهُ يَوْمَئِنْ تَأْسِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا كَانَ ظَرَفًا﴾

(۲۲/القيمة: ۷۵)

”کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی مست دیکھ رہے ہوں گے۔“

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اپنے پروردگار کو بالمشابہہ دیکھو گے۔“ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار و روایت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہو گا۔“ اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ دوسرا مقصود یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہوتا ہے لوگ ایک چاند کو یکسان حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کادیکنداوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہو گا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن ختنی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہو گی:

﴿جَعَلْتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَمًا﴾

(۴۴/الاحزاب: ۳۳)

”ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہو گی۔“

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سر اپارحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا:

﴿سَلَمٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحْمَةٍ﴾

(۳۶/یس: ۵۸)

• صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ: وجہہ یوم میڈنا ناصرہ: ۷۴۳۶۔

”رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیامِ سلامتی ہو گا۔“

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔“

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادت ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اس کو اسماء و صفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ بیاکین د اور یہارابہ پیش د اور اندازیم ع

ع ان تعلیمات کا عملی اثر

اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گزر چکے ہیں، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے تلقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مرکب جی انھنا اور اس موت کے بعد وہ بارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستعد تھی، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جسم کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورہ قم کی تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاخیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض ہدایت سے نہ صرف انکا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظران کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔ یاد ہو گا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طوراً کہا تھا:

اموت ثم بعث ثم حشر حدیث خرافه یا ام عمر و

”کیا سرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا اے عمر و کی ماں سے خرافات ہاتیں ہیں۔“

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طفرہ انکار، رمزیقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا:
”هم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔“²⁴

وَانَا لِنرْجوا فُوقَ ذَالِكَ مَظْهِرًا

”اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔“

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ ”جنت یا رسول اللہ؟“ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ”ان شاء اللہ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اوچی نہیں جایا تی تھیں

^٤ صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب كلام الرب يوم القيمة مع الآباء وغيرهم: ٧٥١٢.

^٢ اصابه، ج ٦، ص: ٢١٩؛ استیعاب ذکر نایبغة جعدي، ج ١، ص: ٣٢١.

ان کا تخلیل آسمان سے بھی اوپر جانے لگا، جن کو مرکر پھر جینا اور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے موآخذہ کا کوئی ذرہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جواب دی کی پروانہ تھی، جو سر اور جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخلیل سے نا آشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ذرنے لگے، دوسرا زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے موآخذہ سے وہ بیدکی طرح کاپنے لگے، اعمال کی جواب دی سے ترساں ول رزاں رہنے لگے، سر اور جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی رقبائی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ذر ان کے دل کے اندر کے ہر تارکو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اٹک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کی دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کا خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنادیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بد اعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے غنوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا: ”میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعا اور مدعا عالیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے لگے میں آگ کا ایک طوق پہنار ہا ہوں۔“ یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگ کر ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔

حضرت عمر بن الخطابؓ خدا کے مطیع فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدا تھے، نبیوں سے ملام جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے موآخذہ اور جواب دی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ”اگر وصال نبوی کے بعد میرے اچھے اور برابرے اعمال برابر ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔“ اگر جنت نہ ملے تو پرانہیں مگر الہی دوزخ نہ ملے۔“ وہ نزع کے حال میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گناہ کران کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا: ”خدا کی قسم! اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الہی سے نجات کرتا تو میں دے دیتا۔“ ﴿ام المؤمنين حضرت عائشہؓ کہتی تھیں: ”اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی ہے اے کاش میں کچھ نہ ہوتی۔“

❶ سنن ابی داود، کتاب القضا، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۲۵۸۴۔

❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: ۳۹۱۵۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب

النس، باب مناقب عمر: ۲۶۹۲۔ ❹ ابن سعد جزء النساء، ج ۸، ص: ۵۱۔

❺ مستدرک حاکم، ج ۴، ص: ۹؛ مسند احمد، ج ۱، ص: ۲۷۶۔

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مورث آیت:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ يَوْمَ تَرَوُهَا تَذَهَّلُ كُلُّ
مُرْضِعَةٍ عَنْهَا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُمُ كُلُّ ذَاتٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُلْطَانِي وَمَا هُمْ
يُسْكَدُونَ وَلَكُنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ﴾ (۲۲، الحج: ۱)

”لوگو! اپنے رب سے ذرو، قیامت کا بھونچاں ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے پچ کو بھول جائے گی اور پھیٹ والی اپنا پھیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نہشہ میں دیکھو گے، لیکن وہ نہشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہو گا۔“

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عناءب کا حال بیان کیا تو صحابہ چھینیں مار مار کر رونے لگے، ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گئے اور جب امیر معاد یہ ﷺ کے سامنے یہ روایت دھرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدرا کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلا بامنڈا آ رہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صاف باندھ کھڑے ہیں کہاں کہاں ﷺ صاحبہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں: ”لواس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے۔“ ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں ”ہاں۔“ وہ خوش سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپ دریافت فرماتے ہیں کہ ”تم نے واہ واہ کیوں کہا؟“ عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں۔ فرمایا: ”تم اس میں ہو۔“ یہ سن کر وہ بھجور نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گز را بولے، اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر بھجور میں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوہ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا احاد کے میدان میں دارو گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں اگر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا: ”جنت میں۔“ وہ بھجور کھا رہے تھے ہاتھ سے بھجور میں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی، ایک قیس ایک

۱ صصحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر ترمذی، ابواب التفسیر: ۴۷۴۱؛ ۲ جامع ترمذی، ابواب التفسیر: ۳۱۶۸۔

۳ سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب التعمود من القبر: ۲۰۶۴۔

۴ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی الربیاء والسمعة: ۲۳۸۲۔

۵ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهید: ۴۹۱۵؛ ۶ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهید: ۴۹۱۳؛ ۷ سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب ثواب من قتل فی سبل الله: ۳۱۵۶۔

صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جنت کے دروازے تواروں کے سامنے کے نیچے ہیں۔“ ایک معمولی سامسلمان پاس کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنائے؟ انہوں نے کہا ”ہاں“ یہ سن کرو وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تووار لے کر دشمن کی صفائی پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔ *

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ملکر و کافر عرب کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں عربوں کے عقائد اخلاق اور کارناٹوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

* صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهید: ٤٩١٦۔

قضاء و قدر

﴿إِنَّا مُكْلِفُ شَيْءٍ عَلَّاقَنَهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ٤٩)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن پاک میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلہ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت تدرست اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا حصل یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہو گا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلہ از لی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہو گا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزیبات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مددوار اس کی تعمیر کو کمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندس ازل، خاتم کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزیبات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا، اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت و حیات، نفر و غنا، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراة میں حضرت آدم علیہ السلام و شیطان اور ہاتھیل و قابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گزر کر زبور میں اس کی کھلکھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸-۱۴۲ (کتاب مقدس عہد نامہ قدم، ص: ۹۹) میں ہے:

”تیرے کام حیرت افرا ہیں، اس کا میرے جی کو برا یقین ہے، جب کہ میں پر دے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھے سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بیٹیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔“

اس کے بعد زبور ۱۴۱-۱۴۲، (کتاب مقدس عہد نامہ قدم، ص: ۱۰۳) کا ترانہ حمد اسی لئے میں شروع ہوتا ہے:

”خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (خلوقات) موجود

ہو گئے، اس نے ان کو ابدی پائیداری بخشی اس نے ایک تقریب مقرر کی جو نہیں سکتی۔“

انجیل میں اس کی تعلیم ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام از ندگی کی آخری شب کی

صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۹۳

دعا میں فرماتے ہیں: ”میری مرض نہیں تیری مرضی پوری ہو۔“ (متی ۲۶-۳۹) اور اسی ”مرضی“ کا ذکر کریا جتا (۳۸-۴۵) اور خطوط (فلپن ۱۳-۲) میں ہے اور روایتوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی جمل حقیقت کی توضیح کی اور اسکی حکمت و مصلحت کی تشریع کی اور دوسرا بات یہ کی کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے وقت کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقت ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لے بلکہ بار بار اتنی دفعہ دھرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر پیدا کر لیا اور یہ تلقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی اور ایسا اس نے اس لیے کیا، تاکہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے، بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیروکوں کے اندر انتقال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وَحَیْ مُحَمَّدٌ ﷺ نے اس اصطلاح کے لیے دلفظ اختیار کیے ہیں ایک ”قدر“ ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا ”قضا“ جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں:

﴿إِنَّكُلَّ شَيْءٍ خَلَقْتَهُ بِقَدْرٍ﴾ (۴۹: القمر)

”هم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔“

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَهُ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَى أَجَلًا﴾ (۶: الانعام)

”وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔“

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرمادیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جواہام دے دیے، موت و حیات، فنا و بقا اور عروج و زوال، غرض کائنات کی ہرشق اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادیے انہیں پر وہ چل رہی ہے۔ قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

﴿وَالثَّمَسُ تَجْرِي لِمُسْتَقْبِلِهَاٖ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الرَّحِيمِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرُ قَدَرُهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ

عَادَ كَالْعَرْجُونَ الْقَدِيرُ وَكَالثَّمَسُ يَتَبَعِي لَهَا إِنْ تُدْرِكَ الْقُمَرُ وَلَا إِلَيْهِ سَاقِيَنَ التَّهَارِ

وَكُلُّ فِي فَلَكٍ يَتَبَعَّدُونَ ۝﴾ (۴۰: پس ۳۸)

”اور سورج اپنے ٹھہر اور پرچل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں ممزیلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی شہنشی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔“
یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَقَدَرَ فِيهَا أَقْوَانُهَا﴾ (٤١ / حم سجدۃ: ١٠)

”اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔“

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا:

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ عَدْدًا﴾ (٦٥ / الطلاق: ٣)

”اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے۔“

موت و حیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

﴿تَحْنُنُ قَدَرْنَا بِيَنَّكُمُ الْمَوْتَ﴾ (٥٦ / الواقعة: ٦٠)

”ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔“

ہر شے میں اللہ نے جواندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونی فطرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصے اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام معین فرمادیے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علی ہذا انسانوں کی ترقی و زوال، موت و حیات، یہاری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت، ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرمادیے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِأَذْنِ اللَّهِ﴾ (٦٤ / التغابن: ١١)

”نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت، لیکن اللہ کے حکم سے۔“

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدرات کو نوٹھی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بھولتیں نہیں:

﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُثْنَى وَلَا تَضْمَ إِلَّا يُعْلَمُهُ وَمَا يُعْتَرُ مِنْ مَعْتَرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمْرَهُ إِلَّا

فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَبِيرُ﴾ (٣٥ / فاطر: ١١)

”اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جفتی ہے، لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمری درازی ملتی ہے، یا اس کی عمر کم ہو جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔“

اس آیت پاک میں دلکشی ہے، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ جنتی ہے، وہ خدا نے پاک کے علم سے ہے، دوسرا دلکشی ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں دلکشیوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الہی میں ہونا اور علم الہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی تائیزی کوشش کی ذرا سی کامیابی پر خروج و غرور کے نشر میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر بہت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا بے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جاتا ہے، اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغروہ اور کبھی ملوں ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی ممتازت، استقلال اور صبر و ثبات کے جو ہر کو بر باد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے خروج و مسارت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست و گیری کرے اور وہ یہی عقیدہ قضا و قدر ہے۔ اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا خروج و غرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور ما یوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نوجہ و جہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورہ حدیڈ میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمُ الْأَكْثَرُ فِي كُلِّيْبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ تَبَرَّأَهَا إِنَّ
ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لَّكِنَّا تَأْسِيْلًا عَلَى مَا فَالَّتُمْ وَلَا نَقْرَحُوا بِمَا أَنْكَمْ ۝ وَاللَّهُ لَا يُجِبُّ كُلُّ
فُتَّالٍ فَغُوْرٍ ۝﴾ (۵۷ / الحدید: ۲۲، ۲۳)

”کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بینے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لیے کیا گیا، تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا ہے، غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔“

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام نبی ﷺ کی گرد نہیں عین کامیابی و

فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یا س و نا امیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو تجھے بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطروں کے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بھالے جاسکتے تھے، نہ حادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے:

﴿وَمَا كَانَ لِيَقْرَئُ إِنْ تَمُوتَ إِلَّا بِأُذْنِ اللَّهِ كُلُّ شَيْءٍ مُّؤْجَلٌ وَمَنْ يُرِيدُ تَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِيدُ تَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَتَحْمِلُ الشَّكَرِينَ وَكَيْنَ مَنْ لَيْتَ فَتَلَ مَعَهُ يَتَّمُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لَهُمْ أَصَابَهُمْ فِي سَيِّلِ اللَّهِ وَمَا ضَعْفُوا وَمَا أُسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴾ ۶﴾ (آل عمران: ۱۴۵، ۱۴۶) (۱۴۵، ۱۴۶)

”کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھایا بر ارادہ و نیت ہے، اس نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہونا اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آیندہ (یہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جوڑے ہیں، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ ست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدمر ہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

ان آئیوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا متوجہ پستی، سستی اور دوں ہستی نہیں، بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ جیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحب وحی کی تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیوں کہ

﴿لَنْ يُعَيِّنَ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مُؤْلِسٌ وَعَلَى اللَّهِ فَلِيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴾

(التوبہ: ۵۱)

”ہم پر کوئی آفت آہی نہیں سکتی، لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔“

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں

گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تکواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئے گے:

﴿يَعْلُمُونَ لَوْكَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ عَمَّا قَاتَلُنَا هُنَّ أَقْلَعُونَ لَوْكُنْتُمْ فِي بَيْوَتِكُمْ لَبِرَزُ الظَّيْنَ﴾

﴿كُتُبٌ عَلَيْهِمُ الْقُتُلُ إِلَى مَضَّاجِعِهِمْ﴾ (١٥٤) / آل عمران

”منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرتا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر حلے ہاتے۔“

﴿أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَكَّةٍ ط﴾ (٤) / النساء: ٧٨﴾

”تم جہاں بھی رہو تم کوموت آ کریا لے گی اگر چشم مضبوط و مستکم تلقعون میں ہو۔“

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہریت، جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے مانندے سے انسان کا مجبور حضن ہونا لازم آتا ہے اور اس سے تعلیم لٹکتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کرست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اتنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی خلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھی گئے، لکنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلافاء راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔ اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دوستفادہ چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک درسرے کی متوہی تھیں اور اس طرح ایک درسرے کی تصدیق تھیں کہ ((اعملوا فکل میسر لاما خلق)) * ”لوگو! اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔“ کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجے کے مطابق جزو دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

﴿إِنْ سَعَمْ لَشَيْءٌ فَإِنَّمَا مِنْ أَعْطَى وَأَتَقُو وَصَدَقَ بِالْحُسْنَى وَفَسَسَتُكَ لِلْبَرْيَ﴾

وَأَمَّا مَنْ يَخْلُ وَاسْتَغْفِي لَوْلَدَتْ بِالْحُسْنَى فَقَسْتَنَّى لِلْعُسْنَى وَمَا يَعْنَى عَنْهُ مَالَةٌ

إذا ترددتِ أين علّكتِ الهدىٰ وَأَنْ لَكَ لِلآخرةِ وَالْأُولَىٰ ﴿٩٢﴾ (٤-١٣)

^{٤٩٤٩} صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير والليل، اذا يغشى: ٤٩٤٩.

”بے شیرہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پر ہیزگاری کی اور نیکی کو بچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پرواہی برتی اور نیکی کو جھٹالا یا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اسکی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچاسکتی ہے، پیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخراً اور اول ہمارے لیے ہے۔“

یہ ہے قضا و قدر اور سعیٰ عمل کی باہمی تقطیق جس کی ثروتی دیگر نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کامنا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے۔ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق وہدافت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق وہدافت کے نہ ملنے کا نام عدم توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کامنا انسان کی ابتدائی کوشش ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا الْهُدَى يَهُمْ بِسْلَامٍ﴾ (۲۹/العنکبوت: ۶۹)

”اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپناراست سوجھاتے ہیں۔“

خدا کی طرف سے توفیق و ضلالت کامنا خود انسان کے اچھے یا بے عمل کا لازمی نیچہ ہے:

﴿وَمَا يُيُضْلِلُ يَهُ إِلَّا الْفَسِيقُونَ﴾ (۲/البقرہ: ۲۶)

”اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے، لیکن انہیں کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔“

غرض پہلے فتن، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجے کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:

﴿وَأَنْ لَيْسَ لِإِنْسَانٍ إِلَّا مَا سَعَىٰ وَأَنَّ سَعْيَهُ سُوفَ يُبَيَّنُ﴾

(٤٠، ٣٩/النجم: ۵۳)

”اور انسان کے لیے نہیں، لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔“

اس کی مثال بالکل بچ کر کی سی ہے، بچہ چلنایا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کچھ کوشش کرتا ہے، تو اس کے والدین اس کو چلنایا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنایا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان بلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو با معنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر اللہی اور عمل انسان باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر و قدر

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلے کو چھیڑتے ہیں لیکن یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ رشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا جس طرح اہل مذہب ارادہ الہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تقطیق میں جiran ہیں اسی طرح فلسفہ الہیات کے معلم علم الہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق و اعلیٰ انسان کی آزادی عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو مشکل بچا سکتے ہیں۔ دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا ہر دھارے میں یہ گردہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں یا تو سرے سے اس سے خاموشی برقراری جائے اور دبے پاؤں اس راستے سے گزر جایا جائے یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ بھی جبر ہندو مذاہب میں تنائی آواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر، ہی رہبری کرتا ہے۔ دوسری طرف جوئی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھادیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ غرض آنحضرت علیہ السلام کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں لیکن یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بنی اور مجبور نظر آتا تھا یا کہ تنائی کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کاموں کے ہاتھوں گروکر دیتے تھے یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنادیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت علیہ السلام ہی کی شخصیت و نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پر وہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صدائیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین، بروجھر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں، جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آ جائے جس کے

۱۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اگرفاری کی رات کو دعا میں فرمایا: "اے خدا! اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے، لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔" (کتاب مقدس عبد جدید، متی، ۵:۴۹؛ ۲۶:۳۹) عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معزک آرائی کا حال فرجی فضل موسیوی دی کا منت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) صفحہ ۷۷ سے کسی قد معلوم ہو سکتا ہے۔

۲۔ شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل مقدمة الكتاب، ص: ۳ حافظ ابن قیم جملہ۔

اختیارات محدود، جس کی قدر تین ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ کسی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے کے لئے کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشنا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات میں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا اختیار، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار حضن ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مرح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور بلا سبب نہ رہے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، یہی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا او سزا پانے کا سختی ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی موت اخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفہ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں مدداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ”خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک ایک پتہ بھی گرنہیں سکتا۔“ (۵۰/النعام: ۲۶) اور دوسری طرف وہ کہتا ہے: ”ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔“ (۳۸/الدڑ: ۲۶) یعنی خدا کی ہمه گیر قدرت، وسیع اختیار اور ناقابلی روشنیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، بھی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور موت اخذہ کی بیان دے رہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ہو ((الْئَمَاءُ الْأَعْمَالُ بِالْيَتَّيَاتِ)) ۲۱۴ اس تبلیغ سے نہ تو خداۓ پاک کی قدرت و اختیار کی

۲۱۴ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی ۱۔

و سعیت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو پھیلیں لے، مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔ فرمایا:

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلِيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلِيَكُفُرْ﴾ (۱۸ / انکھف: ۲۹)

”تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔“

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفِسِهِ وَمَنْ أَسَءَءَ فَلِعِلَّهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَامٍ لِلْعَيْنِ﴾

(۴۱ / فصلت: ۴۶)

”جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیراپر در دگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک درست ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ سُومُ الصَّمَرِ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقُلُونَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمَّى وَلَوْ كَانُوا لَا يُبَيِّنُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (۱۰ / یونس: ۴۲-۴۴)

”اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم ہبڑوں کو سناو گے، اگر چوہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم انہوں کو سوچ جاؤ گے اور اگر چوہ وہ دیکھیں، بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔“

وہ انسان جواندھا اور بہرہ بتاتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرہ بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شاہراہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ لوگوں کو قرآن کی ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکہ ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے ایجھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَكُفُرُوا سَوْاءٌ عَلَيْهِمْ عَذَابُ رَبِّهِمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشاوةً﴾ (۲ / البقرة: ۶۰)

”بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنہیہ کرنا یاد کرنا
دونوں برابر ہیں، وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور
ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔“

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے خلاالت کا فیضان ہوا اور اس کو
تعمیل یا اس کا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا
ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسرا جگہ فرمایا:

﴿بَلْ طَبَّعَ اللَّهُ عَلَيْهَا يَكْفُرُ هُمْ﴾ (٤ / النساء: ١٥٥)

”بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔“

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے
صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جو ہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ *

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی
کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَمْنَأُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهُدَىٰ بِهُدًىٰ بِهِمْ يَا يَابَانَاهُمْ﴾ (١٠ / یونس: ٩)

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت
دے گا۔“

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوا زَادُهُمْ هُدًى﴾ (٤٧ / محمد: ١٧)

”اور جنہوں نے ہدایت قبول کی، ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔“

ایرانی فلسفہ خیر و شر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھادیا، حالانکہ عربی الفاظ خیر و شر کو اعمال خیر و
شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت و نعمت و آرام کے اور شر کے معنی غربت و تکلیف و مصیبت
کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک
ہو گا، تو عمل خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہو گا، جیسے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾

(٨، ٧ / الزلزال: ٩٩)

”تو جو کوئی جیوٹی برابر تسلیکی کرے گا، اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔“

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

* قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر و فتن کی علت ہیش پہلے ذکر کر
دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پا تسلیل صحیح نہیں۔

((وَالْقُدْرٌ خَيْرٌ وَشَرٌّ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰٰ))

”اور اس پر ایمان کے خرا و شر کی قدر خدا کی طرف سے ہے۔“

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور بے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، سرگزشت و تکلیف، دولت و افلاس اور سخت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھتے ہیں ان آئیوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ”اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا“ اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جرأۃ کے ہوئے ہے حالانکہ ان آئیوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے الہ یہ کہ خود خدا از بردستی ان کو مسلمان بنادیتا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنادیتا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آئیوں کا یہی مطلب ہے:

﴿وَمَا لَتَقَاعُونَ إِلَّا أَنْ يَتَشَاءَ اللّٰهُ ط﴾ (٣٠: الدھر)

”تم نہیں چاہو گے الی کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنادے)۔“

﴿مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا كَانَ يَتَشَاءَ﴾ (٦: الانعام)

”وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الی کہ خدا چاہے۔“

﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمِيعَهُمْ عَلَى الْهُدَى﴾ (٦: الانعام)

”اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔“

﴿فَلَوْ شَاءَ لَهُ دِلْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥﴾﴾ (٦: الانعام)

”تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ (خود) ہدایت دے دیتا۔“

﴿وَلَوْ شَاءَ لَهُ دِلْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٦﴾﴾ (٩: النحل)

”او اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔“

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے، اس لیے اس مشیت الہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلِيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلِيَكُفُرْ﴾ (٢٩: الکھف)

* صحيح مسلم، كتاب الإيمان: ٩٣؛ أبو داود، كتاب السنّة، باب في التقدّر: ٤٦٩٥؛ ترمذى، أبواب الإيمان، باب ما جاء في وصف جبريل للنبي عليه السلام الإيمان والاسلام: ٢٦١٠.

”توجہا ہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔“

﴿فَئُنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَيْ رَبِّهِ سَيِّلًا﴾ (۷۲) / المزمل: ۱۹ و ۷۶ / الدهر: ۲۹)

”توجہا ہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔“

﴿فَئُنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَيْ رَبِّهِ مَأْبَدًا﴾ (۷۸) / النبایا: ۳۹)

”سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت کڈے۔“

﴿إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَيْ رَبِّهِ سَيِّلًا﴾ (۲۵) / الفرقان: ۵۷)

”لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گراہی بھی اترتی ہے، مگر کون کے لیے، بصرت فرمایا:

۱ - ﴿وَمَا يُؤْلِلُ إِلَّا الْفَسِيقُينَ﴾ (۲) / البقرۃ: ۲۶)

”اوہ اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو۔“

۲ - ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزْاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَأَنَّ اللَّهُ لَا يَهُدِي الْقَوْمَ الظَّفِيقَينَ﴾ (۰)

(الصف: ۵۰)

”جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے انکے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔“

۳ - ﴿بَلْ رَأَى عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۱۴) / التطفیف: ۸۳)

”بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔“

۴ - ﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِلَفْرِهِمْ﴾ (۴) / النساء: ۱۵۶)

”بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔“

۵ - ﴿أَنْصَرَ قُوَاطِ صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُهُونَ﴾ (۹) / التوبۃ: ۱۲۷)

”وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے بھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔“

۶ - ﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكُفَّارِ﴾ (۷) / الاعراف: ۱۰۱)

”اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔“

۷ - ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَرَآدَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ (۲) / البقرۃ: ۱۰)

”ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔“

ان آتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہو گا کہ انسان کی بد اعمالی مقدم

ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مورخ ہے اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اتنا علست اور انسانوں کا کفر و گناہ و

نفاق معلوم نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کافش، بھی، زنگ، کفر، انصراف، (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر ہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ملکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو والٹ کر بیان کرے تو یہ کسی سخت نادانی ہو گی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبیط وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا ॥ اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چکلی کر خوبوار گئی۔ اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گشون کو چھوڑ کر جن کو مشکلمیں کی جگاد لانہ کا دشون نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَحْكَمَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَأَى تَقْدِيرًا﴾

(الفرقان: ۲۵)

”اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔“

ترمذی ، ابواب القدر ، باب ماجاء من التشديد في الخوض في القدر: ۲۱۳۳

ایمان کے نتائج

گزشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھلایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع علیہ السلام نے کیا مصلحتیں رکھیں ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً نہ پہلے اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے، وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمه میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال، ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلتے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دار و مدار کھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس پارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہ ایمان پر اور نہ عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عمل صالح کی جامیعت پر موقوف ہے «الَّذِينَ آتَيْنَا وَعْدَنَا الصِّلْحَتِ» ”جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔“ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو شخص ایمان کی بنابر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت و سبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور حرم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے کھلی ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل، یہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے گریس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بارپیدا نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک کہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو «یا ایها الَّذِینَ آتُوا» ۱۷۴ وہ

لوگو! جو ایمان لائے۔“ کی نداسے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے «إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ» ”اگر تم ایمان والے ہو،“ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا:

«وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُ جَنَاحَيْهِ طَ» (٢/ البقرة: ١٦٥)

”ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

«إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَعْيًا

وَأَطْعَامًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ» (٤١/ النور: ٥١)

”ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف بدلایا جائے، تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور انہیں لوگوں کا بھلا ہے۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلے کے آگے سر

جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

«إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ» (٤٩/ الحجرات: ١٠)

”ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔“

اس سے نتیجہ تکلہ کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

«وَعَلَى اللَّهِ فَلِيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ» (١٦١/آل عمران: ٣)

”اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔“

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے اور سورہ مومون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

«قَدْ أَفْلَمَ الْمُؤْمِنُونَ لِلَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ لَحِيَعُونَ لِلَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ
مُعْرِضُونَ لِلَّذِينَ هُمْ لِلرَّكْوَةِ فَلِوْلُونَ لِلَّذِينَ هُمْ لِفَرْوَاهِمْ حَفْطُونَ وَالَّذِينَ
هُمْ لِأَكْلِتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يَحْافِظُونَ»

(٢٣/ المؤمنون: ٥-٨، ٩)

”بے شبه اہل ایمان نے بھلا کی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے بھکے رہتے ہیں اور جو کئی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرماگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں.....

اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی مگر اُنی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔“
ان آئتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خصوص و خشوع، بے کار با توں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت و پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آئتوں میں ایک عجیب رمز ہے دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر کھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین و آخرین نشانی ہے اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔ ہم نے یہ چند آئیں پہاں مثلاً تقلیل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”ایمان کی کچھ اوپر ستر شانصیں ہیں۔“ ﴿ امام تیقینی جو علیہ السلام نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گناہیا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:
 ((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا))

”مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“
حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہوئی چاہیے جو تمام محبوتوں کا مرجع و مرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبت الہی کے شخص اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلے سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسروں تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہداری کے علاقے بیچ ہیں، فرمایا:
 ((لَا يُؤْمِنُ احْدَكُمْ حَتَّىٰ اَكُونَ احْبَبَ الِّيْهِ مِنْ وَلَدَهُ وَوَالَّدَهُ وَالنَّاسُ اَجْمَعُونَ))

”تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں، جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت، اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔“

ایمان کا تیسرا تاثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ احْدَكُمْ حَتَّىٰ يَحْبَبْ لَأَخِيهِ اَوْ لِجَارِهِ مَا يَحْبِبْ

1) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان، ۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۲۔ 2) سنن ابو داود، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانہ: ۴۶۸۲۔ 3) بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول: ۱۴، ۱۵؛ مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: ۱۶۹۔

(نفسہ))

”قُسْمٌ هُوَ إِلَّا ذَاتٌ كَيْ، جَسْ كَيْ بَاهْتَهُ مِنْ مِيرِي جَانِ هُوَ، ثُمَّ مِنْ سَكِيْ كَا إِيمَانِ إِلَّا وَقْتٌ
تَكَيْ كَالْمُنْهَى، جَبْ تَكَيْ كَهُوَهُ أَپَنِي بَهَائِي يَاءِرْبُودِي (رَأْوِيْ كُوشَكِيْ هُوَ) كَيْ لَيْهُ وَهِيْ نَهْجَاهِيْهُ
جَوْهُهُ أَپَنِي لَيْهُ چَاهَتِيْهُ هُوَ۔“

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا: ”جب تک تم مومن نہ ہو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو
گے اور مومن نہ ہو گے، جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو کے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس
میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے آپس میں سلام پھیلاو۔“ * * *

یہ محبت کسی نمائش، ریا، یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا: ”عین
باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالی، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی
محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگان خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسرا یہ کہ کفر سے نجات پانے کے
بعد پھر اس میں آلو دہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔“ * * * ایک صحابی شیعۃ اللہ علیہ السلام
دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے؟ فرمایا: ”اس مسلمان میں جس کے ہاتھ
اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔“ * * * فرمایا: ”ایمان کی سترے سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے
ایک شرم و حیا ہے۔“ * * * یہ بھی تعلیم دی کہ ”جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہوا سکو چاہیے کہ زبان سے بات
نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہوا سکو چاہیے کہ اپنے پڑوی کو دکھنے پہنچائے
جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہوا سکو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔“ * * * ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو
نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے منادے یہ نہ ہو
کہ تو زبان سے توک دے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔“ * * *
اس کے بال مقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا: ”نفاق کی چار (۴) نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے
ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عصر موجود ہے اگر چوہ نمازگزار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو
وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت پر دکی

- ۱۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان: ۱۷۰، ۱۷۱۔ * * * صحيح مسلم، کتاب
الایمان، باب بیان انه لا یدخل الجنة... ۱۹۴۔ * * * صحيح بخاری، کتاب الایمان، باب من کره ان یعود...
۲۱؛ صحيح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال من... ۱۶۶۔ * * * صحيح مسلم، کتاب الایمان، باب
بیان تفاضل الاسلام: ۱۶۱ تا ۱۶۳۔ * * * صحيح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان: ۱۵۲۔
۶۔ یہ تمام روایتیں صحیحین، کتاب الایمان میں ہیں، صحيح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام
الجار: ۱۷۳۔ * * * صحيح بخاری، کتاب الایمان، پیش نظر مسلم ہے باب بیان کون النہی عن المنکر: ۱۷۷۔

جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکرے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلا نیکیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے لیکن اس سے کسی کو یہ شبہ ہے کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار داکیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لیے «امْنُوا» کے ساتھ ساتھ «وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ» پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اور جو کچھ کہا گیا ہے اس کا فناشیا ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سر بر زنیں رہ سکتی اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بارور خخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم وجود برابر ہے، اس بنابر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے پانچ سو چوراہی (584) صفحے سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اور اقی کی گراں باری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہنماء کے ساتھ قافلہ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں ہر چند کہ

رہ روان را خستگی راہ نیست عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

سید سلیمان ندوی
دار المصنفین

رمضان ۱۴۳۵ھ

* صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المتنافق: ۲۱۰؛ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المتنافق: ۳۴۔ * موجودہ ولیشیں کے لحاظ سے۔



سَبَّابِ الْبَرِي